رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

عید الاضحیٰ نمبر

ابتدائیہ

دستک	مشتاق احمد قریشی	8
گفتگو	عمران احمد	10
اقرأ	طاہر قریشی	19

سچی کہانیاں

عاشق زاد	شہنی ارشاد	119
جذبۂ جنون	حنیف قادری	129
سنگ دل	انجم فاروق ساحلی	189
سوفٹ ویئر	آلشبہ مخدوم	201

ناول

درندہ	خورشید پیرزادہ	71

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

سہاگن	راحیلہ تاج	59
ہم رکاب	عبدالسمیع	63

مستقل سلسلے

آتش زیرپا	یعقوب بھٹی	21
قلندر ذات	امجد جاوید	145
جگت سنگھ	شمیم نوید	223
روحانی مسائل	حافظ شبیر احمد	211
خوشبوئے سخن	عمر اسرار	215
ذوق آگہی	عفان احمد	219

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ہم تو نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے......!

وطنِ عزیز آج جس مشکل سے دوچار ہے ماضی میں شاید ہی ایسا وقت کبھی پڑا ہو کسی ایک صوبے یا شہر کا قصہ نہیں اب تو یہ ملک کے طول و عرض کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی ماں کوئی باپ اپنے بچوں سمیت اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہے۔ کہیں کوئی باپ اپنے بیوی بچوں سمیت زہر کھا رہا ہے تو کہیں کوئی ماں اپنے بچوں سمیت ریل کی پٹری پر لیٹ کر خود کو ختم کر رہی ہے کہیں بچوں کو اپنے آپ سے باندھ کر نہر میں ڈبکی لگا رہی ہے۔ غرض کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں ہر روز بے روزگاری اور غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر مایوس اور حرماں نصیب افراد زندگی کی قید سے خود کو آزاد کر رہے ہیں۔ تو دوسری طرف بے گناہ معصوم لوگوں کو نشانہ بنا کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ آخر یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح سرِ عام سرِ راہ لوگوں کو قتل کرتے پھر رہے ہیں۔ امن و امان کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہیں۔

صوبائی اور مرکزی حکومت صرف بیان دے دے کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہم ان دہشت گردوں سے ان مجرموں سے آہنی ہاتھ سے نمٹیں گے، کبھی کہتے ہیں کہ انہیں چھوڑیں گے نہیں جلد ہی کیفرِ کردار کو پہنچا دیں گے، لیکن ان بیانات سے آگے سب کچھ صفر ہی رہتا ہے۔ جب کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے تو ایسے ایسے افلاطونی بیانات داغے جاتے ہیں جیسے مجرموں کو ابھی لمحوں میں پکڑ کر کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا یا پھر ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ وزارتِ داخلہ کو تو کئی ہفتوں پہلے سے ایسے کسی حادثے کی خبر ہو گئی تھی اور اس نے اس کے تدارک کا بندوبست بھی کر لیا تھا، لیکن ہوا وہی جو دشمن یا منصوبہ ساز کرنا چاہتے تھے۔ حکومتی ادارے بے بسی کی تصویر بنے دیکھتے رہ گئے اور بعد از مرگ واویلا کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔

پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے، جس کا منشور اسلامی کہلاتا ہے جس کے حکمران اور ارکان پارلیمنٹ کی اکثریت مسلمانوں کی ہے کیا انہوں نے کبھی اسلام کا اپنا آئین قرآن حکیم دیکھنے کی زحمت کی ہے کہ اسلام ایک مسلم معاشرے کی کس طرح تشکیل کرتا ہے، کس طرح تہذیب، شائستگی، اخوت، بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے۔ کس طرح دولت کے انجماد کو روکتا اور دولت کی روانی کو فروغ دیتا ہے۔ کس طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلام تو خیرات و صدقات تک کی ادائیگی کو سخت تنگ دست بھائی یا ضرورت مند کو ادا کرنے کا حکم تو دیتا ہے، لیکن ایسا کرنا کسی حاجت مند کی حاجت روائی کرنا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا بلکہ اس کا وہ حق ہوتا ہے۔ کسی بھی غریب تنگ دست مسلمان کا دوسرے مال دار اور صاحبِ استطاعت مسلمان بھائی پر یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے غریب تنگ دست ضرورت مند بھائی کی حاجت روائی کرے اس کی ہر طرح مدد کرے۔ اسلام صرف ایک دین ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے تمدن

ہے اسلامی معاشرہ اسلامی اقتدار اخلاق سے جنم لیتا ہے اور مسلمان دین داروں کے قول و فعل کی حدود متعین کرتا ہے حقوق کا تعین کرتا ہے اگر اہلِ وطن اہلِ درد مسلمان پاکستانی بھائی یہ سمجھتے اور جانتے مانتے ہیں کہ وطن عزیز ایک اسلامی مملکت ہے اور ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کے باشندے ہیں تو ہم سب پر اجتماعی فرض عائد ہوتا ہے کہ اس پاک سرزمین پر اپنے بنیادی دین کی اسلامی معاشرے اسلامی روایات کی احکامات الٰہی اور سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے۔ ہمارے حکمران چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر ہم انفرادی طور پر خود کو درست کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو وہ دن دور نہیں جب وطن عزیز واقعی ایک اسلامی فلاحی ریاست بن کر ابھرے گی۔ آج ہم جس عذاب میں مبتلا ہیں وہ انفرادی ہی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے، ہم سب کا رویہ یہ ہو چکا ہے کہ نیکی کے کام میں پہل میں نہیں دوسرا کرے میں اپنے آپ چاہے کتنا خراب بدکردار کیوں نہ ہوں لیکن خواہش کرتا ہوں بلکہ اکثر تاکید کرتا ہوں دوسروں کو کہ وہ درست عمل کریں میں چاہے خود کتنا ہی بدعنوان، بے ایمان، رشوت خور کیوں نہ ہوں لیکن اپنے برابر والے کو یا اپنے سے متعلق افراد کو نیک و صالح ایمان دار دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم مسلمان ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں تو ہمیں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر بھی عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ایک دفعہ ایک خاتون اپنے بچے کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا بیٹا گڑ بہت کھاتا ہے آپ اسے نصیحت فرما دیں کہ یہ گڑ نہ کھایا کرے۔ آپ نے خاتون کی بات سنی اور تبسم فرمایا اور فرمایا دو روز بعد اسے لے کر آنا پھر جب دو روز بعد وہ خاتون اپنے بیٹے کو لے کر آئیں تو نبی برحق نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے صرف اتنا فرمایا کہ "گڑ نہ کھایا کرو۔" اس پر وہ خاتون بڑی حیران ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات تو آپ اس وقت بھی ارشاد فرما سکتے تھے۔ جب میں پہلے حاضر ہوئی تھی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ چونکہ اس وقت تک میں خود گڑ کھاتا تھا تو میں اس بچے کو کس طرح منع کر سکتا تھا۔ نبی برحق کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک مسلمان اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو کہلانے والے کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارا معاشرہ مسلم معاشرہ ہے ذرا سوچیے کیا ہم بحیثیت مسلمان اپنی معاشرتی اپنی مذہبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے پڑوس، اپنے ہم محلہ، اپنے ہم شہر مسلمان بھائیوں کے حقوق جو ہم پر اللہ تعالیٰ نے بحیثیت مسلمان فرض کیے ہیں ادا کر رہے ہیں؟ اگر ہم خود اپنے آپ کی اصلاح کر لیں تو یقیناً ہمارا ملک، ہمارا ہر شہر، ہر محلہ، ہر گلی کوچہ، ہر پاس پڑوس ہر قسم کی ہر برائی، ہر تکلیف، غربت، بے روزگار، مہنگائی سے پاک ہو سکتا ہے۔ ہم ہر قسم کے بیرونی قرضوں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ دشمن کی ہماری طرف انگلی اٹھانے کی کبھی جرأت نہیں ہو گی۔ اللہ ہمیں صحیح پاکستانی اور سچا مسلمان بنائے ہماری ہر طرح حفاظت فرمائے۔ آمین

❁

گفتگو

عمران احمد

> "حضرت صفوان بن سلیمؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا خبردار! جس شخص نے اس شخص سے ظلم کیا جس سے اس کا معاہدہ ہوچکا ہے یا اس کے حق کو ضرر پہنچایا یا اس کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف دی یا اس کی رضامندی کے بغیر اس کے کوئی چیز لی تو میں ان سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔" (ابوداؤد)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد

اکتوبر کا شمارہ حاضر مطالعہ ہے۔

ہمارا کراچی اب بھی لہولہو ہے۔ روزانہ دس سے پندرہ لاشے اٹھ رہے ہیں۔ بچے یتیم اور سہاگنیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ اب تو عالم یہ ہو رہا ہے کہ قانون کے محافظ تک غیر محفوظ ہیں کوئی دن نہیں جاتا کہ کسی نہ کسی پولیس افسر یا اہلکار کی سر عام ٹارگٹ کلنگ کی خبر نہ آتی ہو سیاستدانوں نے پولیس کو ناکام قرار دے دیا ہے کہ وہ شہر میں امن قائم نہیں کرسکتی لیکن کوئی اپنے گریبان میں جھانکنے کو تیار نہیں کہ پولیس کو ناکام بنانے والے وہ خود ہیں۔ پولیس کسی بھی مجرم کو پکڑ کر تھانہ تک نہیں پہنچتی کہ کسی نہ کسی ایم پی اے یا ایم این اے کا فون پہلے ہی پہنچ جاتا ہے کہ مجرم ان کی پارٹی کا معصوم کارکن ہے۔ لہٰذا اسے فوراً رہا کردیا جائے۔ پولیس کرپٹ ہے اس سے کوئی انکار نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بحیثیت مجموعی ہماری پوری قوم کرپٹ ہے ہم اپنے نابالغ بچوں کو گاڑیاں دے دیتے ہیں پھر اگر پولیس انہیں روکے تو یہ ہم ہی ہوتے ہیں جو کڑکڑاتے ہوئے نوٹ ان کی جیب میں ڈال کر مک مکا کی بات کرتے ہیں الزام تراشی اور تنقید بہت آسان ہے لیکن اپنا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرہ اور ماحول کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا جائزہ لے کر خود کو درست کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہم دجالی فتنہ کا شکار ہوچکے ہیں پورا عالم اسلام دجال کے نشانے پر ہے جس سے بچنے کے لیے سرور کائنات نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز میں دعا مانگی تھی ان کی بیان کردہ نشانیاں یکے بعد دیگرے سامنے آرہی ہیں۔ شام میں خود مسلمان اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر کیمیائی ہتھیاروں سے موت برسا رہے ہیں۔ یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ یہ کیمیائی ہتھیار باغیوں کو خود ایک مسلمان ملک نے فراہم کیے تھے۔ اب اسی کو جواز بنا کر دجال کے پیروکار شام پر حملہ کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے ہی دولت مند مسلمان ملک اس حملے کا سارا خرچہ برداشت کرنے کا اعلان بھی کر رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ترکی میں شراب خانوں کی بندش کے اعلان پر پورا مغرب تڑپ اٹھا اور چند سیکولر گروپوں کو بغاوت پر اکسانے لگا۔ مصر میں پہلی جمہوری اسلام پسند حکومت کو کچل دیا گیا۔ لوگوں پر ٹینک اور بلڈوزر چڑھا دیے گئے ہم سب خاموش ہیں۔ سب اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔ ہم کتنے معصوم ہیں کہ جب روس یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر امریکا نے شام پر حملہ کیا تو وہ سعودی عرب پر حملہ کردے گا۔ اس اعلان پر ہم خوشی سے بغلیں بجانا شروع کردیتے ہیں یہ سوچے بنا کہ کافر روس مکہ و مدینہ پر حملے کی بات کر رہا ہے۔ دجال کے ہزار چہرے ہیں وہ دشمن بن کر بھی حملہ کرتا ہے اور دوست بن کر بھی زہر دیتا ہے۔ انسانی حقوق کے نام پر افغانستان، عراق، مصر و شام پر یلغار کرنے والوں کو کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی نظر نہیں آتی۔ وہاں اقوام متحدہ سمیت سب بھارت کی پیٹھ ٹھونکنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کیوں؟ یہ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم

خودغرضی کے نشے کا شکار ہوچکے ہیں۔ ہم ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکے ہیں۔ فرصت کے لمحات میں سے چند گھڑیاں کشید کرکے اس پہلو پر بھی ضرور سوچیے گا۔

اس ماہ ہم اپنے قارئین کے لیے ایک نئی سلسلے وار کہانی "آتشِ زیرپا" شروع کر رہے ہیں۔ اس تحریر کے خالق نوجوان قلمکار محمد یعقوب بھٹی ہیں۔ یہ نام قارئین کے لیے نیا نہیں۔ آپ اس سے قبل بھی ان کے ناول اور مختصر کہانیاں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ کہانی ہمارے قبائلی کے پس منظر میں ہے۔ امید ہے یہ تیز رفتار کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

این شاہین...... واہ کینٹ السلام علیکم! دعا ہے سدا شاد و آباد رہیں۔ اللہ کے کرم سے پچھلے ماہ تبدیلی شہر اور سیٹنگ کی وجہ سے بے حد مصروف رہی اور اتنی ہی علیل بھی جبھی حاضری میں تاخیر حاضری ہوئی۔ خیر جونہی آب و ہوا تبدیل ہوئی سندھ سے پنجاب منتقل ہوئے تو کچھ بیماریاں بڑھیں اور کچھ مسائل میں اضافہ بھی ہوا خیر پھر بھی اللہ پاک کا کرم ہے۔ بہرحال میں اپنی ذات کے قصیدے لکھنے بیٹھوں تو' پھر تو...... اس ماہ کا شمارہ بہت دیر سے ملا کیونکہ یہ کراچی تو ہے نہیں کہ جلدی مل جائے سرورق بے حد خوب صورت ہے تعریف کے الفاظ ہی نہیں مل رہے۔ اس کے بعد گفتگو میں پہنچی چھلانگ لگا کر تو بہت ہی پیاری حدیث پڑھنے کو ملی۔ غریب و مسکین کی مدد کرنے کا اجر و ثواب تو ہے ہی ساتھ میں رب کی رضا اور محبت کا اظہار بھی ہے۔ آج کل ہم لوگ خرچ تو کر رہے ہیں مگر صرف دکھاوے کے لیے جس کا نہ کوئی ثواب ہے اور نہ رب کی خوشنودی اور جب خرچ کرتے ہیں تو بھی ایسی جگہ جو بے مصرف اور ناموری کے لیے۔ جس میں نہ خلوص ہوتا ہے اور نہ رب کی رضا۔ ارے اگر ہم کچھ دینے کے قابل ہیں تو کسی ایسے کو دیں جو کہ مستحق ہو جس سے اس مستحق کا بھی بھلا ہو اور خود کی ذات کا بھی اور یہ تو مہینہ بھی ایسا ہے کہ ہم جتنی نیکیاں سمیٹ سکتے ہیں سمیٹیں رب تعالیٰ کی محبت رحمت و برکت کے حصول کے لیے خلوص دل سے جی جان کی بازی لگا دیں۔ اپنے رب کو راضی کریں۔ اپنے گناہوں کی معافیاں مانگیں اور جو عبادات ہم کریں وہ ریاکاری کے بغیر ہوں اور اگر ہم کسی کو کچھ دیں بھی تو ایسے کہ کسی کو احساس تک نہ ہو صدقہ و خیرات ایسے کریں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہو اور ہم نیکیاں کمائیں نام نہیں اللہ ہم سب کو عقل سلیم عطا فرمائے آمین۔ کرسیٔ صدارت پر قابل احترام شہناز آنٹی تشریف فرما ہیں آپ کو سلام و دعائیں مبارک باد اور ڈھیر سارا شکریہ اور آپ کی شخصیت کے بارے میں کیا تحریر کروں۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں ابھی تو کہ جب ملی تو آپ کا نگاہوں سے اوجھل ہونا برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا اور میں ایسی سحر زدہ سی ہوگئی تھی اس وقت کہ منہ سے الفاظ ہی غائب ہوگئے تھے اور واپسی کے لیے قدم اٹھانا دوبھر ہوگیا تھا آپ کی محبتوں' چاہتوں اور خلوص کا کوئی مول نہیں جب آپ کو دیکھا ہوا نہیں تھا تب بھی آپ کی دلدادہ تھی اور اب تو پوچھیں ہی مت اور اگر آپ کے بارے میں لکھنا شروع کروں گی تو یہ پوری نوٹ بک ہی فل ہوجائے گی اور عمران بھائی کہیں گے یہ خط ہے یا...... خیر زندگی رہی تو ان شاء اللہ آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ دوسرا خط عالیہ صاحبہ کا ہے جنہوں نے میرے علاوہ سب کے خطوط پہ تبصرہ کردیا۔ خیر' سلام آپ کو۔ ریاض بھائی دعاؤں کا شکریہ نہیں کیا جاتا بہرحال یاد رکھنے کا شکریہ۔ عبداللہ شاہد صاحب ہم کسی کو اگنور کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ بس ٹینشن اتنی ہے کہ اپنا آپ بھی یاد نہیں رہتا۔ خیر آپ کے گیت تو...... فقیر محمد بخش انکل یاد رکھنے پہ آپ کی بھی بے حد مشکور ہوں اور دعاؤں کی محتاج۔ ریاض قمر صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عمر فاروق صاحب کا تبصرہ بھی خوب تھا اور جو کھری کھری سنائیں وہ بھی زبردست تھیں۔ جاوید صدیقی صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اور خیر مبارک۔ دعاؤں میں یاد رکھا کیجیے۔ عابد صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کافی عرصہ بعد آئے آپ خیر تو ہے؟ آخر میں شجاع جعفری نے بھی ادھورا ذکر کیا شکریہ۔ اس بار سب کے تبصرے بہت خوب تھے اچھے لگے اور بہت سے لوگ غیر حاضر ہیں کیوں؟ زندگی کی نئی شروعات مبارک ہوں اللہ آپ کو ہر قدم پر خوشیاں عطا کرے آمین۔ فہد بھائی آپ بالکل ہی غائب ہوگئے نا'

اچھا نہیں کر رہے آپ۔ سب غائبین کو بھی حاضری کی تاکید۔ وقت کی کمی کے باعث صرف گفتگو میں ہی قدم رنجہ کر پائی اور بقیہ رسالے میں صرف گردش ہی پڑھ پائی۔ اس لیے مزید کسی چیز پر تبصرہ نہیں کر پاؤں گی کیونکہ وقت کی انتہائی کمی ہے۔ اللہ پاک ہم سب پر رحم فرمائے اور ہمیں دوزخ سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

طاہرہ جبین تارا...... لاہور محترمی عمران صاحب! آداب۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اس دفعہ نئے افق بہت دیر سے ملا اس لیے مکمل طور پر نہیں پڑھ سکی کچھ کالج کی مصروفیات لیکن سوچا گفتگو میں ساتھیوں سے ملاقات کر لینی چاہیے کیونکہ اس دفعہ تو گفتگو میں صنف نازک کو جگہ ہی نہیں دی گئی عمران صاحب یہ ناانصافی کیوں؟ انکل مشتاق ہم امریکہ کے غلام ہیں اس کی ہر بات پر لبیک کہنا حکمرانوں کا شیوہ ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی طاقت عطا کرے تاکہ جہاد کا فریضہ انجام دیں کیونکہ جتنی جہاد کی آج ضرورت ہے اس سے پہلے نہ تھی آج طاغوتی قوتوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ٹھان لی ہے اس کا علاج صرف جہاد ہے. اقرا نے ایمان میں اضافہ کیا سب سے پہلے گردش پڑھی آخری قسط بہت زبردست تھی مگر شہناز آپی آپ نے بہت ظلم کیا شاہ زمان اور مہوش کو مار دیا ان کے صبر کا انعام موت تو نہیں ہونا چاہیے تھا اتنا ظلم برداشت کرنے کے بعد، مشکلات سہنے کے بعد زندگی کی خوشیوں پر ان کا حق تھا درندہ اسٹوری تو بہت اچھی تھی مگر خورشید صاحب ذہنی پراگندگی کا شکار محسوس ہوتے ہیں عورت ماں، بہن، بیٹی کے روپ میں قابل عزت ہستی ہے مگر جو روپ وہ پیش کر رہے ہیں وہ کہانی میں ونگریٹی پیدا کر کے اس کی افادیت کو نقصان پہنچا رہا ہے پلیز خورشید صاحب عورت اپنی سطح سے نہیں گرتی سو میں سے کوئی دو چار تو ایسی ہو سکتی ہیں مگر ہر کوئی نہیں اب اگلی قسطوں پر نظر ثانی کریں. جدائی ایک اچھی تحریر تھی ماں کی محبت تو لافانی ہے اس محبت کا کوئی نعم البدل نہیں کہانی پڑھ کر مجھے علامہ اقبال کی نظم ماں کا خواب یاد آ گئی رادھیکا مزے کی کہانی تھی لالچ بری بلا ہے مولانا صاحب آ گئے نا چکر میں وہ بھی جنتی کے قلندر ذات اب اور زیادہ دلچسپ ہو رہی ہے جگت سنگھ ڈاکو راج کی کہانی ہے انتقام ان دونوں کہانیوں کا بنیادی موضوع ہے اس لیے دونوں ملتی جلتی ہیں اگر ایک کہانی ختم ہونے کے بعد دوسری شروع کی جاتی ہے تو زیادہ اچھا تھا ابھی باقی کہانیاں نہیں پڑھ سکی فقیر انکل آپ کیسے ہیں بس دعا کرتے رہا کریں بزرگوں کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے باقی ساتھی بھی خیریت سے ہوں گے اس دفعہ تو آپ سب کی اجارہ داری بھی خوش ہوں گے آپ سب کہ صنف نازک غائب ہیں لیکن جناب صنف نازک سے ہی کائنات میں رنگ ہے اس لیے تو گفتگو کے رنگ پھیکے تھے نئے افق کو سجانے والوں کو سلام عرض کر دیں۔ اللہ حافظ دعا گو

امین مراد انصاری...... کراچی۔ محترم جناب آپ کو اور تمام قارئین نئے افق کو سلام۔ طویل عرصہ کے بعد آپ کی بزم میں شرکت کر رہا ہوں امید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ نئے افق میں کوئی خاص تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن آج بھی ہمارے ہاں ڈائجسٹوں میں وہی عشق محبت کی داستانوں پر کہانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ رائٹروں کو چاہیے کہ عشق و محبت کی اس دلدل سے باہر نکلیں اور معاشرتی، سماجی نوعیت کی کہانی لکھیں۔ آخر میں میری آپ سے گزارش ہے کہ خطوط کے اس کالم میں خط کے ہمراہ موبائل نمبر بھی شائع کیا کریں تاکہ قارئین آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں میں نئے افق کے تمام دوستوں سے رابطہ کا خواہش مند ہوں۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمۃ۔ ستمبر کا نئے افق سبز ہلالی شاہین کے ہمراہ پوری طرح متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ اکلوتا ٹائٹل ہے جو ہمارے دل کو بھا گیا۔ نیلے نیلے کوہسار، سرخی مائل پانی، جھونپڑیوں کے پہلو میں کشتی، درختوں کے درمیان حیران پریشان سے کھڑے بارہ سنگھے، آہا کیا رومانٹک نظارہ ہے بھئی۔ اللہ اس سوہنی دھرتی کو سدا سلامت رکھے۔ سرورق کے سحر سے نکلے تو اندر داخل ہوئے جہاں رنگ رنگ

داستانیں ہماری منتظر تھیں۔ ابتدائی صفحات پر درندہ نامی ناول سے اب مصنف نجانے کون سا بول کا جن برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اسے سمیٹ سماٹ کر ختم کرنے کی کوشش کریں۔ خوامخواہ طول دینے سے ناول کی شکل وصورت ہی بگڑ گئی ہے۔ سلسلے وار ناول گردش اختتام کو پہنچا۔ ماشاء اللہ اچھی کاوش تھی۔ شہناز بانو صاحبہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ میں اپنا مطالبہ پھر دہراؤں گا کہ اب اس کی جگہ کوئی سلسلہ وار ناول نہ شروع کیا جائے۔ کیونکہ ایک وقت میں تین ناول چل رہے ہیں چوتھے کی گنجائش نہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ دو سلسلے وار ناول رکھا کریں۔ باقی مختصر کہانیوں پر خصوصی توجہ دیں اور ان کی تعداد زیادہ کریں۔ مغرب سے انتخاب ہمیشہ ہی عمدہ ہوتا ہے اس مرتبہ بھی دونوں درآمد شدہ کہانیاں زبردست تھیں۔ سچی کہانیوں میں سے مکافات عمل اور کفارہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں لیکن ہمیں یہ یقین کرنے میں کچھ تامل ہے کہ کیا یہ کہانیاں واقعی سچی ہیں بہر حال؟ اچھی کوشش تھی سلسلے وار ناول جگت سنگھ ہم نے نہیں پڑھا۔ سو تبصرہ نہیں کر سکتے۔ اب واپس آتے ہیں اقرا سے فیضیاب ہو کر عمران بھائی کے تند و تیز سچائی میں بھیگے ہوئے تیر اپنے سینے میں اتارنے کے بعد عجب سا سکون محسوس ہوا کاش کہ کوئی سمجھ سکے درد ہم غریبوں کا۔ اس کے بعد سب سے پہلا جو خط نظروں سے گزرا وہ ریاض قمر صاحب کا تھا۔ محترم بھائی نے تابڑ توڑ حملوں کے ساتھ ہماری خاطر تواضع کی۔ ارے بھائی، آپ اچھے شاعر ہیں خوب واد سمیٹتے ہیں لیکن شہرت کا قورمہ کھانے کے بعد تنقید کی کڑوی ہاضمہ دار گولی کی بھی عادت بنالو تو صحت کے لیے ٹھیک رہے گا۔ میں نے آپ پر کوئی قدغن نہیں لگائی تھی۔ صرف آپ کو آپ کے لہجے کی سختی کا احساس دلایا تھا۔ مگر آپ نے الٹا ہم پر ہی غصہ اتار ڈالا۔ باقی واجد نگینوی کے بارے میں میرے خیالات سے آپ آگاہ ہی ہیں۔ میں خود بھی اس جیسے ادبی چوروں سے نالاں ہوں اور بیچ چوراہے اس جیسے بے ضمیروں کو سزا دینے کے حق میں ہوں۔ ریاض بٹ صاحب آپ ادھر اُدھر کی ہانکنے کی بجائے اگر براہ راست شمارے پر تبصرہ کر دیا کر دیں تو نوازش ہوگی۔ سارا وقت اپنے ماضی کے قصے سنا کر۔ اپنی حیات درخشاں کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کر کے آخر میں آپ نے لکھ دیا کہ مصروفیت کے باعث کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ یہ کیسی مصروفیت ہے جناب والا؟ ہمیں تو یہ اس صدی کا سب سے عمدہ لطیفہ محسوس ہوا۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ عبدالحکیم ساجد منچن آباد سے تشریف لائے شکر ہے کوئی تو بندہ اپنے علاقے کا نکلا۔ اس مرتبہ کچھ ساتھی غیر حاضر تھے جیسے کہ عالیہ انعام الٰہی اور ابن مقبول صاحب، شہنی ارشاد میں نے تمہاری بہت کمی محسوس کی۔ بہنا تم تو اس چمن کی چہکتی مہکتی چڑیا ہو۔ روٹین سے آیا کرو۔ تمہارا بھائی تمہاری راہ تکتا رہتا ہے۔ خیر سب کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ نئے افق اور اس کے منتظمین کو سلامت رکھے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا رب راکھا۔

شجاع جعفری...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم اور قارئین نئے افق بخیر و عافیت ہوں گے۔ پرچہ اس دفعہ 24 تاریخ کو ملا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ ہے۔ اس دفعہ آنٹی شہناز نظر نہیں آئیں۔ پہلا نمبر محمد سلیم اختر صاحب کا تھا۔ آداب محترم آپ کا بہت اچھا تبصرہ تھا۔ آپ کی غزل بہت اچھی تھی۔ دوسرے نمبر پر ہم خود تھے۔ آگے ریاض بٹ صاحب تشریف فرما ہیں۔ محترم آپ کی اسٹوری بہت اچھی تھی ہمیشہ کی طرح میری طرف سے سلام۔ آگے فقیر محمد بخش صابر لنگا صاحب انکل سلام قبول ہو۔ کیا حال ہیں؟ دعا ہے اللہ آپ کو لمبی اور خوشیوں بھری عمر عطا فرمائے۔ اس کے بعد عبدالحکیم ساجد صاحب سے ملاقات ہوئی (پہلی دفعہ)۔ بہت اچھی گفتگو کی۔ عبدالحکیم صاحب آداب اس کے بعد ریاض حسین قمر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ محترم آپ کی غزل ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھی بہت پسند آئی۔ دعا ہے اللہ آپ کو خوش رکھے۔ ہماری طرف سے سلام۔ عمر فاروق صاحب بھی اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائے۔ عمر فاروق صاحب سلام و آداب اور آخر میں عبدالمالک کیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دستک میں

مشتاق احمد صاحب کو پڑھا علم میں اضافہ ہوا۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے ایمان کی طاقت کے بارے میں اچھی احادیث کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد کہانیاں پڑھیں۔ سچی کہانیوں میں مکافات عمل، کفارہ، انتقام اچھی تھیں۔ باقی درندہ کی قسط اچھی تھی۔ ذلت کا قلندر اچھی جا رہی ہے۔ گردش کا اختتام بہت اچھا تھا۔ شہناز آنٹی کو مبارک باد۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ایسی کہانیاں لکھتی رہیں گی۔ اللہ آپ کو صحت اور لمبی عمر دے۔ خوشبوئے سخن میں تمام مواد اچھا تھا۔ جن میں اللہ دتہ عابد، مسرور کیف، ریحانہ سعیدہ، سید عبداللہ شاہد، وسیم اختر، محمد اسلم جاوید، ریاض حسین قمر کی شاعری پسند آئی۔ باقی تمام حاضر غیر حاضر دوستوں کو سلام اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ ستمبر کا شمارہ اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے۔ سرورق حسب معمول خوب صورت اور دل کش ہے۔ سرورق کا پرندہ تو آزادی سے اڑ رہا ہے لیکن لگتا ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کی قدر نہیں کی۔ یہی بات دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب کہہ رہے ہیں ہمارے حکمران واقعی بے حس ہو گئے ہیں اور حقیقتاً ڈالر اوڑھ کر سو گئے ہیں۔ اب ایک طرف بھارت آنکھیں دکھا رہا ہے اور ہمارے حکمران مذاکرات کا راگ الاپ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جنگ مسائل کا حل نہیں لیکن بقول ٹیپو سلطان ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' اب بڑھتے ہیں محفل کی طرف۔ عمران صاحب گفتگو کے شروع میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے بہت موثر اور سبق آموز ہے۔ واقعی ہمیں اپنے اندر کے شیطان کو مارنا ہوگا۔ اس بار سب سے پہلا خط محمد سلیم اختر صاحب کا ہے۔ آپ نے جن نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے اس کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔ آپ کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں اس ماہ کی کہانی کفارہ بھی عمدہ ہے۔ انداز بیان تعریف کے قابل ہے۔ شجاع جعفری صاحب آپ خود اچھے ہیں اس لیے آپ کا خط بھی اچھا ہوتا ہے۔ میری کہانی ہیروں کا ہار پسند کرنے کا شکریہ۔ محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب آپ کی دعائیں اور نیک خواہشات ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ خدا آپ کو صحت مند، خوش و خرم رکھے۔ میری کہانیاں آپ کو پسند آتی ہیں۔ جو آپ کے اعلیٰ ذوق کی غماز ہیں۔ میں اردگرد بکھری کہانیاں لکھتا ہوں۔ جو ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔ عبدالحکیم ساجد صاحب بعض کہانیاں زیادہ طوالت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کو زیادہ طویل کیا جائے تو بدمزہ ہو جاتی ہیں۔ بہرحال آئندہ آپ کے نقطے کو بھی ذہن میں رکھوں گا۔ دیکھیں ریاض حسین قمر بھائی کو بھی میری کہانی پسند آئی ہے۔ بھائی آپ کا شکریہ۔ ''ہیروں کا ہار'' اور ذوق آگہی میں میرا انتخاب انسانی جسم کی کابینہ کو شرف پسندیدگی بخشنے پر شکریہ۔ عمر فاروق صاحب ایک طرف آپ میری کہانیاں پسند بھی کرتے ہیں دوسری طرف بھرمار کی بات بھی کراتے ہیں۔ بات کچھ پلے نہیں پڑی۔ جو لوگ میری کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ ہر ماہ میری کہانی شائع ہو۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ مجھے مہروں کی تکلیف ہے۔ پھر بھی ہر ماہ ایک کہانی لکھنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ بہرحال آپ کے تبصرہ کا شکریہ۔ عبدالمالک کیف صاحب کیسے ہیں؟ بھائی میں بھی چاہتا ہوں کہ شہناز بانو اور شہنی ارشاد رسالے کے لیے لکھتی رہیں۔ شہناز بانو بہن گردش کے بعد بھی کوئی اچھا سا سلسلہ ضرور شروع کیجیے گا۔ بھائی میری کہانی ہیروں کا ہار اور ذوق آگہی میں میرا انتخاب پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ لو خطوط کی محفل تو ختم ہوئی اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی اور کہانیوں کی طرف۔ شہناز بانو بہن کی ''گرد'' اختتام کو پہنچی۔ بڑا اچھا اختتام کیا ہے یہ سلسلہ مدتوں یاد رہے گا۔ سچ بیانیاں سب اچھی ہیں۔ عمران بھائی کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ رادھیکا، مکافات عمل، کفارہ اور احساس سبھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مغرب سے انتخاب جدائی اور احمق بھی تعریف کے قابل ہیں۔ درندہ اور جگت سنگھ ابھی زیر مطالعہ ہیں البتہ قلندر ذات بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے ویل ڈن۔ خوشبو سخن میں سب انتخاب بہترین ہے۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی کے زمرے میں آئے گا۔ جاتے جاتے بات

ہو جائے ذوق آگہی کے متعلق۔ لائبہ زبیر، شجاع جعفری، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، وسیم کیانی، کامران علی، ثمرین اور فرزانہ آفندی کا انتخاب لاجواب ہے۔ مجموعی طور پر تمام رسالہ اچھا ہے۔ والسلام

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم عمران احمد صاحب خلوص بھرا اسلام قبول فرمائیں اور اپنے مخلص ساتھیوں تک پہنچائیں۔ ماہ ستمبر کے شمارے کا ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ خوب صورت منظر کے اوپر محو پرواز عقاب کے پروں پر سبز ہلالی پرچم کی شبیہ وطن عزیز پاکستان کی بلندیوں کی علامت ہے۔ کاش ہم سب مل کر اس علامت کو عملی جامہ پہنائیں اے کاش۔ محترم و مکرم مشتاق احمد قریشی صاحب نے اپنے مخصوص اور مدبرانہ انداز سے ملکی حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ کاش ہمارے حکمرانوں کے دلوں میں اس وطن کی محبت پیدا ہو جائے۔ جس پر حکمرانی کرنا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور جن کے بچے پیدائش کے چند لمحوں بعد ہی مستقبل کے وزیراعظم کا لقب پا لیتے ہیں۔ ان کے دلوں سے خوف خدا مٹ گیا ہے او وہ خوف اغیار میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ عوام کی تو انہیں فکر ہی نہیں وہ بھلے جئیں یا مریں۔ گفتگو کے آغاز میں عمران بھائی آپ نے ایک دلنواز حدیث بیان کی ہے اور اپنے طور کی گئی بات میں آپ نے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ گفتگو میں بہن بھائی اپنے اپنے خیالات اور نظریات کے ساتھ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ محمد سلیم اختر صاحب بہت شکریہ شاعری پسند فرمانے کا آپ میرے کہنے پر گفتگو میں تشریف لائے اور کرسی صدارت پر متمکن ہوئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو آپ کے حصہ میں آیا۔ شاعری پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کسی کا شاعر ہونا ضروری نہیں صرف باذوق ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنی کہانیوں کا مجموعہ چھپوانے کی تیاری فرما رہے ہیں۔ خدا آپ کو کامرانی سے ہمکنار فرمائے آمین۔ شجاع جعفری صاحب خوش آمدید بھائی آپ کو تبصرہ اچھا لگا اور غزل پسند آئی بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے درست فرمایا جب تک نیت ٹھیک نہیں ہوگی ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ ویسے بھی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ جب بادشاہ کی نیت میں فتور آتا ہے تو پھلوں کے رس خشک ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''نئیں وسدے گھر بدنیتاں دے'' (جن کی نیت ٹھیک نہیں ہوتی ان کے گھر آباد نہیں ہوتے) رب کریم ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے آمین۔ آپ نے پرچے پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ محترم جناب ریاض بٹ صاحب بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے آپ کی کہانیاں تواتر کے ساتھ نئے افق کے صفحات کی زینت بن رہی ہیں یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ محترم عمر فاروق کو یہ تواتر اچھا نہیں لگا میری ان سے گزارش ہے کہ بعض لکھاری تیز لکھنے والے ہیں زیادہ لکھنے سے ان کی تحریر کے معیار پر فرق نہیں پڑتا۔ یہ وصف ریاض بٹ صاحب میں موجود ہے کہ وہ کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ واجد نگینوی جیسے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسے لوگ اپنے کیے کی سزا خود ہی پا لیتے ہیں۔ محترم و مکرم جناب محمد بخش صابر لنگاہ ہم سب کے لیے ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ تشریف لائے۔ بزرگوار آپ کے خط میں تازگی اور توانائی ہوتی ہے جس سے رنجیدہ دل شادماں ہو جاتے ہیں یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے آمین اور آپ کو ہمیشہ صحت مند اور توانا رکھے، آمین۔ عمر فاروق محترم آپ کا تبصرہ بے لاگ ہوتا ہے۔ آپ اپنے دل کی بات سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ یہ انسان کے اندر سے صاف ہونے کی علامت ہے۔ محترم اس ماہ واجد نگینوی صاحب کی لو اسٹوری کی آخری قسط ہے آج کے بعد میرے قلم سے ان کا نام صفحہ قرطاس پر نہیں آئے گا۔ آپ ایک باذوق آدمی اور اچھے نقاد ہیں۔ خوشبوئے سخن کا بھرپور مطالعہ کر کے اس پر بھی سیر حاصل تبصرہ فرمایا کریں۔ شاعری نثر نگاری سے زیادہ مشکل ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے۔ تب کہیں بنتا ہے اک مصرعہ تر کی صورت کسی کے کلام پر مثبت تنقید اسے اپنا کلام نکھارنے میں مدد دیتی ہے۔ بھائی عبدالمالک کیف صاحب یاد فرمائی کا شکریہ۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب، سید عبداللہ شاہد، آپی شہناز بانو، عصمت اقبال

عین صاحبہ اور بہت سے ساتھی محفل سے غیر حاضر رہنا اپنا حق سمجھنے لگے ہیں اچھی بات نہیں محفل کی رونق کو کم کرنے کا باعث نہ بنیں اور پلٹ آئیں بہت شکریہ۔ اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب نے ایمان اور اس کی طاقت کے بارے میں احادیث بیان فرما کر ہمارے ایمانوں کو تازگی بخشی۔ گردش اختتام پذیر ہوئی محترمہ شہناز بانو مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کہانی کو خوب نبھایا ہے باقی کہانیوں کا انتخاب بھی بڑے سلیقے سے کیا گیا تھا۔ خوشبوئے سخن کا آغاز اللہ دتہ عابد صاحب کی حمد اور مسرور کیف کی نعت رسول مقبولؐ سے کیا گیا عمر اسرار بھائی اس روش کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھیں۔ جناب حنیف عاطر، محمد اسلم جاوید، جناب وسیم اختر، سمیع جمال، قدیر رانا، روشانے مہ جبیں اور نسیم شیخ کی غزلیں بہت معیاری تھیں۔ ریحانہ سعیدہ صاحبہ، حنا راجہ اور ناہید غفور کی نظمیں اچھی تھیں اور بھائی سید عبداللہ شاہد تو ہیں ہی بہت اچھے۔ اس بار بھی اچھا گیت لائے ہیں اور محترمہ ثمرین کا انتخاب بھی خوب تھا۔ ذوق آگہی میں ایک سے بڑھ کر ایک آئٹم تھا۔ خدائے لم یزل ہمارے اس جریدے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ جناب مشتاق احمد قریشی السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے۔ کسی کام کے سلسلے میں شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر دیگر پرچوں کے ساتھ ماہ ستمبر 2013ء کا تازہ پرچہ بھی نمایاں تھا۔ ایسا دل کش پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک قبول کریں۔ اس بار سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ نئے افق کا اپنا ہی ایک معیار ہے مقررہ وقت پر پرچہ مل جاتا ہے۔ غزل شائع کرنے کا شکریہ۔ آپ کا خلوص ہی ہمارے لیے کافی ہے یہی جذبہ آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ نئے قلمکاروں کی آپ دل سے قدر اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آپ ہم سے کافی دور ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ آپ میرے دل کی دھڑکنوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ نئے افق کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ مثلاً گفتگو، اقرا، دستک، بزم سخن، خوشبوئے سخن اور روحانی مسائل وغیرہ اس بار کہانیوں میں گردش، کفارہ، احساس، احمق، انتقام، قلندر ذات سے بے حد متاثر ہوں۔ ان رائٹروں کو میری جانب سے دلی مبارک ہو۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں، آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اور کوئی خاص بات نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی السلام علیکم! خاصی دیر سے میگزین ملا۔ خیر دیر سے ہی مگر مل تو گیا نا اور فہرست سے تو جیسے جسم کو آکسیجن مل گئی۔ ہم بانی پاکستان کے آخری ریسٹ ہاؤس کی حفاظت نہ کر سکے مگر یہ معصوم پرندے اور پاکستانی شاہین تو پنکھوں کا سایہ تو کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو عبرتناک انجام سے دوچار کرے، آمین۔ دستک میں بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو مختلف گہری چالوں سے فساد اور سازشیں پھیلاتے رہیں گے۔ گفتگو میں حدیث شریف ایک مشعل راہ ہے کہ مومن کے لیے ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے۔ کاش ہم اس کو ایک فیصد بھی سمجھنے کی صلاحیت رکھیں تو یہ معاشرہ سدھر جائے، آمین۔ محمد سلیم اختر جی خوب تبصرہ تھا اور ملاقات کا طریقہ نکالیں اور عمران جی سے میرا موبائل نمبر لے لیں پھر کوئی نہ کوئی طریقہ ملاقات کا نکل ہی آئے گا۔ شجاع جعفری مختصر اور اچھا تبصرہ لائے تھے۔ یہ ہمارے پڑوسی ریاض بٹ صاحب تشریف لائے ہیں اور محبت کا تحفہ بھی لائے ہیں۔ تبصرہ خوب تھا ڈھیروں دعاؤں کا طالب ہوں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ آپ کو بے حد سلام اور تبصرہ بہت خوب تھا۔ سب کو یاد کیا۔ دعاؤں میں لنگاہ صاحب یاد رکھیے گا۔ یہ عبدالحکیم ساجد صاحب تو ہمارا تذکرہ کرنا ہی بھول گئے؟ اسی طرح جیسے چمن آباد کے سرور شاد نئے افق کی بیٹھک میں آنا بھول چکے ہیں اور کبھی اپنے پڑھنے والوں اور نئے افق کے ساتھیوں کی بات نہیں مانتے۔ بھئی ہمارا کوئی حق نہیں۔ اختلافات

اگر ہوں گے بھی تو بھئی سب کچھ بھول کر آؤ اور اپنی نگارشات اور افسانوں کو نئے افق میں جلوہ گر ہونے دو اور یہ اللہ دتہ عابد بھی جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ خوش آمدید عابد جی۔ ریاض حسین قمر تبصرہ بڑا گہرا، تفصیلاً اور فرداً فرداً تھا۔ بہت خوب۔ لیجیے اختصار نویسی ختم اور پہلے والا سلسلہ شروع یاد کرنے کا شکریہ۔ فورٹ عباس سے عمر فاروق صاحب چند اعتراضات لے کر آئے ہیں۔ کبھی ریاض بٹ صاحب کی کسی کہانی کا معیار نہیں گرا اور یہ بھرمار تو نہیں کہلاتی بلکہ تسلسل برقرار رکھنے کو باقاعدگی کہتے ہیں۔ کبھی کوئی اونچ نیچ بھی ہو جائے تو درگزر کریں کہ یہ چیز رائٹر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ دوسرے انجم فاروق ساحلی کی فولادی لڑکی نے مایوس کیا تو یہ اپنا اپنا ذوق ہے اور یہی کہانی ہزاروں کو اچھی لگی تھی اور ردی کی ٹوکری کا حق تو عمران احمد صاحب ہی زیادہ جانتے ہیں کہ ذرا سا بھی کہانی میں جھول ہو تو ردی کی نذر ہو جاتی ہے۔ خیر آپ کا تبصرہ خوب تھا۔ ذاتی تنقید کا کوئی مطلب نہیں سب بہتری کے لیے کرتے ہیں۔ یہ آزاد کشمیر والی ثوبیہ جہانگیر آپ خود وضاحت کر دیں یا عمران احمد ذرا بتا دیں شکریہ۔ عبدالمالک کیف کا تبصرہ بھی خوب تھا اور محمد ارشاد قریشی کے متعلق پڑھ کر بے حد صدمہ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے آمین۔ کیف جی لیجیے تبصرہ کی طوالت برقرار ہوگئی ہے اور آپ کے حکم کے مطابق اس شمارہ میں زبردست تبصرہ حاضر ہے جناب۔ باقی شہناز بانو، شہنی ارشاد، ریحانہ سعیدہ، اللہ دتہ عابد، ابن شاہین، ارشاد حسین، محمد اسلم جاوید، سید عبداللہ شاہد، رانا حنیف عاطر، روشانے مبین، طارق خان اور عالیہ انعام صاحبہ کی حاضری ضرور ہوگئی ہے اور غیر حاضری کو طوالت نہ دیں سب اگلے شمارہ میں حاضر ہوں۔ درس حدیث زبردست تھا ایک وعظ ایک درس ایک سبق صحیح چن کر محترم طاہر قریشی لائے ہیں اور پڑھتے پڑھتے دل کی گہرائیوں میں جا بسا۔ مبارک باد کے ساتھ جزاک اللہ۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے یہ ہمارے اقبال بھٹی جی کی کہانیوں کی غیر حاضری ذرا طویل نہیں ہو گئی ہے۔ براہ کرم نام تو آتا ہے ہی آپ کا مگر کہانی ضرور لایا کریں جناب۔ درندہ زبردست جا رہی ہے مراد اور نغمہ کا کردار خوب ہے۔ اللہ کرے کہ مراد زندہ رہے۔ بدیسی کہانیوں میں شکیل صدیقی کی جدائی بڑی زبردست نفسیاتی کہانی تھی۔ آخر کار یہ سائیکلو تھراپی بھی ملی کی خودکشی کا سبب بن گئی۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ بہرحال اچھی کہانی تھی۔ حسن اختر پریم کی احمق بھی خوب کہانی نکلی اور قاتل خود ہی اپنے جال میں پھنس کر مقتول بن گیا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اتنی بڑی رقم اور جائداد اس کی قسمت میں لکھی جا رہی ہے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ واقعی احمق ہی تھا۔ گردش کا اختتام نہایت ہی جاندار، خوب صورت اور بہترین موڑ دے کر کیا گیا۔ اسعد علی کی رادھیکا ماورائی اور طوالت لیے ایک اچھی کہانی رہی کامیاب کوشش تھی۔ دوسرے موضوعات پر اسعد علی آپ کی اور بھی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ راولپنڈی کا پروگرام کب تک بن رہا ہے۔ مکافاتِ عمل بھی معاشرتی کہانی خوب عبرتناک انجام سے دوچار کہانی رہی۔ بشیر احمد بھٹی کی خوب کاوش ہے۔ ایک چیونٹی کو بے وجہ مارنے پر ایک شخص کو بے قصور ہوتے ہوئے پھانسی دے دی گئی۔ یہ کہانی بھی ایک حقیر جانور کتے کی ہے اللہ تعالیٰ بے وجہ اور ظالمانہ ظلم اپنے ان معصوم جانداروں پر نہیں دیکھ سکتا اور پھر بدلہ انسان چکاتا ہے۔ محمد سلیم اختر کی کفارہ ایک نصیحت آموز معاشرتی کہانی ہے اللہ جب من میں نیکی کا بیج بو دیتا ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ قلندر ذات زیر مطالعہ ہے۔ خلیل جبار کی احساس بہت ہی اچھی اور مثبت خیالات سے بھری کہانی تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی شہریار نے نائلہ کی محبت کا بھرم بڑی جواں مردی سے قائم رکھا۔ ریاض بٹ صاحب کی انتقام بھرپور جاسوسانہ مواد لیے ہوئے بھی۔ واقعی یہ انوکھا انتقام ہی تھا۔ بٹ صاحب اگلی کہانی کا انتظار رہے گا۔ قلندر ذات اور جگت سنگھ پر اگلی دفعہ تبصرہ کروں گا۔ عجیب و غریب کب لا رہے ہیں ہم منتظر ہیں۔ روحانی علاج، محترم حافظ بشیر احمد صاحب بے حد نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ خوشبوئے سخن تو عمر اسرار بے حد محنت سے ترتیب دیتے ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔ آزاد نظموں میں ریحانہ سعیدہ نمبرون رہیں اور حنا راجہ دوسرے نمبر پر۔ غزلوں میں ٹاپ پر ریاض حسین قمر کھڑے ہیں

پھر سمیع جمال براجمان ہیں۔ رانا حنیف عاطر قدیر رانا اور نسیم شیخ بھی بہتر تھے۔ انتخاب میں تمرین جہلم سے ٹاپ پر تھیں۔ عفان احمد صاحب بھی بڑی عرق ریزی سے ذوق آگہی کے لیے ہیرے جواہرات چنتے اور پیش کرتے ہیں۔ پورا میگزین بہت اچھا ہے اس کے لیے عمران احمد کو بمع اسٹاف مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ والسلام

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم! دعا ہے کہ اللہ پاک نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ ستمبر کا سرورق انتہائی دلکش تھا۔ مصور کو بابا لوگ کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک میں سبق ہی سبق موجود ہے۔ گفتگو میں حدیث نے دل میں روشنی کی ایک لہر سی بھر دی۔ اس کے بعد اعلامیہ پیش کیا گیا۔ گفتگو میں صدارتی کرسی محمد سلیم اختر صاحب نے حاصل کی مبارک باد۔ آپ کا تبصرہ اور آپ کی تحریر کردہ کہانی ''کفارہ'' دل سے پسند کی گئی۔ آپ نے اپنی محبتوں میں فقیر کو یاد کیا اس کا شکریہ۔ دوسرے نمبر پر جناب شجاع جعفری صاحب اپنی پیاری پیاری سے باتوں سے سرفراز کرتے ہوئے ملے اور دل خوش کر دیا۔ بڑا بھرپور تبصرہ تھا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ تیسرے نمبر پر ریاض بٹ صاحب موجود ملے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ اللہ پاک آپ کو خوش وخرم رکھے۔ آپ کی سچ بیانی ''انتقام'' نے بھی دل خوش کر دیا۔ پانچویں نمبر پر عبدالحکیم ساجد کا تبصرہ پڑھنے کو ملا بہت خوب۔ جس نے منچن آباد کے پیاروں جن میں اللہ دتہ عابد، محمد سرور شاذ، ثوبیہ شاذ، احمد علی کیف وغیرہ وغیرہ کی یاد دلا دی، کیسے ہو دوستو؟ بھرپور تبصرہ تھا دل خوش ہو گیا۔ چھٹے نمبر پر عزیزی ریاض حسین قمر صاحب بھرپور انداز میں ماہنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اور دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے ملے اور دل خوش کر دیا۔ آپ نے دل سے یاد کیا ہم خوش ہوئے۔ ساتویں نمبر پر عمر فاروق صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ملے مل کر دل خوش ہو گیا۔ میری دعائیں اور سلام محبت آپ کے ساتھ ہیں۔ آٹھویں نمبر پر عبدالمالک کیف صاحب اپنا بھرپور تبصرہ پیش کرتے ہوئے ملے۔ ماہنامہ کی داستانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے قاری بہن بھائیوں سے بھی بات کی اور انہیں سراہا بھی۔ باقی محفل سے غیر حاضر دوستوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اقرا میں جناب طاہر احمد قریشی نے دینی سبق پیش کر کے دل کے سوتے جگا کر رکھ دیے۔ روحانی علاج دکھی بہن بھائیوں کی بھرپور خدمت ہے۔ خوشبوئے سخن عمر اسرار صاحب نے بھرپور لگن سے سجائی۔ ذوق آگہی کا تمام انتخاب اچھا تھا۔ فقیر کی طرف سے عفان احمد کو دعائیں اور مبارک باد کا پیغام پیش ہے۔ خورشید پیرزادہ کا ناول ''درندہ'' تجسس سے بھرپور اور اپنے اندر سسپنس لیے ہوئے تھا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ محترمہ شہناز بانو کی ''گردش'' اپنے اختتام کو پہنچی۔ فقیر کی طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ اسعد علی کی کہانی ''رادھیکا'' کو ماورائی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ محمد سلیم اختر کی سچ بیانی ''کفارہ'' بہت پسند آئی۔ مبارک باد پیش ہے۔ امجد جاوید کی سلسلے وار ''قلندر ذات'' دل سے پڑھی جانے والی تحریر ثابت ہو رہی ہے۔ جس میں الفاظ کی تیزی وطراری، سسپنس، قانون اور لاقانونیت کی اجارہ داریوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ خلیل جبار کی ''احساس''، ریاض بٹ کی ''انتقام'' دونوں تحریریں دل سے پسند آئیں ان کے لکھاریوں کو فقیر کی دعا وسلام محبت پیش ہے۔ شمیم نوید کی ''جگت سنگھ'' اچھی جا رہی ہے۔ مگر کلچر اور ثقافت غیر مذہب کے بجائے اپنے مذہب اور علاقہ سے بھی لی جاسکتی ہے جس سے کہانی کو چار چاند لگ جاتے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

ایمان کا مزہ کیسا ہوتا ہے اور کیسے نصیب ہوتا ہے؟

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونک جانا۔'' (رواہ البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی مٹھاس کیسے نصیب ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے انسان حلاوت ایمان کی منزل کو پہنچتا ہے۔ ایمان کو کسی میٹھی چیز سے تشبیہ دے کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جو دل غفلت، نفسانی خواہشات اور اس قسم کے دوسرے امراض سے محفوظ اور تندرست ہیں حقیقت میں وہی ثمرات محبت اور روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے، جیسے ایک تندرست اور صحیح معدہ رکھنے والا انسان ہی اچھی غذاؤں کے اصل ذائقہ کی لذت پا سکتا ہے اور غیر صحت مند اور صفراء کے مریض اچھی غذاؤں کے لطف سے محروم ہوتے ہیں، مرغوب چیزوں کو معدہ جیسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اسی طرح ایمان بھی قلب سلیم کے نزدیک بہت ہی شیریں اور مرغوب ہے۔

ارشاد نبوی ہوا کہ جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ، حلاوت پائے گا، حلاوت سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں عموماً شارح محدثین لکھتے ہیں کہ حلاوتِ معنوی مراد ہے کیونکہ ایمان کوئی حسی (محسوس کی جانے والی) چیز نہیں کہ اس کی حلاوت حسی مراد ہو اب معنوی حلاوت کیا ہے اس بارے میں علامہ نوویؒ نے اس کو استلذ اذ بالطاعات (اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کر کے لذت پانے) سے تعبیر کیا ہے یعنی انشراح صدر ہو جائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کوئی تنگی اور دل پر بوجھ نہ ہو بلکہ انبساط، خوشی اور اطمینان ہو۔

جیسا کہ ارشاد باری ہے ''پس تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کر لیں۔'' (سورۂ نساء آیت ۲۵)

چنانچہ حلاوت سے مراد یہ ہوا کہ اطاعت اللہ اور اطاعت رسول میں قلب کو شیرینی جیسی حلاوت محسوس ہو جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں کہا جو انہوں نے اپنے شیخ حاجی امداد اللہ مکیؒ کی خدمت میں لکھا تھا کہ ''بندہ کو بحمد اللہ تین چیزیں حاصل ہیں جو محض اللہ کا فضل وکرم ہے پہلی چیز یہ کہ اطراف واکناف سے دو سو سے زائد طالب علم مجھ سے حدیث شریف پڑھ کر اپنی اپنی جگہ درس دے رہے ہیں دوسری چیز یہ ہے

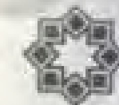
کہ امور شرعیہ امور طبعیہ کی مانند بن گئی ہیں یعنی امور شرعیہ کو چھوڑنے میں ویسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسی کہ بھوک پیاس اور دھوپ سے طبعاً تکلیف ہوتی ہے اور امور شرعیہ کی طرف ویسی ہی رغبت ہوتی ہے جیسی کہ انسان کو بھوک کے وقت میں روٹی کی طرف اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے تیسری چیز یہ کہ مادح اور ذام (یعنی تعریف اور مذمت کرنے والے) دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں۔"

اب اس میں دوسری چیز جو حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے اس مکتوب میں لکھی ہے وہی دراصل استلذاد بالطاعات (احکامات دین کی پیروی میں لذت پانا) ہے اس کو علامہ نوویؒ نے حلاوت معنوی فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس حلاوت معنویہ کی تشریح جزل بالایمان والنقیاد الی احکامہ (ایمان پر یقین اور اس کے احکام پر خلوص سے عمل کرنا) سے کہی ہے ابن ابی جمرہ نے اس تفسیر کو فقہاء کی طرف منسوب کیا ہے۔ بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ یہاں حلاوت معنویہ مراد لینے کی ضرورت نہیں بلکہ یہاں حسی حلاوت ہی مراد ہے' ارشاد نبویہ میں مذکور تین باتوں سے حساً حلاوت معلوم ہوتی ہے' اگرچہ ایمان باطنی چیز ہے لیکن اس کا اثر ظاہری جسم تک پہنچ جاتا ہے چنانچہ محدث عارف کبیر شیخ ابن ابی جمرہ نے منتخب بخاری پر جو شرح "بہجتہ النفوس" لکھی ہے اس کی جلد دوم صفحہ ۲۵ تا ۲۸ میں اس بارے میں بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں حلاوت حسیہ کا انکار کیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ "حلاوتِ ایمان" ایک ایسی بات ہے کہ اس کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو خود بھی اس مقام تک پہنچتے ہوں لہٰذا اگر تمہیں یہ مٹھاس محسوس نہیں ہوتی تو جن کو محسوس ہوتی ہے ان کو نہ جھٹلاؤ۔"

یہاں حلاوت ایمان کے لیے تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ان میں سب سے بنیادی چیز اللہ تعالیٰ کی محبت ہے' اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ محبت کے لائق ہیں کیونکہ محبت کے تمام اسباب مکمل طور پر اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں' اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پھر تمام نیک لوگوں سے اللہ کی خاطر محبت رکھنا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے عجیب وغریب نظارے صحابہ کرامؓ کی حیات میں ملتے ہیں۔ ایک انصاری عورت کا باپ' اس کا بھائی اور شوہر شہید ہوئے وہ عورت آکر پکارتی رہی ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملی کہ وہ شہید ہوگیا اس پر اس نے کچھ نہ کہا۔ بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کی۔ لوگوں نے بتایا کہ خیریت سے ہیں تو اس نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ تاکہ دیکھ کر یقین کرلوں۔" جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو کہنے لگی "آپ کے بعد تو تمام مصیبتیں حقیر ہیں۔"

بشکریہ: "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفیؒ
نائب مہتمم واستاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور



قسط نمبر 1

آتش زیرپا

یعقوب بھٹی

وہ ظلم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا' جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا' جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔

حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی' اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پیروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے' ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے

پھر ایک دشمن جاں نے شب خون مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔

اس کی وحشت دو چند ہوگئی' وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔

پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

ہر سطر ہنگامے' لفظ لفظ تجسس' نئے افق کی نئی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

شمالی وزیرستان کے اس پہاڑی ویرانے میں رات تیزی سے اتری تھی۔ ہم نے ایک پہاڑی نالے کے قریب پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ موسم سرد ہو چلا تھا۔ جس کے سبب چوڑے پہاڑی نالے میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف ایک پتلی سی جھلملاتی لکیر پانی کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔

فضا میں گیدڑ کی مخصوص آواز گونجی تو پڑاؤ میں موجود دو عدد تازی کتے بے چین ہوگئے۔ اعلیٰ تربیت کے حامل وہ کتے دھیمی آوازیں نکال کر اور جسم کی اضطراری حرکت سے بے چینی کا پتا دے رہے تھے۔ نہ جانے کون سی بے چین روحیں ان کے جسم میں بسیرا کیے ہوئے تھیں کہ سارا دن شکار میں مشغول رہنے کے باوجود وہ اس پل بھی شکار کے لیے تیار تھے۔

سینے کی گہرائیوں میں ایک آہ نے جنم لیا اور وہیں کہیں دب بھی گئی۔ میں بھی تو گزشتہ نو ماہ اور دو دنوں سے مسلسل ایک درندے کے شکار کے لیے بے چین تھا۔ ہوش و حواس میں گزاری شاید ہی کوئی گھڑی ہو جو میں نے اس درندے کی تلاش میں صرف نہ کی ہو۔ ٹھہرتا تھا تو قدم جلنے لگتے تھے۔ قدموں میں جلتے انگارے تھے مسلسل اس کی تلاش میں چلنے پر مجبور کرتے تھے۔ میرے وجود میں اس درندے کے خون کی پیاس اتنی شدت سے موجود تھی کہ مجھے اپنی نسیں تک سلگتی محسوس ہوتی تھیں۔

شکر کا مقام تھا کہ ایک مہربان کی مہربانیوں نے میری وحشتوں کو لگام دی تھی۔ ورنہ عین ممکن تھا میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر چکا ہوتا۔

پڑاؤ میں رات کے کھانے کی تیاری شروع ہوچکی تھی۔ سارا دن شکار کیے گئے خرگوش اور مرغابیاں سیخوں میں پرو کر آگ پر چڑھائے جارہے تھے۔ ایک سالم بکرا ابھی انہی مراحل میں تھا۔ اس کے پیٹ کے اندر چاول بھرے گئے تھے۔ یہ

بکرے والا اہتمام خصوصی طور پر میرے دوست و میزبان گل ریز خان نے اپنے چند اور مہمانوں کے لیے کیا تھا۔ ان مہمانوں کا تعلق تاشقند سے تھا۔ ان میں تین خواتین اور دو مرد تھے۔ وہ گل ریز کے کاروباری شراکت دار تھے اور تفریح و شکار کی غرض سے گل ریز کے پاس قیام پذیر تھے۔ اس شکاری ٹولے کی آڑ میں، میں بھی نکل پڑا تھا۔ مقصد تو میرا بھی "شکار" ہی تھا۔ مگر ایک بالکل مختلف نوعیت کا۔

مجھے اس درندے کی تلاش تھی جس کے خون کی طلب مجھے ہر اس جگہ کھینچ لے جاتی تھی جہاں اس کی موجودگی کی ذرا سی بھی بھنک پڑتی تھی۔

شمالی وزیرستان کے ان دور دراز قبائلی علاقوں اکوڑہ خیل، باگڑ خیل، لئی اور پشان میں سرخ بھیڑیئے کی عرفیت سے معروف ایک ڈکیت تھا نور جان، مجھے اطلاع ملی تھی کہ میرا مجرم نور جان کے ڈیرے پر دیکھا گیا ہے۔ یہ کسی معروف زمین دار یا وڈیرے کا ڈیرہ نہیں تھا بلکہ ایک نامی گرامی ڈکیت کا ڈیرہ تھا۔ جس کے گروہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ سو سے زائد خطرناک مفروروں اور اشتہاریوں پر مشتمل ہے۔ سو یہ ڈیرہ کسی خفیہ مقام پر تھا۔ البتہ اتنا معلوم ہوا تھا کہ یہ خفیہ مقام اکوڑہ خیل اور لئی کے درمیان وی شکل کی ایک گھاٹی کے نزدیک ہے۔ کٹی پھٹی سطح مرتفع پر مشتمل اس دشوار گزار خطہ زمین پر درجنوں گھاٹیاں تھیں اور بہت سوں کے متعلق یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا کہ وہ کس شکل کی ہیں۔

یہ مشکلات میرے لیے رائی کے دانے سے زیادہ حقیر تھیں سینے میں فروزاں آگ ہر مشکل سے گزر جانے پر آمادہ رکھتی تھی۔ اس وقت ہم اکوڑہ خیل اور لئی کے درمیان خیمہ زن تھے اور ہماری جولان گاہ یہی درمیانی علاقہ تھا۔

اس کے علاوہ گل ریز انہی پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ خفگی بھرے انداز میں کہا۔ "ہم کیا ہیجڑے ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور تم اکیلے لڑو گے۔" جذباتی ہیجان کے سبب اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ "گل ریز خان تمہارا دوست ہے تو تمہارے دشمن میرے بھی دشمن ہیں۔ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑوں گا۔ میں نے صرف احتیاط برتنے کا مشورہ دیا ہے۔ اکیلے لڑنے کے لیے نہیں کہا۔"

میں نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ مگر اس کے جسم کا خفگی بھرا تناؤ برقرار رہا۔ "یار! میری بات کا تم نے غلط مطلب لے لیا ہے۔" میں نے مزید اسے بھینچا۔ "میں یہاں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں تمہارے بازو ہی میرے بازو ہیں۔"

کچھ ہی پل میں اس کی ساری خفگی دور ہو چکی تھی۔ میرے کندھے پر بازو رکھے وہ کہہ رہا تھا۔ "لالے! ویسے تو جیسے تم چاہو وہی راستا اپناتے ہیں۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ سرخ بھیڑیے کو ناچ گانے کی محفل سے واپسی پر تعاقب کر کے گھیرا جائے۔"

مجھے اس مشورے کی کوئی واضح وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری پیشانی پر الجھن کی سلوٹ دیکھتے ہی گل ریز نے جلدی سے کہا۔

"شادی کی تقریب ککے زئی قبیلے کے ایک سرکردہ ملک کے بیٹے کی ہے۔ اپنی بستی میں سرخ بھیڑیے کے ساتھ ہونے والا کوئی سانحہ پورے قبیلے کو بھڑکا دے گا اور نا ختم ہونے والی ایک خونی دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی اور!"

میں ایک لحظے میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یار! جس بات پر کچھ دیر پہلے تم اچھے خاصے خفا ہو چکے ہو۔ وہ

دراصل یہی ہے کہ میں تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میرے میزبان کی حیثیت سے تمہاری مشہوری تمہارے لیے ضرر رساں ہے۔ تمہارا تعاون مجھے حاصل رہے۔ مگر تم بیک فٹ پر رہو یہ زیادہ بہتر ہے۔"

حیرت انگیز طور پر بات گل ریز کی سمجھ میں آ گئی۔ میری مزید کوشش کے سبب اس کی معمولی ہچکچاہٹ مکمل رضامندی میں بدل گئی۔

میں نے تو اپنے مقصد کی تکمیل کے ساتھ ہی اس علاقے کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ مگر گل ریز کی جڑیں تو یہیں تھیں۔ اس کے لیے اس علاقے میں جہاں معمولی بات پر جان لی اور دی جاتی تھی۔ میں کوئی جان لیوا دشمنی کا سلسلہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

گل ریز کا یہ مشورہ کچھ ایسا غیر مناسب بھی نہیں تھا کہ سرخ بھیڑیے کو واپسی پر گھیرا جائے بھری پری بستی میں ہم درد اور کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے والے دوستوں کے درمیان اسے کھینچنے کے بجائے کسی ویران گھاٹی میں اسے گھیر لینا زیادہ مناسب تھا۔

اس کے باوجود میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ اگر جعفر ایرانی، سرخ بھیڑیے کے ساتھ ہوا تو کیا اس کی "دید" کے بعد میں اپنی وحشت پر قابو پا کر تعاقب جیسا ٹھنڈے مزاج کا طالب کام سرانجام دے سکوں گا؟

میں اور گل ریز خاصی دیر مغز ماری کرتے رہے۔ آخر طے یہی ہوا کہ سرخ بھیڑیے کو تعاقب کر کے ہی گھیرا جائے۔

مجھے انفرادی طور پر شکاری پرندوں کے تاجر کے طور پر ناچ گانے کی اس محفل میں شرکت کرنا تھی۔ سرخ بھیڑیا نایاب پرندوں اور حسین و شاداب عورتوں کا بے حد رسیا تھا۔ عورتوں کو وہ دل بہلانے کے لیے اور نایاب پرندوں کو قدر دانوں تک منہ مانگے داموں بیچنے کے لیے اپنے پاس رکھتا تھا۔

بھنے گوشت کی خوش بو اشتہا انگیز ہو چکی تھی۔ تاشقند والے مہمان ایک قریبی پہاڑی پر غروب آفتاب کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے چڑھے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی میں تاخیر اور اندھیرا ہونے کے سبب گل ریز تشویش میں مبتلا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ملازم دوڑاتا۔ وہ لوگ واپس آ گئے۔ دو ملازم بھی ان کے ساتھ تھے۔

"تم لوگوں کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی لوٹ آنا چاہیے تھا۔" گل ریز نے انگریزی میں کہا۔ پھر وہ پشتو میں دونوں ملازموں پر خفا ہونے لگا۔ ملازموں نے ہکلاتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ ان کا اشارہ مہمانوں کے گروپ کی سب سے چلبلی اور نوجوان لڑکی کی طرف تھا۔ زاشے نامی یہ لڑکی ڈھیلے درجنوں ڈوریوں والے ٹراؤزر اور شوخ براؤن رنگ کی پھنسی ہوئی ٹی شرٹ میں ملبوس گردن میں قیمتی ڈیجیٹل کیمرہ لٹکائے اطمینان سے چیونگم چبانے میں مصروف تھی۔ ملازمین کے اشارے بھانپتے ہی اس نے کہا۔

"ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں۔ تاخیر میری وجہ سے ہوئی۔ میں بالکل آخری سورج کی کرنوں کو اپنے کیمرے میں قید کرنا چاہتی تھی۔" پھر اچانک ہی اس نے ناک سکیڑی یہ منظر خاصا دل فریب تھا۔

"اف یہ زبردست خوش بو...... ملک لگتا ہے کوئی خصوصی اہتمام ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس کی نظر کوئلوں پر لٹکے سالم بکرے پر جا ٹکی۔ اس کی دلچسپی دو چند ہو گئی۔ وہ کیمرا سنبھالتی فوراً اس طرف بڑھ گئی۔

دوسری لڑکی جو زاشے کی بڑی بہن تھی کھسیانی

ہنسی کے ساتھ بولی۔ ''محسوس نہ کرنا ملک! اس کا لا ابالی پن ابھی باقی ہے۔ عقل عمر کے ساتھ ہی آئے گی۔''

''ہمیں نہیں آئی تو اسے خاک آئے گی۔'' دھیمے سے انداز میں یہ کہنے والا زاشے کا بہنوئی جلابی تھا۔

اس بات پر قہقہہ پڑا جب کہ آسین پیار بھری خفگی سے شوہر کو گھورنے لگی۔

کیروسین اور شعلوں کی روشنی میں تاریک کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر کھایا جانے والا وہ کھانا یادگار تھا۔ دیگر افراد کی طرح میں نے بھی خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد خوش بودار روایتی قہوے کا دور چلا۔

میں نے ضرورت سے زیادہ کھا لیا تھا۔ پیٹ میں گرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر چہل قدمی کا سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زاشے نے شاید میرا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ اس کی مترنم آواز ابھری۔

''مسٹر حارث! تم غالباً چہل قدمی کے لیے نکل رہے ہو۔'' میں نے یہاں خود کو اسی نام سے متعارف کروایا تھا۔ میں نے سر گھمایا۔ اس کی ہلکی بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ ''تمہارا اندازہ حیران کن حد تک درست ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ چمکی۔ ''میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اس طرح ملک کو بھی میری فکر نہیں ہوگی۔'' اس نے شریر نظروں سے گل ریز کی طرف دیکھا ملازموں کی دیکھا دیکھی پہلی دفعہ متعارف ہوتے والی لڑکیوں نے گل ریز کو ملک کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں مرد جلابی اور قدوس البتہ اسے گل ریز ہی کہتے تھے۔

میں شاید بتانا بھول گیا ہوں کہ پانچ افراد پر مشتمل تاشقند کے مہمانوں کا یہ گروپ دو شراکت داروں جلابی قدوس، جلابی کی بیوی، سالی اور قدوس کی بیوی آسین آبے پر مشتمل تھا۔

میری رضامندی پاتے ہی زاشے میرے ہمراہ ہولی۔ میری ہمراہی کے سبب گل ریز کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ورنہ وہ مہمانوں کے حوالے سے خاصا حساس تھا۔ اس کی حساسیت بے وجہ بھی نہیں تھی۔ اپنی محفوظ بستی سے دور اس ویرانے میں جہاں ہر طرف مجرموں اور خطرناک ڈاکوؤں کا راج تھا تین نوجوان و مہمان خواتین کی موجودگی اس تعلیم یافتہ روایتی قبائلی کے اعصاب کا کڑا امتحان تھی۔

میں جانتا تھا کہ گل ریز کے ملازمین جو وقت ضرورت بہترین شوٹر بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ جدید ہتھیاروں سے لیس اور پوری طرح چوکس ہیں۔

ہم دونوں شانہ بشانہ پڑاؤ سے نکلے۔ چاند کے ابتدائی دنوں کی رات تھی۔ سو ہر طرف ملگجے اندھیرے کا راج تھا۔ پسلیوں سے چپکا امریکن کولٹ آسودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ آستین میں چھپا بلیڈ کی مانند تیز اور پتلا خنجر محض میرے بازو کی ایک مخصوص جنبش سے میرے ہاتھ میں آ سکتا تھا اور ایک لمحے سے بھی کم وقت میں مدمقابل کا پیٹ چیر سکتا تھا۔

پڑاؤ سے نالے تک خطہ زمین ہموار تھا۔ راستا دیکھا بھالا تھا۔ اس لیے ہم مناسب رفتار سے قدم بڑھا رہے تھے۔ پڑاؤ سے کچھ دور آتے ہی زاشے نے کہا۔ ''مسٹر حارث! ذاتی معاملات میں مداخلت نہ سمجھو تو ایک بات پوچھوں؟''

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ ''پوچھ لو مگر مجھے صرف حارث کہہ کر بلاؤ تو زیادہ بہتر رہے گا۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولی۔ ''ہم لوگ پچھلے تین دنوں سے ایک ساتھ ہیں۔ میں نے تمہیں ہنستے

تو کجا مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔''

میرے وجود میں سناٹا سا چھانے لگا۔ لا ابالی سی نظر آنے والی وہ لڑکی بڑی گہری نظر رکھتی تھی۔

اپنی لہر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس دوران بہت سے مواقع آئے جب حاضرین دل کھول کر ہنسے مگر تم مسکرائے تک نہیں کوئی صدمہ اس کی وجہ ہے یا محض میرا وہم ہے؟'' وہ سر اٹھا کر بغور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے میری زبان کے بجائے میرے چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی ہو۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ''تمہارا وہم ہے۔ بہرحال یاد دلانے کا شکریہ۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ ہنسنے میں دوسروں کا ساتھ دے سکوں۔'' یہ کہہ کر میں نے زبردستی کا ایک قہقہہ لگایا۔ اپنے قہقہے کے کھوکھلے پن کا اندازہ مجھے زاشے کے چہرے کے تاثرات سے ہوا۔ بہرحال وہ ایک مہذب لڑکی تھی۔ بحث اور قیاس آرائیاں کرنے کے بجائے اس نے کندھے اچکائے اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اوکے مان لیتے ہیں۔''

میں نے اس سے نظریں چرا کر گفتگو کا موضوع تبدیل کر دینا مناسب سمجھا۔ ''فوٹو گرافی تمہارا شوق ہی ہے یا تم اس بارے میں کچھ اور سوچ بھی رکھتی ہو؟''

وہ فوراً ہی پرجوش ہوگئی۔ ''قدرتی مناظر کی فوٹو گرافی میرا جنون ہے۔ میں فوٹو گرافی کو پروفیشنل بنانا چاہتی ہوں۔ مگر آسین اور جلابی میرے اس خیال کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔'' اس نے منہ بسورا۔ ''ان کا خیال ہے کہ مجھے اپنی ساری توجہ ایم بی اے کی ڈگری کے حصول پر دینی چاہیے اور فوٹو گرافی کو محض شوق کا درجہ دینا چاہیے۔'' پھر اس کا لہجہ دل گرفتہ ہوا۔ ''ان دونوں کا کہنا ہے کہ میرے کام میں وہ چیز نہیں ہے۔ جو غیر معمولی پن کا احساس لیے ہوئے ہو۔''

''مجھے بھی فوٹو گرافی سے شغف ہے۔ میں تمہاری اتاری ہوئی تصویریں دیکھنا چاہوں گا۔ ممکن ہے کوئی رائے بھی دے سکوں۔''

''واپسی پر میں تمہیں دکھاؤں گی۔'' اس کے لہجے کی شگفتگی قدرے لوٹ آئی۔

کچھ دیر میں ہم پہاڑی نالے تک پہنچ گئے۔ پانی کی پتلی سی لکیر میں کبھی کبھار کوئی ستارہ سا جھلملا اٹھتا تھا۔

اچانک رخش تصور نے جست بھری اور لا متناہی فاصلے طے کر گیا۔ وہ ایسی ہی ایک نیم تاریک اور قدرے خنک رات تھی۔ میری ران میں گولی لگی تھی اور آپریشن کے بعد کائنات مجھے زبردستی ایبٹ آباد لے گئی تھی۔ وہاں ایک پہاڑی پر اس کی ڈاکٹر دوست شمائلہ کا بے حد خوب صورت ہٹ تھا۔ جہاں سے نیچے وادی کا بے حد دل فریب نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

اس ہٹ میں گزارے بائیس دن میری زندگی کے حسین ترین اور یادگار دن تھے۔ ایسی ہی ایک رات میں ہم دونوں ہٹ کی بالکونی میں بیٹھے وادی میں ٹمٹماتی روشنیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اونچی نیچی جگہوں پر بنے مکانوں میں ٹمٹماتی روشنیاں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ بالکونی کے عین نیچے وادی میں ایک بل کھاتی ندی کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

خنکی کے سبب میں نے اپنی گرم چادر کائنات کے کندھوں تک پھیلا دی تھی۔ اس کا سر میرے شانے پر تھا اور اس کے ریشمی تھان کی مانند پھیلے بال میرے کندھوں پر تھے۔ اس کے بالوں سے اٹھتی

خوش بو میرے جسم و جاں کو معطر کر رہی تھی۔ خوش بو ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ کائنات کے بالوں سے اٹھتی خوش بو کسی شیمپو اور کنڈیشنر کی نہیں تھی۔ یہ بڑی جدا سی الوہی خوش بو تھی۔ جیسے بارش کے پہلے چھینٹوں سے اٹھنے والی مٹی کی خوش بو نے جنگلی پھولوں میں رچ کر نیا روپ دھار لیا ہو۔

اس پل میں نے آنکھیں موند لی تھیں اور کائنات کے علاوہ میرے دل و دماغ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنا رخسار اس کے گھنیرے بالوں میں دھنسا دیا تھا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی تھی اور شاید ہم دونوں کی دھڑکنیں بھی ہم آہنگ ہو کر تھم سی گئی تھیں۔

اس سحر انگیز خاموشی کو کائنات کی خمار آگیں آواز نے توڑا۔ ''کاش یہ لمحہ امر ہو جائے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یونہی آپ کے کندھے پر سر رکھے رہوں۔''

میں نے اس کے بالوں کو چوما۔ ''میری بھی یہی خواہش ہے۔''

اس کے بعد دوبارہ سحر انگیز خاموشی نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

چند لمحوں بعد اچانک کائنات کے جسم میں کسمساہٹ ہوئی۔ اس نے بڑی نرمی کے ساتھ میرے کندھے سے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں کا مرکز وادی میں بہنے والی ست رونی ندی تھی۔

''دیکھیں کتنا دل فریب نظارہ ہے۔''

میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ندی کے پانی میں ستاروں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ یہ عکس اتنا واضح تھا کہ لگتا تھا جیسے ستارے ندی میں اتر آئے ہیں۔

''ہے نا خوب صورت؟'' اس نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ اس کی آنکھیں بے حد چمک دار اور شفاف تھیں۔ جیسے سچے موتی۔ میں نے اس کی آنکھوں کو چوما۔ ''ان آنکھوں میں چمکتے ستارے، ندی میں اترے ستاروں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔''

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے دل نشین ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''شعر نہیں سنو گی؟'' میں نے اس کی سب سے بڑی کمزوری کو تھاما۔

''سنائیں۔'' اس نے مزاحمت ترک کر دی۔

میں نے نیچے ندی پر نظر ڈالتے ہوئے بشیر بدر کے دو شعر سنائے۔

تھکی ہاری چاندنی کی کوئی کرن چپکے سے آ کر
میرے پہلو میں سو جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
اندھیری رات میں ستاروں کی ردا اوڑھے
کوئی ندی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

وہ مبہوت رہ گئی۔ میں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ستارہ آنکھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆......

''کتنا خوب صورت نظارہ ہے۔'' زاشے کی سحر زدہ آواز مجھے حال میں کھینچ لائی۔ سینے کی گہرائیوں میں پھر اچانک دل دوز آہ نے جنم لیا اور ہمیشہ کی طرح وہیں دب گئی۔

پانی میں اترے ستاروں نے زاشے کو بھی مبہوت کر دیا تھا۔

''ہاں، واقعی خوب صورت منظر ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

زاشے نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور بالکل اچانک سوال داغ دیا۔ ''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

حوادث کی گود میں مسلسل رہنے کے سبب میرے اعصاب پتھر ہو چکے تھے۔ میں نے چونکے بغیر کہا۔ ''اس سوال کا مقصد؟''

میرے سامنے آ کر اس نے میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ درمیانی فاصلہ برائے نام ہی تھا۔

''میرا وجدان کہتا ہے، تم محبت میں چوٹ کھائے ہوئے ہو۔'' اس کی سانسیں مرتعش ہونے لگیں۔ تمہیں نسوانی سہارے کی ضرورت ہے۔ جو تمہیں دوبارہ سے جوڑ سکے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ میرے سینے سے لگ گئی اور اپنا سر بڑے دل نواز انداز میں میری ٹھوڑی کے نیچے لگا لیا۔ اس کے گرم مرطوب ہونٹ میری گردن کو چھونے لگے۔ اس کا بہکا ہوا تلاطم میں اپنی فصیل جاں پر محسوس کر رہا تھا۔

زاشے کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی پرچھائیں میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ مگر اس تیز رفتاری کی مجھے توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں سن سا ہو گیا۔ جس کے سبب اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ اس کی بانہیں آکٹوپس کی مانند مجھے جکڑنے لگیں۔

اس سے پہلے کہ میرے وجود میں خوابیدہ طوفان انگڑائیاں لے کر بے دار ہوتا میں نے نرمی سے اسے خود سے جدا کیا۔ ''تمہارا وجدان دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ بھونچکا رہ گئی۔ چند لمحے مجھے گھورتی رہی۔ بلا شبہ وہ حسین اور بڑی شاداب لڑکی تھی۔ اس کی پیش قدمی کو اس طرح سے رد کر دینا۔ اس کے لیے بے حد شاکڈ اور حیران کن تھا۔ اس کی قوت تسخیر اور فتح کر لینے والی نسوانی حسن کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔

اس نے مجھے دھیمی آواز میں گدھے کا لقب دیا اور تیز قدموں سے واپس پڑاؤ کی طرف لوٹ گئی۔

میں نے چند گہرے گہرے سانس لیے۔ عورت اور عورت کا جسم میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ جب میری زندگی نے یکسر ایک نیا موڑ لیا تھا تو اس وقت دیگر خباثات کے ساتھ ''عورت'' سے بھی میرا تعلق استوار ہو گیا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ میرا ماضی راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ جس میں کچھ باقی نہیں بچا، مگر ایک چنگاری بچ گئی تھی۔ یہ چنگاری' کائنات کی تھی۔ کائنات ایک دن مجھ تک پہنچ گئی۔ چنگاری دوبارہ سے شعلہ بن گئی تھی۔ میری بیشتر بری عادتیں اس نے چھڑوا دی تھیں۔ عورت سے میں از خود کنارہ کش ہو گیا تھا۔ کائنات کو میں یہ ناسور نہیں دینا چاہتا تھا۔

کائنات کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے بعد بھی میں نے عورت کی طرف رجوع نہیں کیا تھا۔ میری طرف متوجہ ہونے والی زاشے کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں میری ظاہری وجاہت اور شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو کر میرے قریب آنے کی کوشش کر چکی تھیں مگر میرا ردعمل یہی تھا۔ میں وہیں نالے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ آسمان سے ستاروں کے ساتھ ساتھ یادوں کی بھی بارات اتر آئی تھی۔ پل بھر میں، میں ماضی کے تند نالے میں تنکے کی مانند بہنے لگا۔

●......●

میڈیکل کالج جوائن کیے مجھے دوسرا سال تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کے ساتھ دو دیگر تعطیلات آ گئی تھیں۔ میں نے گھر جانا بہتر جانا اور اپنے قصبے جتاں والی کا رخ کیا۔ یہ دور دراز کا پسماندہ سا علاقہ تھا۔ اپنے والد جمال جٹ کی شدید خواہش اور تگ و دو کے سبب میں میڈیکل کالج تک پہنچا تھا۔ میں نے بھی

فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے خود کو باپ کی خواہش کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

پہلے ائرکنڈیشن بس، اس کے بعد مقامی روٹ پر چلنے والی ایک کھٹارہ بس اور اس کے بعد تانگے کا سفر۔ کھٹارہ بس نے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ ان دنوں میں سرشاری کی سی کیفیت میں تھا۔ ہر چیز نئی نئی اور خوب صورت لگتی تھی۔ میں نے کائنات کا پیار جیت لیا تھا۔

ہاں، میں نے کائنات کو جیت لیا تھا۔ تین ماہ پہلے حیدر آباد میڈیکل کالج سے مائیگریشن کر کے آنے والی کائنات جس کے سانولے سلونے چہرے میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ درجنوں لڑکوں کو میں نے اس کے لیے آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ جن میں، میں بھی شامل تھا۔ اس کی ستارہ آنکھوں میں مجھے اپنی "کائنات" نظر آنے لگی تھی۔

کائنات شروع سے ہی ہمارے گروپ میں تھی اور سبھی کو تقریباً یقین تھا کہ ہمارے گروپ بلکہ پورے کالج کا سب سے ہینڈسم لڑکا جعفر، اسے جیت لے گیا۔

جعفر کا تعلق ایران سے تھا۔ میڈیکل کی تعلیم کی غرض سے وہ پاکستان میں مقیم تھا۔ دراز قامت ورزشی جسم، سرخ و سفید رنگت گھنگھریالے ڈارک براؤن بال، کھڑے نین و نقش اور سپنوں کی سوداگری بلاشبہ وہ "لیڈی کلر" کے لقب کا حق دار تھا اور آج کل یہ لیڈی کلر ہاتھ دھو کر "بلیک بیوٹی" کہلانے والی کائنات کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

میری دلچسپی بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جس کے سبب جعفر ایرانی پہلے تو مجھ سے کھنچا کھنچا رہا اور اس کے بعد عامیانہ فقرے بازی پر اتر آیا تھا۔ ایک دو دفعہ ہمارے درمیان تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ کئی ہم درد مجھے اس کے راستے سے ہٹ جانے کا مشورہ دے چکے تھے۔ جعفر ایک سیاسی پارٹی کی چھاؤں میں پلنے والی اسٹوڈنٹ تنظیم کا سب سے متحرک کارکن تھا۔ دنگے فساد میں ہمیشہ آگے رہتا تھا۔ متعدد بار فائرنگ کیس بھی بھگتا چکا تھا۔

مگر میں نے اسے کبھی پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ جٹ باپ دادا کا خون میری رگوں میں آتشیں سیال بن کر دوڑتا تھا۔ خود سری مجھ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

پھر میرے بے پناہ جذبے نے اثر دکھایا۔ کائنات کچی ڈور سے بندھی میرے پاس کھنچی چلی آئی تھی۔ صندلی بانہیں میرے گلے میں ڈال کر اور میرے کشادہ سینے پر سر رکھ کر اس نے ستارہ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے میری ہو جانے کا عہد کیا تھا اور میں گواہ تھا اس عہد کو اس نے نبھایا بھی تھا۔

☆☆☆

نہر کنارے چاچا رمضان عرف رمضٰی اپنے تانگے کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ "اوئے آ پتر کمال!" اس نے گرم جوشی سے مجھے گلے لگانے کے بعد مختصر سا سفری بیگ میرے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی۔ میں نے رسمی سی حجت کے بعد بیگ چھوڑ دیا۔

میں، چاچے رمضٰی کے ساتھ اگلی نشست پر آ گیا۔ تانگا نیم پختہ راستے پر نہر کے ساتھ ساتھ رواں ہو گیا۔ یہ میرا سب سے پسندیدہ ٹریک تھا۔ ایک طرف نہر، دوسری طرف میجر ترین صاحب کا کئی مربعوں پر محیط کینو اور آم کے باغات کا سلسلہ درمیان میں دھول اڑاتا راستا، یہ دھول موسم کی مناسبت سے کبھی کینو کی خوش بو چرا لیتی تھی اور کبھی انور رٹول آموں کی میں نے اس ٹریک پر بڑی دوڑیں لگائی تھیں۔ یہ خوش بو میرے ہر مشامِ جاں میں رچی بسی تھی اور اپنا قصبہ تو میرے سینے میں بستا تھا۔ میرے لڑکپن اور بچپن کی ہزاروں یادیں یہاں سے وابستہ تھیں۔

کینوؤں کا موسم تھا۔ ان کی مہک فضا میں رچی بسی تھی۔ میں نے ایک، دو گہرے سانس لے کر اس خوش بو کو سینے میں اتارا۔

چاچے رمضٰی نے میری کیفیت بھانپ لی بولا۔ "پتر! سیٹ کے نیچے کینوؤں کا تھیلا پڑا ہے۔ دو چار اپنے لیے بھی نکال لے۔ ساتھ میں کالے نمک کی پڑیا بھی ہوگی۔"

کسی تکلف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے فوراً کینو نکال لیے۔ یہ ایکسپورٹ کوالٹی کے کینو تھے۔ جن کا بیش تر حصہ خلیجی ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔

چاچے رمضٰی کا بیٹا باغ میں کام کرتا تھا۔ یقیناً یہ اسی نے باپ کو تھمائے تھے۔

میں نے کینو کھاتے ہوئے چھیڑا۔ "چاچا! تیری شادی کا کیا بنا؟ سنا تھا لوہاروں کی ایک بیوہ تجھ سے شادی پر رضامند ہے۔"

چاچے رمضٰی کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ سینہ غیر ارادی طور پر تن گیا۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی اس کا سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ "اس کا نام بختاں ہے۔ وہ تو دل و جان سے تیار ہے۔ میری اس سے خود بھی بات ہو چکی ہے مگر......!" چاچے رمضٰی کے چہرے پر مایوسی لہرائی۔ "مگر اس کی برادری کے چند بندے ٹانگ اڑا رہے ہیں۔" پھر اس نے ٹانگ اڑانے والوں کو ایک کلاسیکل گالی سے نوازا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "پتر لگتا ہے دوسرا ویاہ میری قسمت میں نہیں ہے۔"

"چاچا! دل چھوٹا نہ کر جو چیز قسمت میں ہو وہ ضرور ملتی ہے۔" میں نے تسلی دی۔

اس نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری۔ "قسمت کا ہی تو رونا رو رہا ہوں۔"

چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد چاچے رمضٰی نے جیسے غیر مرئی مایوسی کو جھٹکا اور نئی بشاشت کے ساتھ کہا۔ "پتر! تجھے میں نے کینو ایسے ہی نہیں کھلائے۔ فی کینو میں نے مچھلی "چھلی" کا ایک دانا لینا ہے تیرے باپ سے۔"

ہنسی کے ساتھ میں نے کہا۔ "وہی میں حیران ہو رہا تھا کہ تو نے سارے کینو میرے آگے کیوں رکھ دیے ہیں۔" وہ کھسیانی انداز میں ہنس دیا۔

میں نے کہا۔ "دو کینو کے بدلے چار دانے تیرے پکے ہو گئے۔ میں خود بھی ابے کو کہہ دوں گا۔"

"اوئے جیو نداره پتر!" اس نے پر جوش انداز میں کہا اور ہلکا سا چابک رسید کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ دیا۔

میری ذہن کی رو اپنے مچھلی فارم کی طرف مڑ گئی۔ والد صاحب کو زمین دار کے بجائے کاشت کار کہنا زیادہ مناسب تھا۔ ہماری کل بارہ ایکٹر زمین تھی۔ بہر حال گزارا ہو رہا تھا اور میری میڈیکل کی مہنگی تعلیم بھی جاری تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تعلیم دیگر کئی ضروریات کو ہڑپ کر گئی تھی۔ خاص طور پر مجھ سے دو سال بڑی بہن نگہت کا بیاہ۔

نگہت قصبے کے گرلز اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد گھر بیٹھی تھی۔ اس کا رشتہ میرے دور کے ایک چچا کے بیٹے سے طے ہوا تھا۔ وہ شادی کے لیے خاصا زور ڈال چکے تھے اور اب خفگی بھی در آئی تھی۔ مزید تاخیر سے یہ رشتہ ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔

والد صاحب نے نگہت کے سسرال والوں کو اسی سال کے آخر میں رخصتی کے لیے زبان دے دی

تھی۔ ان کی ساری امیدوں کا محور و مرکز کپاس کی فصل اور مچھلی فارم تھا۔ اب فصل بھی تیار تھی اور مچھلی بھی۔ والد صاحب کو مچھلی کے لیے کسی مناسب آفر کا انتظار تھا۔ مچھلی فارم سے ہونے والی آمدنی سے وہ بخوبی اور بھرپور طریقے سے نگہت کا فرض ادا کر سکتے تھے اور فصل سے میرے تعلیمی سال کے اخراجات اور گھر کا نظام چلنا تھا۔

کپاس اور مچھلی کے مناسب دام ملنے کی امید کے سبب والد صاحب خاصے مطمئن تھے۔

میں اپنے خیالات سے چونکا۔ سامنے سے ایک سیاہ ہاتھی جیسا پیکر رکھنے والی شاہانہ انداز کی لینڈ کروزر اپنے پیچھے گرد کا ایک طوفان اٹھائے آرہی تھی۔ نیم پختہ اور مختصر سی چوڑائی رکھنے والے راستے پر اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ لمحوں میں وہ ہمارے سر پر پہنچ گئی۔

چاچے رمضٰی کے چہرے پر ہراس نمایاں تھا۔ اس نے ہر ممکن تیزی سے تانگا کچے میں اتارا۔ بوکھلاہٹ کے سبب ایک پہیہ کھالے میں اتر گیا۔ میں نے بہ مشکل توازن برقرار رکھا کھالا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ البتہ چاچا رمضٰی خود کو نہیں سنبھال پایا تھا اور ایک جھٹکے سے کھالے میں جا گرا تھا۔

میری توجہ سیاہ لینڈ کروزر پر تھی اور خون میں ابال اٹھنے لگا تھا۔ لینڈ کروزر زناٹے کے ساتھ قریب سے گزری۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک تنومند سرخ چہرے والے نوجوان کو دیکھا۔ ہماری حالت زار دیکھ کر وہ ہنسا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کے سفید دانت نظر آئے اور پھر لینڈ کروزر آگے بڑھ گئی۔ میں نے اس نوجوان کو پہچان لیا تھا۔ وہ علاقے کے دوسرے سب سے بڑے زمیندار میاں عابد بیگھے کا بیٹا میاں ذوالفقار تھا۔

میرے وجود میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ چاچا رمضٰی کھالے سے نکل آیا تھا اور اب دبی آواز میں بیگھے ملوں کو کوس رہا تھا۔ بیگھے ملوں کو اونچی آواز میں کوسنے کا حوصلہ کسی میں نہیں تھا۔

میں بچپن سے ہی اس خاندان کی چھوٹی' بڑی زیادتیاں دیکھتا آیا تھا۔ خود سری اور شر انگیزی اس خاندان کا طرہ امتیاز تھی۔ آپس میں ان لوگوں کا زبردست اتحاد تھا اور ہر طرف پھیلا یہ خاندان یک مٹھ تھا۔ اس کے اجداد "قبضہ گروپ" تھے اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔

بیگھا مل کا نام اس کے اجداد کو لوگوں نے دیا تھا۔ بیگھا' مقامی زبان میں نصف ایکٹر زمین کو کہتے ہیں اور مل کا مطلب قبضہ کرنے والا یعنی زمین پر قبضہ کرنے والا۔

اس لقب کو آج بھی یہ خاندان بڑے فخر سے اپنے نام کا حصہ بنائے ہوئے تھا۔ سنا تھا کہ ملتان کے قریب تقریباً دس مربعے زمین پر بیگھا ملوں کا کئی سال سے قبضہ تھا۔ دھونس' دھاندلی اور جعل سازی کے سبب عدالت عالیہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تھا۔

یہ حقیقت تھی تو ان کے اختیار' دولت اور شر انگیزی میں مزید اضافہ' دس مربعے زمین ملنے کے بعد علاقے کے سب سے بڑے خاندان ترین کے ہم پلہ ہو سکتا تھا۔

میں نے چاچے رمضٰی کے ساتھ مل کر تانگے کے پہیے کو کھالے سے نکالا۔ واپس تانگے میں بیٹھ کر اس نے ہانپتی نفرت انگیز آواز میں کہا۔ "جب سے انہوں نے ملتان قبضے والی زمین کا کیس جیتا ہے بالکل ہی "ات" اٹھا دی ہے۔ چنگڑوں کی ایک کڑی غائب ہے۔ سنی سنائی ہے کہ غائب ہونے سے پہ

ذوالفقار بیگھے مل کی اس نے "بے عزتی" خراب کی تھی۔ عزت کے ساتھ لگائے اپنے "بے" کے تڑکے پر وہ خود ہی مسکرایا۔

کڑواہٹ اور بے بسی کے سبب میں اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ "اس لڑکی کی ہمت کی پھر داد دینی پڑے گی۔ کسی نے تو بیگھے ملوں کو جواب دیا۔ بے شک ایک لڑکی نے۔"

اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرایا۔ "ہاں' پھر بے چاری کو وڈی قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس رال بہاتے کتے نے پتا نہیں شودی (بے چاری) کا کیا حال کیا ہوگا۔ بڑی سوہنی اور اتھری کڑی تھی۔ پنڈ کے سارے چھوکرے اس کے پیچھے تھے۔ مگر کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔"

افسردگی میرے وجود میں گھر کرنے لگی۔ "چنگڑ چپ کر کے بیٹھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

چاچے رمضٰی کے بوڑھے چہرے پر جیسے صدیوں نسل در نسل چلنے والی بے بسی' غربت اور لاچاری اتر آئی۔ ایک آہ کے ساتھ اس نے کہا۔ "غریب کیا کرے پتر' دو چار گرم مزاج کے جوانوں نے شور مچایا تھا۔ کڑی کا منگیتر ہیرا ابھی ان کے ساتھ تھا۔ ہیرے نے دو' چار جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ وہ تھانے بھی گیا تھا۔ مگر کچھ نہیں بنا۔ الٹا بیگھے ملوں کے ڈشکرے مزارعوں نے ان لڑکوں کو کٹ شٹ چڑھائی ہے۔ ہیرا بڑا تگڑا چھوکرا ہے۔ دو' تین بندے اس نے بھی لٹائے ہیں۔ اب دونوں طرف سے کراس پرچے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو حوالات میں بیگھے ملوں کے مزارعے ککڑ کھا کر قہقہے لگا رہے ہیں اور دوسری طرف چنگڑوں کے چھوکروں کی دن رات چھتر پریڈ ہو رہی ہے۔

ہیرے پر تو 324 کا پرچہ بھی ہو گیا ہے۔ اس کی کلہاڑی سے تین بندوں کو خاصے زخم آئے ہیں۔"

"چنگڑ میجر صاحب کے پاس نہیں گئے؟" میجر اشتیاق ترین نہ صرف علاقے کے سب سے بڑے زمین دار تھے بلکہ انصاف پرور اور خدا ترس بھی تھے۔

بیگھے مل کچھ دبتے تھے تو اس وسیع زمینوں اور وسیع تعلقات والے بندے سے۔

”میجر صاحب اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بیٹے امریکا جا بسے ہیں۔ جاگیر منیجروں پر چل رہی ہے۔ ان میں پہلے والا سا دم خم نہیں رہا۔ بیگھے مل اور زور آور ہو گئے ہیں۔“

”بہر حال چنگڑ میجر صاحب کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے میاں عابد کو بلوایا تھا۔ دو تین دن تو وہ ٹالتا رہا پھر آیا تھا۔ سننے والوں نے سنا ہے کہ بیگھے ملوں کو اب میجر صاحب کے ”بلاوے“ ناگوار گزر رہے ہیں۔ ان کی مرضی ہے کہ آئندہ کوئی مسئلہ ہو تو میجر صاحب خود چل کر آئیں۔

”اس کا مطلب ہے طاقت کا توازن تیزی سے بگڑ رہا ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

چاچے رمضٰی نے سنا نہیں یا میرے الفاظ ہی اسے سمجھ نہیں آئے۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد اس نے گفتگو کے سلسلے کو جوڑا۔ ”میاں عابد میجر صاحب کے ڈیرے پر آیا تو اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس نے برفی بھی نہیں کھائی۔ میجر صاحب کے ڈیرے پر آنے والوں کی ایک خاص باداموں والی برفی سے تواضع کی جاتی تھی۔ وہ برفی شوگر فری بھی تیار ہوتی تھی اور برفی کھانے سے انکار کو میجر صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔

چاچا رمضٰی کہہ رہا تھا۔ ”ڈیرے پر چنگڑ بھی تھے۔ میاں عابد صاف مکر گیا کہ اس کڑی کے غائب ہونے میں اس کے بیٹے کا ہاتھ ہے۔ کڑی کو اٹھاتے بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے میجر صاحب بھی میاں عابد پر زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکے۔ البتہ انہوں نے بڑے رمزیہ انداز میں پوچھا تھا کہ اگر کل کو یہ ثابت ہو گیا کہ کڑی کے غائب ہونے میں اس کے بیٹے یا خاندان کے کسی اور فرد کا ہاتھ ہے تو پھر......؟“

میاں عابد نے بڑے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا کہ۔ ”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ پھر اچانک چاچا رمضٰی کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ ”میجر صاحب کے ڈیرے پر اس وقت تیرا ابا بھی موجود تھا۔“ میں بری طرح چونکا۔ مگر اس کے تسلسل کی خاطر میں خاموش رہا۔ البتہ سینے میں نقارہ سا بجنے لگا تھا۔ چاچا رمضٰی کہہ رہا تھا۔ ”تھوڑی سی تلخی وہاں تیرے ابے اور میاں عابد کے درمیان بھی ہوئی تھی۔“ اس کی لمحاتی خاموشی مجھے کھلنے لگی۔ ”کس بات پر چاچا؟“

اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ بڑھ گئی۔ میرے والد صاحب کی ناراضگی کا خوف اس پر حاوی ہونے لگا۔ والد صاحب کی مرضی اور خواہش تھی کہ مجھے ہر معاملے سے دور رکھا جائے اور میں صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دوں۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چاچا رمضٰی کے لیے خاموش رہنا یا بات بدلنا مشکل تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب میں اس کے سر ہو جاؤں گا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بیگھے ملوں نے جو چمڑا رنگنے کی فیکٹری لگائی ہے اس کے گندے پانی کی نکاسی کے لیے ڈالے گئے پائپ کا معاملہ ہے۔ تیرے ابے کا خیال ہے اگر کسی وجہ سے وہ پائپ پھٹ گیا تو گندا پانی سیدھا تمہارے مچھلی فارم پر آ گرے گا۔

”پھر کیا معاملہ طے پایا؟“ مجھے اندیشے لرزانے لگے تھے اور محسوس ہو رہا تھا خون کی گردش سر کی طرف زیادہ ہو گئی ہے۔ بیگھے ملوں کی چمڑا رنگنے کی فیکٹری ہمارے فش فارم کے بالکل نزدیک اور قدرے بلندی پر واقع تھی۔

”معاملے کا مجھے نہیں پتا۔ میرا بیٹا کسی کام سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا ہے۔“ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چاچا رمضٰی بات کو چھپا رہا ہے۔ اسے جھٹلانا یا کریدنا مناسب نہیں تھا۔ میں والد صاحب سے اس معاملے میں بات کر سکتا تھا۔ میری چھٹی حس نے البتہ کسی ہنگامے کی بو سونگھنا شروع کر دی تھی۔ چاچا رمضٰی نے معاملے کی سنگینی کو بے حد کم کر کے بتایا تھا۔

قصبہ نزدیک آ گیا تھا۔ میں نے خود پر قابو پانا شروع کر دیا۔

جب میں تانگے سے اترا تو نارمل ہو چکا تھا۔

گھر پہنچتے ہی مجھے ماں کی والہانہ محبت نے ڈھانپ لیا۔ میری ماں بڑی سادہ سی عورت تھی۔ کچی دیواروں، دو نیم پختہ کمروں اور وسیع صحن والا یہ مکان ہم دونوں بہن، بھائی اور والد صاحب اس کی کل کائنات تھے۔

ماں دیر تک مجھے چمٹائے میرے کندھے چومتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ نگہت کے چہرے پر بھی مجھے ہراس نظر آیا۔

”کیا ہوا اماں؟ رو کیوں رہی ہیں؟“ میں نے اس کے دونوں بازو تھام کر آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا ہونا ہے پتر، اتنے دنوں بعد تو نظر آیا ہے۔ اس لیے آنکھیں تر ہو گئی ہیں۔“ وہ آنسوؤں میں مسکرائی۔

یہ مسکراہٹ مجھے پھیکی سی لگی۔ والد صاحب بھی گھر نہیں تھے۔ حالانکہ میری آمد کی اطلاع پر وہ ہمیشہ مجھے گھر پر ہی ملتے تھے۔ ان کی بے چین بانہیں میری منتظر رہتی تھیں۔

”تو بے شک میری ماں ہے۔ مگر میں بھی تیرا بیٹا ہوں۔ بتا کیا پریشانی ہے؟“ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ماں کے آنسوؤں نگہت کے ہراس اور والد صاحب کی غیر موجودی کا تعلق ضرور بیگھے ملوں سے ہونے والے تنازعے کے سبب ہے۔“

ماں نے بازو چھڑا کر میرا سر جھکایا اور پیشانی چوم کر قدرے شوخ محبت سے کہا۔ ”بیٹا ہے تو بیٹا ہی رہ......! باپ نہ بن۔ کوئی پریشانی نہیں ہے تو بیٹھ میں تیرے لیے لسی لاتی ہوں۔“ میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ماں منظر سے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے بھی فی الحال مزید کرید مناسب نہیں سمجھی۔ ابھی میں دو دن یہیں پر تھا۔

نگہت کو میں نے بیگ میں سے دہی بھلوں کا شاپر نکال کر دیا۔ سرد موسم کے سبب وہ پلاسٹک کی تھیلی میں محفوظ اور تازہ تھے۔ نگہت کو تیز مسالے کے یہ شہری دہی بھلے بے حد پسند تھے۔ وہ ہراس کی سی کیفیت سے نکلی اور دہی بھلے لے کر باورچی خانے دوڑ گئی۔

ماں میرے لیے نمکین لسی لے آئی۔ مٹی کے پیالے میں اس نمکین مشروب کا ذائقہ ہمیشہ کے لیے میری زبان پر گھل گیا ہے۔ میں نے بعد میں دنیا کے درجنوں مشروب بیش قیمت پیمانوں کے ذریعے حلق میں انڈیلے مگر اس مٹی کے پیالے اور نمکین لسی کی پیاس کوئی نہ بجھا سکا۔ ماں کی محبت سے لبریز مٹی کا وہ پیالہ ہمیشہ مجھے یاد رہا۔

میں نے پہلا پیالہ تیزی سے حلق سے اتارا اور دوسرے کی چسکیاں لینے لگا۔ نگہت دہی بھلوں کی بڑی سی پلیٹ بھر کر میرے سامنے آ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی چمکنے لگی تھی۔ ماں نے بیٹے کی خاطر باورچی خانے کا رخ کیا۔

”بھائی! میری بھابی کا دل جیتا یا ابھی تک آہوں

پرہی گزارا ہے۔''ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے خاصے قریب تھے۔ وہ کائنات کے بارے میں بھی کچھ جانتی تھی۔

میں نے اس کی ناک چٹکی میں دبائی۔ ''اوئے پاگل! تیرا بھائی کوئی ایویں شے ہے۔ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی ہے۔ سارا کالج تیرے بھائی پر رشک کررہا ہے۔'' وجود میں تہہ در تہہ پھوٹنے والی خوشی کا عکس میرے چہرے اورآواز میں نمایاں تھا۔

فوراً ہی یہ عکس ماں جائی کے چہرے پر بھی نظر آنے لگا۔ ''بھائی!'' وہ دہی بھلے چھوڑ کر میرے کندھے سے آ لگی۔ ''بھابی کو ملنے میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' اس نے بڑے مان اور لاڈ سے کہا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اوئے جنی! تو کیوں ملنے جائے گی۔ مہینے کے آخری ویک اینڈ پر میں اسے گھر لے آؤں گا۔''

''سچ بھائی!'' اس نے سر مزید میرے شانے پر دھنسایا۔

''بالکل سچ! بس تو اتنے دنوں میں ماں کا ذہن بنا' وہ ابے کے کانوں میں خود ہی انڈیل دے گی۔''

''یہ میں کرلوں گی۔'' اس نے سر ہلایا۔

اسی وقت والد صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ''بھئی کیا گوریلا گلاں (زارداری کی باتیں) ہورہی ہیں۔ بہن' بھائی میں۔'' ان کا لہجہ پدرانہ محبت سے لبریز تھا۔

میں فوراً اٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔ سبھی لوگ کہتے تھے میں اپنے والد صاحب کا عکس ہوں۔ وہ خوب تنو مند' قد آور اور چوڑے شانوں کے مالک تھے۔ گندمی چہرہ' جذباتی کیفیت میں سرخ ہوجاتا تھا۔ گھنی سیاہ اور بل دی ہوئی مونچھیں ان پر بہت جچتی تھیں۔ ہر محفل میں وہ نمایاں ہوتے تھے۔ وہ اس وقت سفید چادر' بوسکی کے کرتے میں ملبوس تھے۔ سر پر ململ کے کپڑے کی کلف دار پگڑی تھی۔

میں قدرے مضطرب ہوگیا۔ اس لباس میں عموماً وہ کسی انتظامی آفیسر یا بڑے زمیندار سے ملنے کے لیے جاتے تھے۔ ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ ''خیر ہے؟ کہاں گئے تھے آپ؟''

''بس' ذرا مینجر صاحب کی طرف اچانک جانا پڑ گیا تھا۔'' انہوں نے بشاشت سے کہا۔ مگر یہ بشاشت مجھے مصنوعی سی لگی۔

''چل کڑیے میرے لیے دوسرے کپڑے نکال۔''

نگہت ہرنی کی طرح قلانچ بھر کر کمرے سے نکل گئی۔

والد صاحب نے ٹٹولنے کے انداز میں مجھے بازوؤں سے تھاما۔ محبت ان کے چہرے پر ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

''پتر! تیرا جسم ڈھیلا لگ رہا ہے۔ تو جٹوں کا منڈا ہے۔ ورزش کیا کر اور ماں جو تجھے دیسی گھی کی پنجیریاں بھیجتی ہے۔ دوستوں کو بے شک کھلایا کر مگر خود بھی کھایا کر۔''

میں کھسیانے سے انداز میں ہنسا۔ مضبوط اور توانا جسم خدا کی دین تھا۔ مگر میں نے اسے مزید مضبوط بنانے پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔

شفیق باپ کی توجہ فوراً میری آنکھوں کے نیچے پڑنے والے حلقوں نے کھینچ لی۔ ''اوئے' راتوں کو جاگتا ہے کیا؟'' خفگی آمیز پریشانی سے انہوں نے کہا۔

''بس' ابا جی! رات کو پڑھتا رہتا ہوں۔ اس لیے......!'' یہ سفید جھوٹ بولتے ہوئے میرا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ یہ حلقے درحقیقت کائنات کے

عشق میں رت جگوں کی نشانی تھے۔

والد صاحب کی خفگی فوراً ختم ہوگئی۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر مجھے سینے سے لگایا۔ ''جیوندا رہ پتر۔ تیری یہ محنت ضرور رنگ لائے گی۔ پھر بھی ذرا جلدی سونے کی کوشش کیا کر۔''

''جی ابا جی۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔

ماں کے ہاتھ کے بنے قیمہ کریلے خوب ٹھونسنے کے بعد میں نے کچھ دیر آرام کیا اور شام کو اپنے فش فارم کا رخ کیا۔ والد صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ' فش فارم پر بہت زیادہ توجہ دے رہے تھے اور اس کی معقول وجہ تھی۔ اسی کے سہارے تو انہوں نے اکلوتی بیٹی کو دھوم دھام سے رخصت کرنا تھا۔

فش فارم کا چکر لگانے کا میرا خاص مقصد تھا۔ میں' بیگھے ملوں کی چمڑا رنگنے والی فیکٹری سے نکلنے والے کیمیکل سے آلودہ پانی والے پائپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

جیسے جیسے میں فش فارم کے نزدیک ہورہا تھا۔ فضا میں چمڑے کی سڑاند بڑھتی جارہی تھی۔ اس فیکٹری نے اپنی تکمیل کے بعد حال ہی میں کام شروع کیا تھا۔

جہاں تک میرا اندازہ تھا زرعی زمینوں اور پانی کے کسی بڑے ذرائع آب پاشی کے نزدیک ایسی فیکٹری لگانا ممنوع تھا۔ مگر بیگھے مل تو کسی قانون کو خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے۔

یہ فیکٹری بے شک آبادی سے دور تھی۔ مگر زرعی زمینوں کے درمیان تھی اور نزدیک ہی ایک بڑی نہر 78 بی۔ آر گزر رہی تھی۔

یہ شاید ہماری بدقسمتی تھی کہ اپنی مختصر سی زمین کے ساتھ بیگھے ملوں کے ہمسائے تھے۔ ہماری زمین ان کی وسیع زمینوں کے ساتھ ہی تھی۔

مچھلی تیار ہوچکی تھی۔ مختصر سے جال کے ذریعے والد صاحب نے مجھے مچھلی کے ''دانے'' چیک کروائے۔ جال میں آنے والے آٹھ دانوں میں سے کسی کا وزن بھی دو کلو سے کم نہیں تھا۔

والد صاحب کے چہرے پر طمانیت اور خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ تفکر کی خفیف سی لکیر بھی تھی۔ میں اس سلسلے میں رات کو انہیں کریدنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ فی الحال میں اس پائپ کو دیکھنا چاہتا تھا جو ہماری خوشیوں کے لیے ''دلٹکتی تلوار'' بن گیا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس پائپ کو دیکھ لیا۔ بارہ انچ قطر کا وہ پلاسٹک کا پائپ ایک اونچے پشتے پر کسی اژدھے کی مانند لیٹا تھا۔ ہمارا فش فارم کا تالاب اس پشتے کے نیچے نشیب میں تھا۔ اگر کسی وجہ اس پائپ کو نقصان پہنچا تو خطرناک کیمیکل سے آلودہ پانی کو تالاب تک پہنچنے میں محض چند سیکنڈ لگنے تھے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر والد صاحب نے پائپ کے ساتھ ساتھ ایک نالی سی کھدوانا شروع کردی تھی۔ مگر پائپ کے قطر کو دیکھتے ہوئے یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی۔ نالی کو زیادہ چوڑا اور گہرا بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس سے سیلابی ریلے سے بچاؤ کے لیے تعمیر کیے گئے پشتے کے کمزور ہونے کا شدید خطرہ تھا۔

میں نے اس خطرناک پائپ کے ساتھ سفر شروع کردیا۔ سفر اور پائپ کے اختتام کے ساتھ ہی مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ خطرناک آلودہ پانی اس پائپ ذریعے بڑی نہر میں ڈالا جارہا تھا۔ اتصال کے اس مقام پر سڑاند اور شدید ترین بدبو کے سبب سانس تک لینا محال ہورہا تھا۔ بے حسی اور مفاد پرستی کی یہ انتہا تھی بیگھے مل علاقے کی شادابی اور انسانی

محبت لے در پے تھے۔ انتہائی حیرانی کی بات تھی لوگوں نے اس پر احتجاج کیوں نہیں کیا تھا اور محکمہ انہار وزراعت کہاں غفلت کی نیند سو رہے تھے۔

میرا خون کھولنے لگا۔ سامنے ہی بیگھا ملوں کا ایک ڈیرا تھا۔ میں بے دھڑک اندر چلا گیا۔ وسیع لان میں کھڑی قیمتی جیپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ بیگھا مل فیملی کا کوئی ممبر وہاں موجود ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر ملازمین کی تیوریاں چڑھ گئی ہیں۔ ایک، دو گن مین بھی نکل کر سامنے آ گئے تھے؟

"کیا بات ہے؟" ایک گن مین نے قدرے اکھڑ انداز میں پوچھا۔ اس دوران ایک منشی ٹائپ ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص بھی میرے قریب آ گیا تھا۔

میں نے ناگوار گزرنے کے باوجود نرمی سے کہا۔ "میاں صاحب موجود ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔" منشی نے میرا تولنے کے انداز میں جائزہ لیا اور خلاف توقع نرم انداز میں کہا۔ "تو جمال جٹ کا پتر ہے نا؟ شہر میں پڑھتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "بڑے میاں جی اتفاق سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں، انہیں تیرے بارے میں خبر دیتا ہوں۔" پھر اس کا لہجہ رمزیہ ہوا۔ "ویسے تو ملنا کیوں چاہتا ہے ان سے؟"

"یہ میں انہیں ہی بتاؤں گا۔"

اس تلخ جواب پر منشی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے طیش چمکا۔ گن مینوں نے بھی بے چینی سے پہلو بدلے تھے۔ منشی گرگ باراں دیدہ تھا۔ لہجے کو میٹھے زہر میں ڈبو کر بولا۔ "پتر جی، میاں صاحب سے ہر ایرا غیرا نہیں مل سکتا۔ تو پڑھنے والا بچہ ہے اس لیے ملوا دیتا ہوں۔ ہمیں آنے والے کی نیت اور ارادے کو دیکھنا پڑتا ہے۔"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد "بلاوا" آ گیا۔ میں روایتی انداز میں سجے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ایک چوکس گن مین میرے عقب میں تھا۔ سامنے ہی ایک تخت نما جگہ پر میاں عابد بیگھے مل گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی پلیٹ چمن کے مشہور انگوروں سے بھری پڑی تھی۔

پچپن سال کی عمر چوڑی ہڈی سرخ چہرے پر خضاب میں رنگی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں، موٹی گردن اور پھیلی ہوئی خاندانی ناک اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ بھری آنکھیں مجھ پر جمائیں۔ میں نے اسے سلام کیا۔

بھاری آواز میں سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تخت کے سامنے پڑی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گیا۔

"کیسے آیا ہے کاکے؟ تیرے باپ کو تو ہمارا نام سننا گوارا نہیں تو ہمارے ڈیرے پر چلا آیا ہے۔" اس نے کئی انگور بہ یک وقت منہ میں ڈالے۔

میرا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ بیگھے ملوں کے ساتھ والد صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران ایک ملازم نے میرے سامنے بھی انگوروں کی بھری ہوئی پلیٹ رکھی۔

میں نے الفاظ مجتمع کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ "میاں صاحب! مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میرے والد صاحب کے ساتھ آپ کے تعلقات کشیدہ ہیں ورنہ ممکن تھا میں نہ آتا۔ میں نے تو ایک بہت بڑا نقصان ہوتے دیکھا اور آپ کی توجہ اس طرف دلانے کے لیے چلا آیا۔"

"کیسا نقصان؟" اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑیں۔

"آپ کی چمڑا رنگنے کی فیکٹری کا آلودہ پانی براہ راست بڑی نہر میں شامل ہو رہا ہے۔ یہی پانی فصلوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے مویشی اور جگہوں پر تو انسان بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہ پانی فصلوں اور جان داروں کے لیے بے حد مضر ہے۔" اس کے چہرے پر بڑی خبیث سی مسکراہٹ چمکی۔ بڑی تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ مجھے اپنے خون میں کھولن سی محسوس ہوئی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بات مکمل کی۔ "اللہ نے آپ کو وسیع رزق دیا ہے۔ آپ ٹریٹ منٹ پلانٹ لگوا لیں اس سے گزرنے کے بعد یہ پانی اس قابل ہو جائے گا کہ اسے نہر میں چھوڑا جائے اور آپ کے فیکٹری سے نکلنے والے اس آلودہ پانی کے پائپ سے ہمارے فش فارم کو بھی مستقل خطرہ ہے۔ یا تو آپ کنکریٹ کا پائپ ڈلوا لیں یا پھر پائپ کا راستا بدل دیں۔"

"تیرے منہ میں تو وہی زبان ہے جو تیرے باپ کی ہے۔" بڑے میاں نے طیش آمیز تلخی سے کہا۔ "وہ مینجر کے کان بھرتا رہتا ہے۔"

"یہ محض کسی فرد واحد کا نقصان نہیں ہے۔ پورے علاقے کو اس گندے پانی سے خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ میرے باپ نے آواز بلند کی ہے تو اس میں سبھی کا بھلا ہے۔" میری آواز غیر ارادی طور پر بلند ہو گئی۔

میں نے اپنے عقب میں رائفل مین کو حرکت کرتے دیکھا۔ اگلے لمحے رائفل کی سرد نال میری گردن سے آ لگی۔

"اوئے آواز نیچی رکھ۔" رائفل بردار نے درشت انداز میں کہتے ہوئے ٹہوکا دیا۔

مجھے لگا جیسے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ سبھی اندیشے اور مصلحتیں کہیں دور جا سوئی تھیں۔ بے عزتی کا شدید احساس ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔

میں نے رائفل کی نال پر ہاتھ ڈالا اور ایک زور دار جھٹکا دیا۔ رائفل بردار کو شاید اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ میرے کندھے کے اوپر سے بڑے میاں کے قدموں میں جا گرا۔

رائفل میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ اس کا ٹھنڈا فولادی لمس میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ یہ سارا کچھ ایک لمحے میں ہو گیا تھا۔ بڑے میاں بھی ششدر رہ گیا تھا۔ اس کے کھلے منہ سے جھانکتا سونے کا دانت واضح نظر آ رہا تھا۔

سب سے پہلے نہتے رائفل مین کو ہوش آیا۔ بڑے میاں کے سامنے ہونے والی اس رسوائی کے سبب اس کا چہرہ مسخ سا ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی نامی گرامی ہستی تھی۔ جسے ایک لڑکے نے بری طرح اچھال دیا تھا۔

رائفل کو ابھی تک میں نے نال کی طرف سے ہی پکڑ رکھا تھا۔ درحقیقت مجھے سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس لمحے سے رائفل مین نے فائدہ اٹھایا۔ ایک بھڑک کے ساتھ وہ مجھ پر جھپٹا رائفل پر ہاتھ ڈالتے ہی اس کے سر کی زوردار ٹکر میرے سینے پر لگی۔ رائفل چھوٹ گئی اور میں الٹ کر گرا۔

اس کے ساتھ ہی میرے دماغ پر سرخ سی دھند نے یلغار کر دی۔ اٹھتے ہی میں کھڑا ہو گیا سینے میں درد کے گولے پھٹ رہے تھے مگر طیش درد پر حاوی تھا۔ رائفل بردار نے رائفل کو نال سے پکڑ کر گھمایا۔ نشانہ میرے سر کا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر وار خالی کیا۔ اسی وقت کئی افراد بھرا مار کر گھس آئے۔ میں

نے بھرپور مزاحمت کی۔ مگر انہوں نے مجھے جکڑ کر بے بس کردیا۔ اس کشمکش کے درمیان کمرے کا حشر نشر ہوگیا تھا۔ بچا تھا تو محض بڑے میاں کا تخت جس پر وہ دانت بھینچے بت بنا بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں طیش کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔

میری حالت بھی زیادہ بہتر نہیں تھی۔ قمیص کا نام و نشان نہیں تھا۔ بنیان پھٹ چکی تھی۔ چہرے پر چوٹوں کے متعدد نشان تھے اور منہ میں خون کا ذائقہ گھلا ہوا تھا۔

میری مزاحمت کے دم توڑتے ہی بڑے میاں کھڑا ہوگیا تھا۔ مستحکم قدموں سے چلتا ہوا وہ میرے قریب آیا اور زہر خند انداز میں بولا۔ ”میرے ڈیرے پر چلا آیا ہے۔ اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ آواز نیچی رکھنا اور نظر بھی۔“ اس نے زور لگا کر میرا سر جھکانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے سر نہیں جھکایا۔ اس کے گرگروں نے زور لگا کر میرا سر جھکایا۔

”کہہ دینا اپنے باپ اور اس کے حمایتی سے پائپ بھی وہیں رہے گا اور فیکٹری کا پانی بھی نہر میں جائے گا۔ جس نے جو اکھاڑنا ہے بیگھے ملوں کا اکھاڑ لے۔“

”میاں تو نے بات کو خواہ مخواہ بڑھایا ہے۔“ میں نے بغیر کسی لحاظ کے کہا۔ ”ظلم و زیادتی کے دن تھوڑے ہوتے ہیں۔“

بڑے میاں نے حقارت بھری نظر مجھ ڈالی اور اپنے گرگروں سے کہا۔ مجھے ڈیرے کے باہر چھوڑ دیا جائے۔ میں ڈیرے سے نکلا تو جسمانی چوٹوں سے زیادہ ہونے والی بے عزتی سے چور تھا۔

چند قدم ہی چلا تھا کہ سامنے سے والد صاحب چند دیگر افراد کے ساتھ آتے نظر آئے۔ قدموں میں تیزی اور چہرے پر موجود تشویش سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے مجھے بیگھے ملوں کے ڈیرے میں داخل ہوتا دیکھ کر انہیں اطلاع کردی تھی۔

مجھے پہچانتے ہی ان کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ مجھے بانہوں میں تھامتے ہی انہوں نے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا پتر؟ کس نے مارا ہے تجھے؟“ ان کی آواز میں طیش کروٹ لینے لگا۔ دوسرے افراد نے بھی مجھے ڈھانپ لیا۔ ان میں نگہت کا منگیتر صابر بھی تھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”ایک مسئلہ سلجھانے لگا تھا۔ مگر وہ مزید الجھ گیا ہے۔ اسی چکر میں یہ حالی ہوا ہے۔“

صابر نے جوش بھرے انداز میں کہا۔ ”یہ بیگھے ملوں کا کام ہے۔ اب ان کا حوصلہ بڑھ گیا ہے جٹوں کے منڈے پر ہاتھ اٹھا کر انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اب جواب دینا ضروری ہوگیا ہے۔“

دیگر افراد نے بھی ہاں میں ہاں ملائی فوراً ہی دنگے فساد کا ماحول بن گیا۔

”مگر ہوا کیا ہے؟ تو کیا کرنے گیا تھا بیگھے ملوں کے ڈیرے پر؟“ والد صاحب نے پوچھا۔

میں نے مختصراً انہیں تفصیل بتائی۔ جسے سن کر میری برادری کے نوجوانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس دوران برادری کے کچھ اور لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔

والد صاحب نے فطری فہم و فراست سے کام لے کر جذباتی نوجوانوں کو قابو میں کیا۔ بیگھے ملوں کے ساتھ ہونے والے کسی فوری تصادم کا نتیجہ سراسر بیگھے ملوں کے حق میں نکلتا۔

اپنی برادری کے درجنوں مردوں کے علاوہ ان کے پاس کرائے کے ٹٹوؤں کی بھی مختصر سی فوج تھی۔ کئی نامی گرامی اشتہاری اور مفرور ڈکیت و قاتل ان

کے محفوظ ڈھیروں پر پناہ لیے رہتے تھے۔ جنہیں وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بظاہر پولیس اور انتظامیہ کے ساتھ بھی ان کا گٹھ جوڑ بنا ہوا تھا۔

اگر ہوش کے بجائے جوش سے کام لے کر یہ جذباتی نوجوان ڈیرے پر ہلہ بول دیتے تو رائفل برداروں کا کہاں سامنا کرسکتے۔ اپنا نقصان کروانے کے ساتھ ساتھ جارح کی حیثیت سے پولیس کے جوتے بھی کھاتے۔

میرا اپنا دماغ آگ پر دھری ہانڈی کی مانند کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا رائفل لے کر بیگھے ملوں کے ڈیرے میں گھس جاؤں۔ سب کو مار دوں یا خود مر جاؤں۔ مگر ناتوانی اور بے بسی کا احساس کچوکے لگا رہا تھا۔

والد صاحب سبھی کو سمجھا بجھا کر وہاں سے لے آئے۔ میری حالت دیکھتے ہی ماں نے کلیجہ تھام لیا۔ نگہت رونے لگی۔

صابر فوراً موٹر سائیکل پر جا کر ڈاکٹر کو لے آیا تھا تو وہ ڈسپنسر مگر کہلاتا ”ڈاکٹر صاحب“ تھا۔ والد صاحب نے فوراً کپڑے تبدیل کیے اور گھر سے نکل گئے۔

☆☆☆

اچانک میری نظریں ایک گھڑ سوار پر پڑی۔ ماضی سے حال کا سفر میں نے لمحے بھر میں طے کرلیا۔ کولٹ خود بخود میرے ہاتھ میں آ گیا۔ گھڑ سوار کا انداز مشکوک تھا۔ وہ گھوڑے کو دبے قدموں چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں اس کے ہاتھ میں رائفل کا ہیولہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک میری تمام تر حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں یہ ایک درجن سے زائد گھڑ سوار تھے۔ جو بڑی خاموشی کے ساتھ ہمارے پڑاؤ کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں بڑی آہستگی سے پتھر پر لیٹ گیا۔ اس بلند پتھر سے مجھے اپنا پڑاؤ اور اس کا گرد و نواح واضح نظر آ رہا تھا۔

مشکوک گھڑ سوار اب گھوڑوں سے اتر آئے تھے اور پتھروں کی آڑ لے کر پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ آڑ اور احتیاط کے سبب وہ ابھی تک پڑاؤ کے چوکس پہرے داروں کی نظروں میں نہیں آئے تھے۔ میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے من پسند کھیل کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔

مزید خاموش رہنے کا مطلب یہ تھا کہ گھڑ سوار اچانک ہلہ بول کر ابتدائی کامیابی حاصل کرلیتے۔ مجھے شدت سے رائفل کی کمی کا احساس ہوا۔ اگر میرے پاس اس وقت خود کار رائفل ہوتی تو میں کم از کم دو افراد کو ضرور گرا لیتا۔ بہر حال میرا کولٹ کم از کم پڑاؤ والوں کو ہوشیار تو ضرور کرسکتا تھا۔

رینج میں نہ ہونے کے باوجود میں نے جیو لے پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور فوراً ہی پتھر سے نیچے کود گیا۔ ایک مزید ہوائی فائر بھی میں نے کردیا۔

ان دو فائروں نے پرسکون رات کا سکوت درہم برہم کردیا۔ محض چند لمحوں کے وقفے سے فضا فائرنگ کی بھیانک آوازوں سے گونجنے لگی۔ ایک فل میگزین برسٹ اس پتھر پر مینہ کی مانند برسا جہاں سے میں نے فائرنگ کی تھی کئی پتھر ٹوٹ کر مجھ پر گرے تھے۔

مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ زبردست گھن گرج والی خوف ناک ایم جی تھی۔ یعنی حملہ آور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھے۔

پڑاؤ کی جانب سے پہلے بھٹکتے بھوتکے پھر ہوائی فائرنگ ہوئی جو چند لمحوں بعد دو طرفہ فائرنگ میں

تبدیل ہوگئی۔ خاموش رات تیزی سے چھوٹے سے میدان جنگ میں تبدیل ہوگئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ میرے کولٹ ریوالور سے نکلنے والی گولیوں کی مخصوص سیٹی جیسی آواز پڑاؤ کے اسلحہ شناسوں نے پہچان لی تھی۔ گل ریز سمیت کئی افراد میرے پاس کولٹ کی موجودگی سے آگاہ تھے۔ دونوں طرف سے فائرنگ پوری شدت سے ہو رہی تھی۔ نباتات کی مہک پر بارود کی منحوس بو غالب آتی جا رہی تھی۔

میں نے آڑے لے کر پڑاؤ کا رخ کیا۔ میں جانتا تھا کہ گل ریز میرے لیے فکر مند ہوگا۔

جتنی تیزی سے فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے رک بھی گئی۔ اندھا دھند فائرنگ کے بعد یقیناً دونوں طرف گولیاں محفوظ رکھنے کا خیال غالب آ گیا تھا۔

اچانک ہونے والی خاموشی غیر فطری اور اعصاب پر بوجھ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ فائرنگ کے شور میں، میں محفوظ طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کسی قسم کی آہٹ پیدا نہ کرنے کے خیال سے میں ایک پتھر کی اوٹ میں دبک گیا۔ جا بجا بکھرے ہوئے بڑے بڑے پتھروں نے دونوں فریقوں کو محفوظ قدرتی پناہ گاہیں فراہم کر دی تھیں۔

میری تمام تر حسیات بے دار ہو چکی تھیں۔ میں گرد و پیش سے چوکنا تھا۔ ایک بار پھر میں نے آہستگی کے ساتھ اپنا سفر شروع کر دیا۔

فضا کا سکوت ایک دفعہ پھر درہم برہم ہوا۔ ایک مختصر سے برسٹ نے پھر اس جگہ کی خبر لی جہاں سے میں نے فائرنگ کی ابتدا کی تھی۔ پڑاؤ کی طرف سے البتہ خاموشی رہی۔

برسٹ کے بعد ایک بھاری سی مردانہ آواز نے پشتو میں کہا۔ ''اوئے خنزیر کے بچے! کہیں مر تو نہیں گیا؟ پیٹھ پر وار کرتا ہے۔ ایم جی سامنے تو......!'' اس نے ناقابل اشاعت اور اشتعال انگیز الفاظ ادا کیے۔

خون میں کھولن ہوئی، مگر میں اب خود پر قابو رکھنا سیکھ گیا تھا۔ میری چلائی گولیاں رائگاں نہیں گئی تھیں۔ ضرور انہوں نے کسی کا مزاج پوچھا تھا۔ اسی سبب وہ گند اگل رہا تھے۔ مجھے اشتعال دلانے کی بڑی عیارانہ حکمت عملی تھی۔ اندھیرے میں رائفل کی نال سے نکلنے والی چنگاریوں سے پوزیشن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ مجھے اشتعال دلا رہے تھے کہ میں فائرنگ کروں اور انہیں میری پوزیشن کا اندازہ ہو۔

ایک دفعہ پھر کئی رائفلیں گرجیں اور میرے ارد گرد چنگاریاں سی اڑ گئیں۔ یہ اندازے سے کی جانے والی فائرنگ تھی۔

اس دفعہ پھر پڑاؤ کی جانب سے زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ نالے کی طرف ہونے والی فائرنگ سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ فائرنگ کا ہدف کون ہے اور یہ بھی ممکن تھا للکارا بھی انہوں نے سنی ہو۔

میرے سفر میں تیزی آ گئی۔ اچانک میں نے ایک پتھر کی اوٹ سے برق رفتار شعلے پڑاؤ کی جانب اڑتے دیکھے۔ یقیناً پتھر کی اوٹ میں کوئی دشمن جاں موجود تھا۔

انگلیوں میں مخصوص اینٹھن جاگ اٹھی۔ میں نے رخ تھوڑا سا تبدیل کر لیا۔ فائرنگ کا شور مجھے کور فراہم کر رہا تھا۔

آخری چند گز میں نے رینگ کے طے کیے۔ وہ ایک قوی ہیکل شخص تھا۔ پتھر کے عقب میں وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے بیٹھا تھا۔ خود کار رائفل اس نے پتھر کے اوپر لٹکائی ہوئی تھی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو چھوٹے چھوٹے برسٹ فائر کیے۔ میں چاہتا تو بڑی آسانی کے ساتھ عقب سے اس کی کھوپڑی میں فائر اتار سکتا تھا۔ مگر میرے اندر بستا، میرا ہمزاد جسے دنیا ''کمارا جٹ'' کہتی تھی کروٹیں لے کر بے دار ہو چکا تھا۔

میں نے ایک جست بھری اور اس قوی ہیکل رائفل بردار پر جا پڑا۔ ہوا ہی میں، میں نے اسے کمر سے تھام کر اچھالا تھا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی اور اس اچانک پڑنے والی افتاد کے سبب وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس بوکھلاہٹ کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کے سینے پر سوار ہو کر میں نے یکے بعد دیگرے دو گھونسے اسے جڑ دیے۔

سنبھلتے ہی اس نے مجھے خود سے جھٹک دیا۔ چند لمحے بعد ہم دونوں آمنے سامنے تھے۔ وہ قوی ہیکل اور درمیانے قد کا سرتا پا قبائلی نظر آتا تھا۔ گلے میں گولیوں کے ہار اور چہرے پر منڈا سا مارا ہوا۔ اچانک میں چونکا۔ میرے سامنے ایک سو فیصد ڈاکو کھڑا ہوا تھا۔ جس کی گدلی آنکھوں میں میرے خون کی طلب تھی۔

ایک گالی کے ساتھ وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ انداز ایسا تھا جیسے مجھے بازوؤں میں بھر کر پیس دے گا۔ میں نے ایک جچی تلی پاؤں کی ضرب اس کے سینے پر ماری۔ یہ طاقت سے زیادہ توازن اور ٹائمنگ کا کھیل تھا۔ وہ جتنی تیزی سے میری طرف آیا تھا اتنی تیزی سے ہوا میں اچھل کر پشت کے بل ایک پتھر پر گرا۔

میرے پاس کھیلنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ قریب و جوار میں اس کے دیگر ساتھی موجود تھے۔ جو اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر جیسے بجلی سی چمکی۔ اس کم بخت نے نا جانے کہاں سے ایک فٹ لمبا چھرا نکال لیا تھا اور اسے سرعت سے گھمایا بھی تھا۔

بالکل آخری لمحے پر میں نے پہلو بدلا تھا۔ دھاتی لکیر تقریباً میرے سینے کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ میں نے فوراً ہی چھرا بردار کو بغل میں داب کر کہنی کی بھرپور ضرب مدمقابل کی کھوپڑی پر لگائی۔ یہ ضرب آزمودہ تھی اور خچر کو بھی لٹا سکتی تھی۔ مدمقابل کے حلق سے بے معنی سی آواز نکلی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ پٹ سے میرے قدموں میں گرا۔ چھرا پہلے ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

اچانک ایک آہٹ ابھری میں تیزی سے پلٹا ایک طویل القامت سایہ مجھ پر جھپٹ چکا تھا۔ اس کا راؤنڈ پنچ کے انداز میں گھونسہ میری تھوڑی کے نیچے پڑا اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ میرے قدموں نے زمین چھوڑ دی تھی۔ میں اچھل کر سنگلاخ زمین پر پشت کے بل گرا تھا۔

میں نے اپنی دھواں دھار زندگی میں بلاشبہ سیکڑوں لڑائیاں لڑی تھیں مگر ایسا بہت کم ہوا تھا کہ کسی نے ایک ہی ضرب میں مجھے خاک چٹا دی ہو۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اچانک ہی میں نے رائفل کے ''کاک'' ہونے کی مخصوص آواز سنی سیاہ فولادی نال میرے سینے کی طرف اٹھی۔ یہ بڑا بے بسی کا لمحہ تھا۔ میں نے فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اپنے بالکل قریب سنی۔

طویل القامت سایہ جس کے ہاتھ میں دبی خود کار رائفل کھلونے کی مانند نظر آ رہی تھی دو قدم بڑھا کر میری سمت آیا۔ پشتو کے ایک بدکلامی کے زمرے میں آنے والے جملے کے ساتھ اس نے کہا۔

''خود کو رستم زماں سمجھتا ہے...... اٹھ...... تیس سیکنڈ میں تجھے ٹانگوں سے پکڑ کر چیر نہ دیا تو اپنے ہاتھ سے گردن کاٹ لوں گا۔'' ساتھ ہی اس کی رائفل جھک گئی۔

میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ مدمقابل نے دیکھا ہے کہ میں نے اس کے ساتھی کو گولی مارنے کی بجائے ہاتھ سے زیر کیا ہے۔

فائرنگ کا شور بڑھ گیا تھا۔ پتھروں پر گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ میرا طاقتور حریف مجھ سے چند میٹر کے فاصلے پر ٹانگیں چوڑی کیے مجھے دعوت مبارزت دے رہا تھا بلاشبہ یہ ایک دلیر شخص کا دلیرانہ اقدام تھا۔ ورنہ اس نے نا صرف مجھے ایک ہی ضرب میں خاک چٹوائی تھی بلکہ میں اس کی رائفل کے بھی نشانے پر تھا۔ اس کے وزنی ہاتھ کی ضرب کا ارتعاش ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ درد کی لہر تھی جو جبڑا ہلنے بھی نہیں دے رہی تھی۔ اگر ضرب کی شدت تھوڑی زیادہ ہوتی تو یقینی طور پر جبڑا ٹوٹ چکا ہوتا۔

جبڑا سہلاتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا خجالت آمیز طیش نے یلغار کر دی تھی۔ میں نے گزارے لائق پشتو میں کہا۔ ''میں دوسرا موقع بھی تجھے دوں گا۔''

اسی لمحے سیٹی جیسی آواز کے ساتھ ایک اندھی گولی حریف کے سر کے قریب ایک پتھر سے ٹکرائی وہ بے اختیار جھکا۔ درمیانی فاصلہ کم ہوتا ورنہ راؤنڈ پنچ کا جواب اس سے بھی زیادہ شاندار طریقے سے دیا جا سکتا تھا۔ میرا جسم محض اضطراری جھٹکا لے کر رہ گیا تھا۔

جھکتے ساتھ ہی حریف نے رائفل کا رخ دوبارہ میری طرف کر دیا تھا۔ وہ ایک چوکس شخص تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دو نئے زاویوں سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔ یہ قدرے بلندی سے ہونے والی فائرنگ تھی۔ میں نے ایک درد میں ڈوبی چیخ سنی۔ اپنا سر بھی مجھے جھکانا پڑا تھا۔ ساتھ ہی میں نے ایک بڑا پتھر تاڑ لیا۔ ایک لمحہ مجھے مل جاتا تو میں اس پتھر کے پیچھے ہوتا۔ کولٹ کا ٹھنڈا لوہا اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ کولٹ ہاتھ میں آتے ہی میں ایک دو جانیں لے سکتا تھا۔

حریف نے وحشت میں ڈوبی آواز میں مجھے گھٹنوں پر جھکنے کا حکم دیا۔ میں نے تعمیل کی۔ اس کی وحشت صاف کہہ رہی تھی کہ اسے میری لمحاتی تاخیر بھی گوارا نہیں۔ مجھ پر میگزین خالی کرنے میں وہ لمحہ بھی نہیں لگائے گا۔

حریف نے ایک پتھر کی اوٹ لے لی۔ اس کی رائفل بدستور میری طرف اٹھی تھی۔ اس نے مجھے بے حرکت رہنے کا نیا حکم دیا اور زور سے اپنے جابر نامی کسی ساتھی کو آواز دی۔ حملہ آور جو میرے قیاس کے مطابق ڈاکو تھے۔ ان میں اس کی کیفیت نمایاں تھی۔ میری مداخلت کی وجہ سے ان کا اچانک شب خون کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میرے کیمپ والے سنبھل گئے تھے اور بہترین پوزیشن سنبھال چکے تھے۔

میں نے جو پتھر تاڑا تھا۔ اسی کے پیچھے سے ایک اور ڈھاٹا پوش برآمد ہوا۔ ''جی سردار!'' اس نے مودب انداز میں میرے حریف کو مخاطب کیا۔

میں پہلی دفعہ چونکا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں میں نے پہلی دفعہ اپنے حریف کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا نہیں تھا مگر نقوش اندھیرے نے چھپا لیے تھے۔ وہ طویل القامت اور چوڑا چکلا تھا۔ نمایاں لمبے اور گھنے بال تھے جو چہرے کے اطراف پھیلے تھے۔ ملگجے اندھیرے میں وہ گوریلے کی مانند نظر

آ رہا تھا۔

سردار نے جابر کو مجھے باندھنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ مقامی نہیں ہے اسے ساتھ لے چلو۔'' جابر فوراً میرے عقب میں آیا۔ میرے رگ وپٹھے تنے تھے۔ رائفل کی نال میرے سینے کی طرف اٹھی تھی۔ مجھے محض ایک لمحہ درکار تھا۔ اگر یہ ''لمحہ'' مل جاتا تو میں بازی پلٹ سکتا تھا۔

غفلت کا ایسا کوئی لمحہ آنے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ اٹھے۔ میں منہ کے بل پتھریلی زمین پر گرا تھا۔ کم بخت جابر نے رائفل کا بٹ میری گدی پر آزمایا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی، دوسری ضرب میرے سر پر لگی۔ شدید درد اور تاریکی نے یکلخت یلغار کی۔ قوت برداشت کا دامن ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اپنے تئیں میں تیزی سے گھوما تھا۔ درحقیقت یہ سلوموشن جیسی حرکت تھی۔

میں نے جابر کی آنکھوں میں اپنے لیے تحیر دیکھا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ دو قیامت خیز ضربیں کھانے کے بعد بھی میں نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ اس کے سامنے بھی تھا۔

تیسری ضرب میری پیشانی پر لگی۔ میں پشت کے بل گرا۔ زمین جیسے پھرکی کی مانند گھومی۔ ہوش سے بیگانہ ہوتے ہوئے میں نے سردار کی آواز سنی۔ جو اپنے ساتھیوں کو وہاں سے نکلنے کا کہہ رہا تھا۔ ڈاکوؤں کا شب خون ناکام رہا تھا۔

❀......❀......❀

نہ جانے کس وقت میں ہوش میں واپس آیا تھا۔ تاریکی میں صرف یہ احساس ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور مجھے کسی چوپائے پر پیٹ کے بل ڈالا گیا ہے۔

جی بری طرح متلایا اور ایک اور زلزلے جیسی کیفیت کے حامل چکر نے مجھے دوبارہ ہوش سے بیگانہ کر دیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو مجھے اپنے نیچے کھردرے بستر کا احساس ہوا۔ پورا جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا اور سر کی جگہ محسوس ہوتا تھا جیسے منوں وزنی پتھر رکھا ہے۔ سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ البتہ آزاد تھے۔

میں نے سر کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ شدید درد کی لہر نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔

کچھ دیر بے حرکت رہ کر میں نے چند طویل سانس لیے۔ حواس مزید بیدار ہوئے۔ میرے اطراف ملگجا سا اندھیرا تھا۔ یقیناً قریب ہی کہیں دیا یا کیروسین لیمپ روشن تھا۔ میرے نیچے کوندر کے خشک پتوں کا بستر تھا۔ کوندر...... ان علاقوں میں عام پایا جانے والا پودا تھا جس کے پتے موٹے، چمکیلے اور خاصے لمبے ہوتے ہیں۔ میری حس شامہ ان پتوں کی مخصوص خوشبو سے آشنا تھی۔

اپنے پیروں کے قریب مجھے کسی کپڑے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے پیروں کی مدد سے اسے کھینچ لیا۔ یہ ایک بدبودار پٹ سن کا کمبل تھا ایسے کمبل جیل میں قیدیوں کو اوڑھنے کے لیے دیئے جاتے ہیں۔

میں نے غنیمت جانتے ہوئے اس کمبل کو سینے تک اوڑھ لیا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے سر کو حرکت دینے پر قادر ہو گیا تھا۔ میں نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا جہاں سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہاں انڈے کے سائز کا گومڑ نمودار ہو چکا تھا۔ سر کے عقبی نچلے حصے پر ہاتھ پھیرنے سے اندازہ ہوا کہ یہاں سے خون نکلا تھا۔ جو اب بند ہو چکا تھا البتہ گردن اور کان کے قریب خشک ہو کر جم چکا تھا۔

اتنی دیر میں میری آنکھیں ملگجے اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے اطراف پر نظر ڈالی۔ یہ اندازاً پندرہ ضرب آٹھ فٹ کا کمرہ تھا۔ میں چونکا' یہاں کوئی اور بھی موجود تھا۔ بلکہ یہ دو افراد تھے جو کمبل لپیٹے یقیناً نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایک طرف لوہے کی موٹی سلاخوں والا دروازہ تھا۔ جس کے دوسری طرف راہداری کی کچی دیوار پر ایک کیروسین لیمپ کیل کے سہارے ٹنگا تھا۔ جس کی روشنی اس قید خانے میں بھی آ رہی تھی۔

ایک کونے میں تین' چار فٹ اونچی مٹی کی دیوار تھی۔ جو یقیناً اس قید خانے کا واش روم تھا۔ اس دیوار کے قریب ہی مٹی کا ایک مٹکا رکھا ہوا تھا جس پر پلاسٹک کا گلاس اوندھا رکھا تھا۔

پانی دیکھ کر مجھے پیاس کا احساس ہوا۔ میں نے اپنا "عالیشان بستر" چھوڑا اور سر میں ہوتے درد کے دھماکوں کو دباتا ہوا پانی کی طرف بڑھا۔ میرے قدموں میں خفیف سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

یخ ٹھنڈے پانی نے جسم میں کپکپاہٹ سی دوڑا دی۔ مگر پین کلر کا کام بھی دیا۔ ساتھ ہی مجھے اپنی توانائیاں لوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے' اسی وقت کہیں قریب سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر موذن کسی اونچی جگہ پر کھڑا فلاح کی طرف لوگوں کو بلا رہا تھا۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ یہ فجر کی اذان تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سحر ہونے میں کچھ ہی دیر ہے۔

اذان کا اختتام ہوتے ہی میں اٹھا اور مستحکم قدموں سے چلتا ہوا سلاخوں والے داخلی دروازے کے قریب چلا گیا۔ راہداری کا منظر مزید نمایاں ہو گیا۔ راہداری میں کسی انسان کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے بلند آواز اور پشتو میں کہا۔

"کوئی ہے؟" میری آواز کی بازگشت ابھری مگر جواب ندارد۔

میں نے پھر آواز دی۔ کوئی ردعمل سامنے نا آیا تو میں نے زور سے لوہے کی سلاخوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "کوئی کتے کا جنا میری آواز سن رہا ہے؟"

اپنے عقب سے ایک ڈری ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اوئے...... اپنی جان کے دشمن چپ کر کے بیٹھ جا۔ کیوں اپنی موت کو للکار رہا ہے۔"

میں نے سر گھمایا۔ میرے سامنے دو بے حد ہراساں چہرے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا بالکل گول چہرہ تھا۔ جس پر کئی دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی۔ مجھے خبردار کرنے والا یہی تھا۔

دوسرا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ شکل وصحت سے وہ مجھے اپر پنجاب کا لگا۔ اس کی پھٹی ویران آنکھوں میں میرے لیے بڑی خوف آمیز حیرت تھی۔

میرے جواب دینے سے پہلے راہداری میں تیز قدموں کی چاپ ابھری۔ یہ تیزی یقیناً میری بدکلامی کے سبب تھی۔

میں نے رخ راہداری کی طرف کر لیا۔ اگلے ہی لمحے ایک جھاڑ جھنکار داڑھی' مونچھوں والا پستہ قد قبائلی میرے سامنے تھا۔ چرس کے زوردار سوٹوں کے سبب اس کی آنکھیں خون کبوتر کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ اپنے قد کے برابر اس نے دیسی ساختہ وزنی رائفل بمشکل اٹھا رکھی تھی۔ چہرے کے نقوش کو طیش اور حیرت کے ملے جلے تاثرات نے عجیب سا روپ دیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر میری حس مزاح پھڑکی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا۔

"تجھے دیکھ کر معلوم ہوا ہے کہ یہاں رشین نسل

کے کتے بھی پائے جاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی' وزنی رائفل اس نے حیرت انگیز پھرتی سے میری طرف سیدھی کی۔ اپنے عقب میں' میں نے ایک ہذیانی چیخ سنی۔

مجھے جو لمحہ چاہیے تھا وہ مل گیا تھا۔ سلاخوں کا درمیانی خلا اچھا خاصا تھا۔ میں نے اپنی دسترس میں آنے والی رائفل کی نال پر ہاتھ ڈالتے ہی زوردار جھٹکا دیا۔ یہ لمحے کا گیم تھا۔ مدمقابل کو پتا بھی نہیں چلا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ رائفل کوٹھری کے اندر تھی۔ مدمقابل کی پشت سلاخوں کے ساتھ لگی تھی۔ میرا ایک بازو کوڑیالے سانپ کی مانند اس کی گردن کے گرد لپٹا تھا اور آستین میں چھپا بلیڈ کی مانند باریک فولادی خنجر نہ صرف میرے ہاتھ میں تھا بلکہ میں مدمقابل کی آنکھوں کے سامنے لہرا بھی رہا تھا۔

"کوٹھری کی چابی تیرے پاس ہے نا؟" سانپ جیسی تیز تر حرکت کے ساتھ ہی میرے لہجے میں وہ جادو بھی نمودار ہو چکا تھا جو مدمقابل کو میرا بے دام غلام بنا دیتا تھا۔ یہ کسی پیشہ ور صداکار کا لہجہ نہیں تھا۔ یہ خون کی ہولی کھیلنے والے "کمالے جٹ" کا لہجہ تھا جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھے موت کے تعاقب میں رہتا تھا اور جان لینے میں بھی ایک لحظہ نہیں لگاتا تھا۔ اپنے الفاظ کو فوری عملی جامہ پہنانے کی طاقت اس لہجے کو خاص طاقت دیتی تھی۔

مدمقابل کا چہرہ تو میرے سامنے نہیں تھا مگر میں جانتا تھا...... موت کی زردی اس کے چہرے پر اتر آئی ہے۔ "بول ورنہ کاٹ دوں گا۔"

اس نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"چابی نکال کر اندر پھینک...... اسے قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ میں راہداری کی طرف سے بھی چوکنا تھا۔ کسی دوسرے پہرے دار کی موجودگی عین ممکن تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ میری گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ مدمقابل کے حلق سے خرخراہٹ سی بلند ہو رہی تھی اور جسم آکسیجن کے لیے مچل رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن سے گرفت ڈھیلی کی۔ خرخراہٹ خفیف سی کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔

"نکال چابی" اس نے فوراً ہی اپنے لباس کی جیب میں سے چند چابیوں پر مشتمل گچھا نکال کر نیچے گرا دیا۔

مجھے اب کسی مددگار کی ضرورت تھی۔ میں نے سر گھمایا' میرے دونوں "روم میٹ" اٹھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ملگجے اندھیرے کے باوجود میں لڑکے کے جسم کی واضح تھرتھراہٹ دیکھ سکتا تھا۔ چہروں کے تاثرات اندھیرے میں چھپے تھے۔ قیاس یہی ہے کہ وہاں بھی خوف وہراس کے سائے تھے۔ میں نے پشتو میں زیادہ عمر والے کو آواز دی اور چابیاں اٹھا کر کوٹھری کا تالا کھولنے کے لیے کہا۔

اس نے بھی آواز میں جواب دیا۔ "کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی مروانا چاہتا ہے۔" اس کی آواز میں لرزش بڑھ گئی۔ "یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ کتوں سے تجھے چیروا دیں گے۔ اسے چھوڑ کر اسی کے پاؤں میں گر جا...... شاید تیری جان بچ جائے۔"

بزدلی کی ترغیب نے نفرت کی ایک تند لہر میرے وجود میں دوڑا دی۔ اسے کوئی سخت جواب دینے سے پہلے میں نے ایک مخصوص جھٹکے سے اپنی گرفت میں آئے پہرے دار کی گردن توڑ دی۔

گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

ادھیڑ عمر چلایا۔ "تو مرے گا اور ہمیں بھی مروائے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کبوتر کی مانند حالات

سے آنکھیں بند کرلیں اور کمبل اوڑھ لیا۔ لڑکے نے بھی اس کی تقلید کی۔

”بزدل لوگ اپنی زندگی میں ہزاروں دفعہ مرتے ہیں' حالانکہ موت صرف ایک دفعہ آتی ہے۔“ میرے لہجے میں ان دونوں کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ میرے وجود میں چھپا آتش فشاں کروٹ لے کر بیدار ہو چکا تھا۔

میرے بازو کی گرفت میں پہرے دار نزاعی جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا۔ وزنی لباس کی وجہ سے اس کے گرنے کی زیادہ آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔

چابیوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑا نجی جیل خانہ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہاں ایک' دو ہی کوٹھڑیاں ہوں۔ اس لیے یہاں پہرے دار بھی ایک آدھ ہی تھا۔ اگر کوئی اور تھا بھی تو غالباً نیند کے غلبے میں تھا۔

وزنی رائفل کندھے سے لٹکا کر میں چند لحظوں میں کوٹھری سے باہر تھا۔ باہر نکلتے ہی میں نے رائفل سیدھی کر لی تھی اور اس کا سیفٹی لاک ہٹا دیا تھا۔ ”پانچ ڈزی“ کے نام سے معروف اس رائفل میں نائن ایم ایم کی پانچ گولیوں کا میگزین لگتا تھا۔ سنگل شارٹ باآسانی ریچھ کو بھی گرا سکتا تھا۔ فی الوقت میرا سامنا انسانوں سے تھا اور میں کسی کو بھی گرانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

یہ مختصر سی راہداری تھی جہاں صرف دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے ہی نکاسی کا بند دروازہ تھا۔ دروازے کے قریب اونی قالین بچھا تھا۔ جس پر قیمتی اور چمکتے ہوئے کورین کمبل میں لپٹا یقیناً دوسرا محافظ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس کی دیسی ساخت رائفل بھی دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے محوِ خواب محافظ کی رائفل اٹھائی تو اس کا دستہ قریب پڑے کھانے کے برتنوں سے ٹکرایا۔ محافظ کے جسم میں حرکت ہوئی اور نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔ ”خانہ خراب...... تو پھر چھوکرے کو نکال لایا ہے' اگلا فقرہ نہایت نازیبا تھا۔

غالباً میری کوٹھری والا نوعمر لڑکا...... ان دونوں محافظوں کی شیطانی دست برد کا مسلسل شکار تھا۔ ایک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا دوسرے کے لیے میرے دل میں بے رحمی شدت سے جاگ اٹھی تھی۔

میں نے رائفل دیوار کے سہارے کھڑی کی اور ایک جھٹکے سے اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔ اس اچانک افتاد سے بوکھلاہٹ کے عالم میں اس کے منہ سے پہلے بے معنی اور پھر گٹر ابل پڑا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ واضح طور پر وہ بھی چرس کے نشے میں غرق تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا' اس کے ساتھی نے مذاق کے طور پر اس کے اوپر سے کمبل کھینچا ہے۔

خون آشام خنجر دوبارہ میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ جلد کے ہم رنگ بے حد باریک غلاف میں چھپا یہ بلیڈ جیسا خنجر میری کلائی کا حصہ ہی لگتا تھا۔ خصوصی طور پر ٹٹولے بغیر اسے ڈھونڈنا خاصا مشکل تھا۔ مجھے یہاں لانے والوں کے گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ میری کلائی کے ساتھ ایسی کوئی چیز بندھی ہے' انہوں نے محض سرسری تلاشی لے کر میری جیبیں خالی کرنے پر توجہ مرکوز رکھی تھی۔

میں نے جست کی اور اس گھٹے ہوئے بدن کے قبائلی پر جا پڑا۔ میرے نتھنوں سے پسینے' نسوار اور چرس کی ملی جلی بو ٹکرائی۔

میں نے بازو موڑ کر کہنی کی جچی تلی ضرب اس کے جبڑے پر ماری۔ اس آزمودہ ضرب کا دوسرا فائدہ

تھا۔ نہ صرف وہ اپنے حواس میں آ گیا' بلکہ جبڑے پر ضرب لگنے کے سبب اس کے حلق سے زیادہ آواز بھی نہیں نکلی تھی۔

اس کا جسم پارے کی مانند مچلا۔ اس نے پوری قوت سے مجھے خود پر سے الٹنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے سینے پر سوار رہتے ہوئے ایک طوفانی گھونسا اس کے مضروب جبڑے پر جڑ دیا۔ اگلے چند لمحوں میں اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں کے نیچے دبے تھے اور خنجر کی باریک نوک اس کی گردن پر رکھی تھی۔ میرے ہاتھ کا معمولی دباؤ اس کی شہ رگ کاٹ سکتا تھا۔

گردن پر موت کی فولادی نوک محسوس کرتے ہی وہ بے حرکت ہو گیا تھا۔ اس کی گدلی نفرت انگیز آنکھوں میں موت کی زردی اتر آئی تھی۔ اس نے بمشکل کھڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”صولت کہاں ہے؟“

”تیری مراد اپنے شیطان ساتھی سے ہے تو وہ اس وقت خدا کے حضور اپنے گناہوں کا حساب دے رہا ہوگا۔“

”تو...... تو آزاد کیسے ہو گیا؟“ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں تھا۔ میں نے خنجر کی نوک دبائی۔ مضروب جگہ سے خون کا بڑا سا قطرہ نکل آیا۔ بے اختیار اس نے تکلیف بھری سسکی لی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ میرے لہجے میں وہی مخصوص درندگی در آئی تھی۔ جو مد مقابل کو مسحور کر دیتی تھی۔

”میرے قیدی“ پر خنجر کی نوک سے زیادہ اس لہجے نے اثر دکھایا۔ موت کی زردی میں ہراس کا رنگ بھی شامل ہو گیا۔ ”با...... گوٹ“ اس نے اٹک کر جواب دیا۔

میں چونکا۔ گل ریز نے بھی باگوٹ نامی بستی میں سرخ بھیڑیے کی آمد کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ مجھے یہیں پرندوں کے تاجر کے روپ میں آنا تھا۔ مگر تقدیر مجھے کسی اور روپ میں یہاں لے آئی تھی۔

”تم لوگ ڈاکو ہو نا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہیں...... سردار نور جان لایا ہے' وہ اور اس کے ساتھی ہمارے ملک نورا کے مہمان ہیں۔“

نور جان کے نام پر ذہن میں کچھ کھٹکنے لگا تھا۔ ”یہ نور جان کوئی ڈاکو ہے؟“

”ہاں...... قبائلی علاقوں کا سب سے بڑا ڈکیت“ اس کے لہجے نے جان پکڑی۔ ”تو نور جان کا قیدی ہے۔ تو بے شک بھاگ کر جہنم میں بھی چلا جا...... وہ تجھے وہاں سے بھی واپس کھینچ لائے گا۔“

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ وہ کس نور جان کا ذکر کر رہا ہے۔

”ساری دنیا اسے ”سرخ بھیڑیا“ کہتی ہے۔ وہ تجھے بھیڑیے کی طرح ہی چیر دے گا۔“

اچانک ہی وہ بجلی کی مانند تڑپا۔ اس کے دونوں گھٹنے بیک وقت اور پوری قوت سے میری کمر پر لگے تھے۔ میرے لیے یہ قطعی غیر متوقع حرکت تھی۔ میرا سر پوری قوت سے سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ تڑپ کر میرے نیچے سے نکل گیا۔ میرے خنجر نے اس کی گردن اور ٹھوڑی پر ایک طویل اور گہری سرخ لکیر ضرور چھوڑ دی تھی۔

اس کے ہاتھ داخلی دروازے کی کنڈی سے ٹکرائے تھے کہ میں نے لیٹے لیٹے اس کی ٹانگیں اپنی ٹانگوں میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

وہ زمین پر آ رہا۔ میں نے ٹانگوں کا زاویہ تبدیل

کر کے ایک بے رحم جھٹکا دیا۔ خاموشی میں پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح طور پر ابھری۔ وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپا مگر اس کے حلق سے صرف خرخراہٹ ابھری۔ میں ایک لحظے کے لیے اس کی قوت برداشت پر حیران ہوا' مگر اس کی گردن پر نظر پڑتے ہی یہ حیرانی دور ہوگئی۔ اس کی تھوڑی اور گردن سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا گردن پر لگنے والے گہرے کٹ نے کسی ایسی نس کو کاٹ دیا تھا جس کے سبب اس کے حلق سے ماسوائے خرخراہٹ کے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اپنے تئیں وہ زور زور سے چلا کر اپنے مددگاروں کو آوازیں دے رہا تھا۔

میں نے اطمینان محسوس کرتے ہی اس کی ٹانگوں پر سے گرفت ختم کردی۔ دیوار کے ساتھ سر ٹکرانے کی وجہ سے سر میں دھمک سی پیدا ہو رہی تھی اور گردن کے عقبی حصے کا مدھم پڑ جانے والا قیامت خیز درد دوبارہ جاگ اٹھا تھا۔

مدمقابل میرے لیے بیکار ہو چکا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے دبوچا تو اس کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس نے غالباً میری آنکھوں میں اپنی موت کا عکس دیکھ لیا تھا۔

خنجر کی ایک افقی لکیر نے لحظے سے بھی کم وقت میں اس کی گردن کاٹ دی۔ میں نے خنجر اس کے لباس سے صاف کر کے دوبارہ پوشیدہ کر لیا۔ اس کا جسم نزعی جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ جلد ہی شلوار کے نیفے میں اڑسے فولادی لمس نے میری توجہ کھینچ لی۔

یہ چائنا میڈ نائن ایم ایم تھا۔ اس کا وزن بتا رہا تھا کہ میگزین گولیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ میں نے بیلٹ میں اڑس لیا اور اپنے مقتولین کے بستر پر پڑی ایک گرم سیاہ چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

چادر لپیٹتے ہوئے میرا ہاتھ اپنی تھوڑی سے ٹکرایا تو درد کی لہر نے وہ قیامت خیز ضرب یاد دلا دی جس نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ ساتھ ہی وہ ضرب لگانے والا بھی یاد آیا۔ اچانک ہی دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ مجھے باندھنے والے ڈاکو نے اسے بڑے ادب سے "سردار" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ کہیں وہی تو سرخ بھیڑیا نہیں تھا؟

میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہی سرخ بھیڑیا تھا۔ ذہن میں کہانی کچھ یوں ترتیب پا رہی تھی کہ سرخ بھیڑیا اور اس کے ساتھی باگوٹ کی طرف آ رہے تھے کہ ہمارا کیمپ ان کی نظروں میں آ گیا۔ یہ "تر لقمہ" دیکھ کر وہ ہمارے کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ مگر میری مداخلت کے سبب یہ لقمہ ان کے حلق سے نہ اتر سکا۔ مال غنیمت کے طور پر وہ مجھے ساتھ لے آئے تھے۔

گل ریز یقیناً میرے لیے پریشان ہوگا۔ سب سے پہلے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا بے حد ضروری تھا اور یہ کام یہاں سے نکل کر ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے دیسی ساختہ رائفل تھامی اور بے حد آہستگی کے ساتھ داخلی دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازہ عقب میں' میں نے بند کر دیا تھا۔

میرا استقبال سرد ہوا اور تاریکی نے کیا۔ صبح کاذب کسی بھی وقت طلوع ہونے والی تھی۔ میں کچھ دیر وہیں دبکا رہا۔ میری آنکھیں قدرے اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے احتیاط سے گھوم کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ یہ ایک سات آٹھ فٹ اونچی کچی دیوار کا وسیع احاطہ تھا جس کے عین درمیان میں قید خانہ تھا۔ اس احاطے کا وسیع لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے یہ جاننے کی غرض سے دروازے کی دوسری جانب کوئی پہرے دار موجود ہے یا نہیں۔ دروازے پر کھڑکھڑاہٹ سی پیدا کی مگر جواب ندارد۔ میں نے رائفل کندھے سے لٹکائی۔ میرے پاس ٹائم کم تھا۔ اجالا ہوتے ہی میرے یہاں سے بحفاظت نکلنے کے چانسز کم ہو جاتے۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور باہر نکل آیا۔

ایک وسیع میدان میرے سامنے پھیلا تھا۔ جس کے دوسرے سرے پر حویلی کی پندرہ' سولہ فٹ اونچی فصیل میری منتظر تھی۔ جو ناقابل عبور تھی۔

میں بخوبی جانتا تھا کہ قبائلی سرداروں کی حویلیاں کسی قلعے سے کم نہیں ہوتیں۔ دور فصیل پر جلتی روشنی کسی برجی کا بھی پتا دے رہی تھی۔ میرے لیے زیادہ مناسب یہی تھا کہ کوئی کمیں گاہ ڈھونڈوں...... اور پھر یہاں سے نکلنے کی کوئی کوشش کی جائے۔

آسمان کے کنارے روشن ہوگئے تھے۔ اندھیرا ملگجا ہو گیا تھا۔ قید خانے میں میری کارروائی زیادہ دیر چھپی رہنے والی نہیں تھی۔

میں قید خانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگ کر محتاط انداز میں چلنے لگا۔ اچانک میرا پاؤں کسی جانور کے فضلے سے ٹکرایا اور ناگوار سی بو پھیل گئی۔

مقدار اور ہیئت سے یہ کسی رکھوالے کے کتے کا فضلہ نہیں لگتا تھا۔ رکھوالے کے کتوں کی موجودگی قرین قیاس تھی مگر وہ ناجانے کہاں تھے۔ اگر قرب وجوار میں ہوتے تو اب تک میری بو پا چکے ہوتے۔

اچانک میری تمام تر حسیات چونک گئیں۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ پھر گھورنے والا بھی نظر آ گیا۔ میرے جسم میں خوف آمیز سرسراہٹ دوڑ گئی۔ میدان کے وسط میں لکڑی کے بنچوں کا ایک ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ غالباً ان کی مدد سے کوئی اسٹیج وغیرہ بنایا جانے والا تھا۔ اسی ڈھیر کے قریب وہ پچھلے پیروں پر بیٹھا' چھاتی اٹھائے مجھے گھور رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ کچھ دیر پہلے میرا پاؤں کس جانور کے فضلے سے ٹکرایا تھا۔ وہ اٹھا اور دھپ دھپ کی آوازیں پیدا کرتا ہوا میری طرف آیا۔

وہ ایک شاندار اور دیوہیکل کالا ریچھ تھا۔ جو یقیناً تربیت یافتہ تھا اور اسے رکھوالی کی غرض سے رات کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

ایک دل دہلا دینے والی مہیب غراہٹ کے ساتھ اور ناقابل یقین تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ آخری لمحے پر میں صرف جھکائی ہی دے سکا تھا۔ حیوانی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی' جو پنجہ اس طاقتور جانور نے میری پسلیوں پر مارا تھا۔ جھکائی دینے کے سبب میرے بازو پر لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی گاڑی نے مجھے ٹکر ماری ہو۔ میں اڑتا ہوا پشت کے بل گرا۔ گردن کے عقبی حصے کا درد پوری قوت سے جاگا۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے سے ناچ گئے۔ جو اس ایک لمحے کے لیے معطل ہوئے' اگلے ہی پل میں نے خونخوار ریچھ کو اپنے اوپر دیکھا۔ اس کی خوفناک تھوتھنی میری گردن کی متلاشی تھی۔ رائفل میرے نیچے دب گئی تھی۔

اپنے مقتول سے حاصل کیا گیا نائن ایم ایم پر ریچھ کے پیٹ کا وزن تھا۔ وہ بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ ریچھ کے وزن کے سبب میری پسلیاں جیسے ٹوٹنے لگی تھیں۔ حیوانی بدبو میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی اور سانس جیسے سینے میں پھنس گیا تھا۔

ریچھ مجھے بھنبھوڑ رہا تھا۔ خدا جانے میری گردن کیسے اس کے بھیانک جبڑے سے محفوظ تھی۔ ریچھ کو یقیناً کتوں سے بھی لڑایا جاتا تھا۔ اسی لیے اس کے ناخن کاٹ دیئے گئے تھے۔ ورنہ اب تک وہ مجھے

ادھیڑ چکا ہوتا۔

گردن پر حملہ کرنے کی غرض سے ریچھ تھوڑا سا پیچھے ہوا۔ میرے سینے میں زندگی بخش ہوا اتری۔ ساتھ ہی احساس ہوا کہ جان بچانے کے لیے میرے پاس چند ہی لمحے ہیں۔

میں نے کلائی کو مخصوص جھٹکا دیا۔ وفادار ساتھی فوراً ہاتھ میں آ گیا۔

ریچھ جب پیچھے ہٹا تھا تو اس کے سینے کی فر میرے چہرے سے ٹکرائی تھی۔ میں جانتا تھا یہ ریچھ کے جسم کا سب سے نازک حصہ ہے۔ یہاں ایک کاری وار اسے گرا سکتا ہے۔ ریچھ نے میری گردن پر منہ مارا۔ میں نے گردن بچاتے ہوئے خنجر پوری قوت سے اس کے سینے میں اتار دیا۔ اس کا مہیب جبڑا میرے شانے کو دبوچ نا پایا تھا کہ خنجر اس کے نازک ترین حصے میں اتر گیا تھا۔

اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے خنجر پر گرفت برقرار رکھتے ہوئے خنجر کو افقی حرکت دی۔ خون کی موٹی دھار نے مجھے بھگو دیا تھا۔

ریچھ کے حلق سے تکلیف دہ غراہٹیں نکل رہی تھیں اور یہ خاصی بلند تھیں۔ کسی بھی لمحے کوئی اس طرف متوجہ بھی ہو سکتا تھا۔

ریچھ دھپ سے میرے پہلو میں گرا۔ خنجر کی افقی حرکت نے یقیناً اس کے دل کو چھید دیا تھا۔ ورنہ درندہ خنجر کی محض ایک ضرب سے اس طرح گرنے والا نہیں تھا۔

میں نے دور ہٹنے اور اٹھنے میں لحظہ بھی نہیں لگایا۔ دونوں شانوں اور گردن کے پیچھے جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ بے شک ریچھ کے ناخن کٹے ہوئے تھے مگر جتنے بھی تھے انہوں نے کھال ضرور چھیل دی تھی۔

ریچھ کے حلق سے خاصی بلند نزعی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اچانک ہی میں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ ایک سے زیادہ افراد دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔

میں نے جست بھری اور لکڑی کے بنچوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ دوڑتے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔

جست بھرتے ہوئے رائفل وہیں گر گئی تھی۔ نائن ایم ایم نکالنے میں میں نے لحظہ بھی نہیں لگایا۔ لکڑی کے بنچوں کا ڈھیر اچھا خاصا تھا مگر یہ مجھے زیادہ دیر پناہ نہیں دے سکتا تھا۔

سب سے پہلے مجھے یہیں پر ڈھونڈا جاتا اور بوگیر کتے تو لمحوں میں کھوج لیتے۔

صبح کا نورانی سا اجالا پھیل گیا تھا۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں ریچھ کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ سامنے ہی مجھے ایک اصطبل نما احاطے کا کھلا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ اندر گھوڑے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے بنچوں کی اوٹ میں اصطبل کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ آخری سرے پر پہنچتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔

کھلے میں آتے ہی مجھے دیکھ لیا گیا۔ پہلے ایک للکارا گونجی پھر مجھ پر فائرنگ ہوئی۔ دو مختلف ہتھیار گرجے تھے۔ ایک گولی میرے کان کے قریب سے سیٹی بجاتی گزری۔ میں نے زمین پر رول کیا اور اگلے ہی لمحے اصطبل کے کھلے دروازے سے اندر تھا۔

میری راہ میں پہلے آنے والا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ گھاس کا گٹھر پھینک کر وہ کسی بلا کی مانند مجھ سے لپٹ گیا۔ جوانی کے جوش و غضب میں اس نے ایک لحظہ کے لیے تو مجھے قدموں سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ میں نے نائن ایم ایم کا وزنی دستہ اس مزدور کے سر پر رسید

کیا۔ یہ درمیانہ ہاتھ تھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ میں نے گھٹنا اس کی ناف پر رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ وہ ایک لکڑی کی چارے سے بھری کھرلی میں گرا اور اسے الٹاتا ہوا چند گھوڑوں کے درمیان جا گرا۔

گھوڑوں میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

دوسرا حملہ آور ایک لحیم شحیم ادھیڑ عمر تھا۔ اس نے محض قبائلی شلوار کے اوپر میلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ مشقت کے سبب اس کا جسم اس سرد صبح میں بھی پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے ایک اشتعال انگیز گالی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے درانتی نما ہتھیار سے حملہ کیا۔ میں نے جھک کر سینے پر ہونے والا وار بچایا اور ایک معمولی سے دھکے سے اس کا توازن خراب کر دیا۔ وہ ایک گھوڑے کے پیٹ سے جا ٹکرایا۔

گھوڑوں کے درمیان گرنے والا نوجوان اٹھ چکا تھا اور کسی ہتھیار کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں اصطبل کے دروازے کے قریب پہنچ گئی تھیں اور ہر طرف سے جیسے للکارنے، مارو اور پکڑو کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے خود کو چوہے دان میں پھنستا محسوس کیا مگر یہ کیفیت اب میری پسندیدہ بھی ہو چکی تھی۔ جسم میں سنسنی آمیز گرماہٹ مجھے اس چوہے دان کو توڑنے پر اکسا رہی تھی۔ گرد و پیش کو جانچنے میں ایک لحظہ بھی نہیں لگا۔ میں نے ایک کھرلی کی منڈیر پر دونوں پاؤں جمائے، اگلے پل میں ایک گھوڑے پر کود چکا تھا۔ گھوڑے کی پشت کو میرے پاؤں نے چھو کر "تھرو" لی اور ہوا میں ایک جست بھر کر میں اصطبل کی کچی اور نیچی چھت پر تھا۔

اسی وقت کئی افراد بھرا مار کر اصطبل میں گھس آئے تھے۔ حیرت سے کھلے منہ کے ساتھ مزدور نوجوان نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔

یہ منظر میں نے چھت پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ فوراً ہی چھت کی طرف کئی ہتھیار گرجے مگر میں قطعی محفوظ تھا۔

اصطبل عقب سے دیگر کئی عمارتوں سے متصل تھا۔ میرے سامنے اونچی، نیچی چھتوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ بے حد تیزی کے ساتھ میں کئی چھتیں عبور کر گیا۔ میری حسیات مکمل طور سے بیدار تھیں۔ مجھے خطرہ برجیوں پر تعینات نشانے بازوں کی طرف سے تھا۔ یہاں مجھے دیکھ لیا جاتا تو برجی سے نشانہ بنانا آسان ثابت ہوتا۔

اچانک ہی مجھ پر سیدھا فائر آنے لگا۔ میں نے فوراً ایک چمنی کی اوٹ لی اور عقب میں ایک فائر جھونک دیا۔ ایک سایہ تڑپ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور چھتوں پر بھی چڑھ آئے تھے۔

میں نے دو مزید فائر کیے اور پھر ایک نسبتاً اونچی چھت پر کودا اور اسی پل رائفل گرجی اور میرے دائیں پہلو میں کچی منڈیر کا کونا اڑ گیا۔ یہ فائر یقیناً کسی برجی سے آیا تھا۔ میرے گرد گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔

اونچی چھت کے دوسری طرف جھانکتے ہی میرے سینے میں دبی سانس خارج ہو گئی۔ چھتوں کے درمیان وسیع خلا آ گیا تھا۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ پیچھے بپھرے ہوئے حملہ آور تھے۔

میں نے زینے کی راہ لی، محتاط انداز میں سیڑھیاں اترتا میں نیچے آیا۔

یہ روایتی سا رہائشی یونٹ تھا۔ مختصر سا دالان خالی نظر آ رہا تھا۔ سامنے ہی داخلی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ میں اطمینان سے دروازے سے باہر نکل آیا۔ یہ غالباً

ملازمین کے رہائشی یونٹ تھے۔ زندگی ابھی مکمل طور سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اطراف میں البتہ ہلچل صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

میرے سامنے قلعہ نما حویلی کا ایک اور خالی میدان تھا۔ جس کے دوسرے سرے پر عمارات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا تھا۔

میں نے چادر کندھوں پر درست کی اور پسٹل والے ہاتھ کو چادر میں پوشیدہ کرلیا۔ عمارتوں کا سلسلہ ہی میرے لیے پناہ گاہ ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے اسی طرف پیش قدمی شروع کردی۔

پھلاہی کے ایک چھوٹے سے درخت کی اوٹ لیتے ہی میں نے ایک پرچھائیں سی خود پر جھپٹتے دیکھی۔ تمام تر کوشش کے باوجود میں خود کو اس کی زد سے نہ بچا سکا۔ وہ غراتی ہوئی پرچھائیں مجھ سے لپٹ گئی۔

بادی النظر میں وہ ایک بچہ نظر آتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک بونا تھا۔ جس نے درخت کے اوپر سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ یقیناً رہائشی یونٹ سے نکلتے ہی میں اس کی نظروں میں آ گیا تھا۔

اگلے چند لمحے میری زندگی کے یادگار اور حیران کن لمحے تھے۔ میں نے درندے کی مانند غراتے ہوئے اس چھوٹے کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر میں ناکام رہا۔ اس مختصر سے وجود میں جناتی قوت تھی۔ اس نے بالکل کسی درندے کی مانند میری کلائی میں اپنے دانت گاڑھ دیے تھے۔ اسی کلائی والے ہاتھ میں پسٹل تھا۔

اس کی دونوں ٹانگوں نے بڑی مہارت سے میری کمر کو گرفت کیا تھا۔ اس کی بلند آہنگ غراہٹیں یقیناً میرے میزبانوں کو مطلع کرنے کے لیے تھیں۔

جھنجلاہٹ کے عالم میں، میں نے رخ تبدیل کر کے اسے پوری قوت سے پھلاھی کے تنے سے دے مارا۔

مگر وہ تو جیسے گوشت پوشت کی بجائے ربر سے بنا تھا۔ اس کی گرفت قائم رہی۔ غراہٹوں میں البتہ تکلیف کا آہنگ ضرور شامل ہوا تھا۔

میری کلائی تکلیف سے سن ہوتی جارہی تھی۔ مزید چند لمحوں میں وہ کمبخت وہاں سے گوشت کا لوتھڑا جدا کردینے والا تھا۔

یہی وقت تھا جب کوئی توپ کے گولے کی مانند ہم دونوں سے ٹکرایا۔ میں پہلو کے بل گرا۔ مجھ سے لپٹی بلا نے دانتوں کو وحشیانہ جھٹکا دیا۔ تکلیف کے سبب پسٹل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

ہم دونوں سے ٹکرانے والا ایک اور بونا تھا۔ اس نے بڑی وحشت سے میرے شانے پر منہ مارا۔ اس کے دانت مجھے اپنے گوشت میں گڑھتے محسوس ہوئے۔

پہلے والے نے میری کلائی چھوڑ کر نرخرے پر دانت آزمائے۔ اس کا چوڑا جبڑا اور دانت بلاشبہ انسانی نہیں تھے۔ نرخرہ بچاتے ہوئے ایک لحظہ کے لیے میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ یہ آنکھیں بھی انسانی نہیں لگتی تھیں۔ اسی زرد اور بو کی آنکھیں میں نے اینمل پلانٹ پر بھوکے افریقن ہنٹنگ ڈاگز کی دیکھی تھیں۔ جو گروہ کی صورت میں حملہ آور ہوتے تھے اور زندہ ہی اپنے شکار کو کھانا شروع کردیتے تھے۔

مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھوکے افریقن کتوں کے گھیرے میں ہوں۔ یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ کلائی نیلگوں مائل اور خون سے رنگی تھی۔ شانہ ایک حیوان دبوچے تھا۔ دوسرے کے دانت نرخرہ نہ ملنے کی بعد سینے پر ہدف ڈھونڈ رہا تھا۔

دونوں کی ٹانگوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ پسٹل پہلے ہلے میں چھوٹ گیا تھا۔ مگر وہ دونوں بلائیں اس بات سے بے خبر تھیں کہ میری آستین میں چھپا مہلک ''قاتل'' محض ایک جھٹکے کا منتظر ہے۔ ب

بازو کو مطلوبہ پوزیشن پر لانے کے لیے میں نے زخمی کلائی والے ہاتھ کی انگلیاں بے رحمی سے شانہ دبوچنے والے بونے کی آنکھوں پر ماریں۔

انگلائیل پھر میرے لیے حیرت لیے تھا۔ حیرت انگیز پھرتی سے اس نے میرا حملہ بلاک کیا۔ اوچھا سا ہاتھ پڑا۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ مگر اس لمحاتی کشمکش میں بازو کو مطلوبہ زاویہ مل گیا تھا۔

اسی پل سینے کے اوپری حصے پر بونے نے دانت گاڑھ دیئے تھے۔ تکلیف اور نفرت کی ملی جلی کیفیت میں، میں نے بازو کو مخصوص جھٹکا دیا۔ میرا نشانہ سینے پر سے گوشت اتارنے کی کوشش کرنے والا بونا تھا۔

''گچ'' کی آواز کے ساتھ جان لیوا خنجر اس کی پسلیوں کے درمیان اتر گیا۔ وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپا۔ میرے سینے پر اس کے دانتوں کی گرفت ختم ہو گئی تھی۔

ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائیں، وہاں حیرت ہی حیرت تھی۔ تکلیف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

میں نے جھٹکے سے خنجر کھینچا اور دوسرے بونے کو نشانہ بنایا۔ وہ بے حد کائیاں ثابت ہوا۔ میرا شانہ چھوڑ کر وہ پشت کے بل گرا۔ خنجر ہوا ہی میں لہرا کر رہ گیا۔ پشت کے بل گرتے ہی اس نے الٹی قلابازی کھائی اور ایک دیوار کی دوسری جانب غائب ہو گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نئے زخموں میں جیسے مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے آخری سانسیں لیتے بونے کو ٹھوکر ماری۔

اچانک ہی میدان کے دوسرے سرے پر ہلچل سی محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً ایک دیوار کی اوٹ لی۔ اس سے پہلے میں اپنا گرا ہوا پسٹل اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

فوراً ہی مجھ پر فائرنگ ہوئی۔ میں نے بھی چند جوابی فائر ٹھوکے اور سامنے نظر آنے والے گلی نما راستے پر بھاگ کھڑا ہوا۔

یکا یک ایک بند دروازہ کھلا۔ میں کسی بھی جارح کو نشانہ بنانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میرا پسٹل والا ہاتھ سیدھا ہوا مگر دروازے میں نظر آنے والے ایک غریب صورت بوڑھے قبائلی نے واضح طور پر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

سوچنے، سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر وہ دشمن تھا تو مجھے نشانہ بنانے کی بجائے اندر آنے کا اشارہ کیا معنی رکھتا تھا۔ اور اگر دوست تھا تو پھر کون تھا؟ ٹانگوں کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

زندگی میں کئی مواقع پر میں نے دل کی آواز پر کان دھرا تھا۔ ہر منطق، اندیشے کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے دل کی سنی اور برق رفتاری سے کھلے دروازے میں گھس گیا۔ بوڑھے نے ہر ممکن تیزی اور خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔

''میرے ساتھ آؤ'' بوڑھے نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے گہرے سائے تھے۔

''تم کون ہو؟'' میں نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے پوچھا۔

''حکم کا غلام۔''

اس کے بعد میں نے کچھ پوچھنا فضول جانا۔ مختصر صحن عبور کر کے ہم ایک کمرے میں آئے۔

کمرے میں لالٹین کی مدہم روشنی تھی۔ دو بستر بچھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک پر کوئی ذی روح حالت نیند میں تھا۔ اس کے دھیمے دھیمے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔

بوڑھے نے بے آواز طریقے سے ایک کھڑکی کھولی۔ کھڑکی اتنی بڑی تھی کہ میرے جیسا قوی ہیکل آدمی بھی اس سے بآسانی گزر سکتا تھا۔

پہلے بوڑھا کودا، اس کے اشارے پر میں بھی دوسری طرف کود گیا۔ بوڑھے نے احتیاط سے کھڑکی بند کر دی۔

یہ ایک خاصی وسیع چار دیواری تھی۔ جس میں ہر طرف لکڑی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف شیلڈ کے نیچے لکڑی چیرنے کے لیے دو آرے لگے ہوئے تھے۔

بوڑھا ہر ممکن تیزی سے مجھے لے کر اسی شیڈ کی طرف بڑھا۔ چار دیواری کے اطراف سے کبھی کبھار ہوا کے دوش پر سوار کوئی نہ کوئی ایسی آواز سنائی دے جاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری تلاش میں آنے والے آس پاس ہی ہیں۔

بوڑھا، مجھے لے کر بڑے آرے کے نیچے گھس گیا۔ یہاں یقیناً کوئی خفیہ پناہ گاہ تھی۔ اس نے تیزی سے لکڑی کے چند تختے ہٹائے۔ دوسری طرف تاریکی تھی۔

''یہاں چھپ جاؤ!'' بوڑھے نے اضطراری انداز میں کہا۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ پوری طرح چوکس نظر آتا تھا۔

میں نے اس تاریک خلا میں گھسنے میں لحظہ بھی نہیں لگایا۔ حالانکہ یہ چوہے دان بھی ثابت ہو سکتا تھا مگر میں خود کو تن بالتقدیر کر چکا تھا۔

بوڑھے نے تختے لگاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں نکالنے کے لیے آؤں گا۔ اپنے طور پر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''ٹھیک ہے'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا آخری تختہ بوڑھے نے جوڑ دیا تھا۔ میں نے گہری تاریکی میں اپنی پناہ گاہ کو ہاتھوں سے ٹٹولا۔ بمشکل چار فٹ چوڑی اور سات فٹ لمبی جگہ تھی۔ نیچے لکڑی کا خشک برادہ بچھا تھا۔ میں اسی برادے پر لیٹ گیا۔

کھٹ پٹ کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوڑھا ابھی وہیں پر ہے اور تختوں کے آگے لکڑیاں وغیرہ ڈال کر میری پناہ گاہ کو مزید محفوظ بنانے کی کوشش میں ہے۔

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا وہاں سے جا چکا تھا۔

میں بے حرکت لیٹا تھا۔ جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ کان اطراف کی طرف جمے تھے، ہاتھ میں دبا پسٹل کسی ناگہانی کے لیے مکمل تیار تھا اور ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔

یہاں اس دشمن حویلی میں کون تھا میرا ہمدرد؟ جس کے حکم پر بوڑھے نے مجھے یہاں چھپایا تھا۔ کیا گل ریز کو میرے اغوا کاروں اور اس حویلی میں میری موجودگی کا علم ہو چکا ہے؟ اور اس کا نیٹ ورک میری مدد کے لیے حرکت میں آ چکا ہے؟

یہ بڑا حوصلہ افزا خیال تھا۔ جسم میں توانائی سی دوڑتی محسوس ہوئی اور یہ خیال حقیقت کے بھی قریب محسوس ہوا۔

قدرے اطمینان کا احساس ہوا تو جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا احساس سوا ہو گیا۔ پہلے ڈاکوؤں کے ہاتھوں گدی اور پیشانی پر لگنے والے قیامت خیز ضربیں، پھر ریچھ کے خونی پنجوں نے بھی مقدور بھر مجھے ادھیڑا تھا۔ اس کے بعد خون آشام بونوں نے بھی میرے

جسم پر دانت آزمائے تھے۔

ان زخموں سے جہاں ٹیسیں اٹھتی تھیں، وہاں راحت کا بھی احساس ہوتا تھا، میں نے صرف زخم کھائے ہی نہیں تھے لگائے بھی تھے۔ ڈاکوؤں میں سے کوئی نہ کوئی میرا نشانہ بنا تھا۔ قید خانے میں بھی میرے دو مقتول موجود تھے۔ ریچھ کا بھی دل میں نے ادھیڑا تھا اور خون آشام بونوں میں سے ایک کی پسلیوں میں خنجر اتارتے ہوئے بازو میں جو سنسناہٹ ہوئی تھی۔ وہ یادگار تھی اور کئی زخموں کا مرہم تھی۔

بے خیالی میں ہاتھ کو حرکت دی تو پسٹل کا اوپری حصہ ٹھوڑی کے نچلے حصے سے ٹکرایا تو درد کی لہر نے اس زوردار پنچ کی یاد تازہ کردی جو سرخ بھیڑیے نے لگائی تھی۔

دل سے ہوک اٹھی۔ اس ضرب کا جواب ابھی دینا باقی تھا۔ مثل ہے...... یار زندہ صحبت باقی۔ میرا مقولہ تھا...... دشمن زندہ ضرب ادھار۔

دشمنوں کا سوچتے ہی سینے میں زہریلا سا دھواں بھرنے لگا تھا۔ میں نے اپنی فطرت کے مطابق ہر جگہ اور ہر میدان میں اپنے اور ملک کے دشمنوں کا ڈٹ کر سامنا کیا تھا۔ زخم کھائے تھے تو جگر پاش کردینے والے زخم لگائے بھی تھے۔

اچانک میرے حساس کانوں نے پہلے کسی کے کودنے اور پھر کوئی وزنی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ سانپ کی مانند ایک اندیشہ دماغ میں سرسرایا۔ کیا مجھے پناہ دینا ایک دھوکا تھا، وہ بوڑھا کوئی بہت بڑا کلاکار تھا؟ جس نے اپنی جسمانی کمزوری کے باعث اپنی ذہنی طاقت سے مجھے زیر کیا تھا؟ بہر حال گیا وقت لوٹ نہیں سکتا تھا۔ میں آنے والے وقت کے لیے تیار ہوگیا۔ پسٹل میں دو، تین ہی گولیاں بچی تھیں۔ مرتے ہوئے بھی میں انہیں مناسب طریقے سے استعمال کرسکتا تھا۔ موت سے آنکھ مچولی اب میرے لیے محض ایک کھیل ہی تھا۔ موت سے ڈر کر میں کبھی نہیں بھاگا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے کئی دفعہ موت کو بھی خود سے آنکھیں چراتے ہوئے دیکھا تھا۔

اگلے چند منٹوں میں یہ اندیشہ غلط محسوس ہونے لگا کہ بوڑھے نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ یہ میری تلاش میں نکلی کوئی سرچ پارٹی تھی۔ جو لکڑی کے اس گودام کے کونوں کھدروں میں مجھے تلاش کررہی تھی۔ اگر انہیں میری پناہ گاہ سے پہلے ہی آگاہی ہوتی تو وہ سیدھے اسی طرف آتے۔

پھر اپنی پناہ گاہ کے قریب مجھے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ دل کی دھڑکن خفیف سی بڑھ گئی۔ یہ پناہ گاہ کچھ ایسی خاص بھی نہیں تھی۔ باریک بینی سے اور ٹارچ وغیرہ کی مدد سے جائزہ لیا جاتا تو اسے ڈھونڈا جاسکتا تھا۔

کسی نے جھنجلائے انداز میں غائبانہ طور پر مجھے پشتو کی ایک کلاسیکل گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔ ”کہاں چھپ سکتا ہے......“ اسکے بعد پھر مغلظات کا طوفان تھا۔

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ”یہاں سے تو نکل...... وہ چھپکلی تو ہے نہیں کہ یہاں چھپا رہے گا۔ اچھا خاصا جوان ہے۔“

”تیرا سالا...... سالار خان سر پر کھڑا ہے۔ کوئی کارکردگی تو دکھائیں۔“ جھنجلائی آواز نے اب کے آواز قدرے دبا کر کہا

دوسرا غالباً منہ دبا کر ہنسا۔ ”اس کو سالا بول کر دل خوش کردیا خاناں! تمہارے منہ میں مسرت شاہین نسوار کا چٹکا۔“

وہ دونوں آواز دبا کر ہنسنے لگے۔ میں بھی قدرے اطمینان کے احساس کے ساتھ ان کے مکالمے سے لطف اندوز ہوا۔ وہ محض کسی سالار خان کی ماتحتی میں ”ڈیوٹی“ سرانجام دے رہے تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جس کی انہیں تلاش ہے وہ محض ان سے چند فٹ کی دوری پر لکڑی کے تختوں کے پیچھے پوشیدہ ہے۔

سالار خان کو سالا بنانے کے آرزومند کی آواز ابھری۔ ”شیر خاناں! وہ جوان، انسان ہے یا درگئی کی گھاٹی سے سرخ بھیڑیا کوئی بدروح اٹھا لایا ہے۔ بند تالوں میں ہونے کے باوجود اس نے نا صرف الک اور صاب کو ہلاک کر کے قید خانے سے رہائی حاصل کرلی بلکہ ”ڈھوڑے“ جیسے خونخوار ریچھ کو بھی گولی مارے بغیر ہلاک کرچکا ہے۔“

دوسرے نے اس کی بات اچکی۔ ”زیادہ حیران کن اس کا شیطانی بونوں کو پچھاڑنا ہے۔ ان بلاؤں کو دیکھ کر تو ”مم“ (سنگلاخ پہاڑوں کی بلندیوں پر رہنے والا ایک عورت نما افسانوی جانور) بھی راستہ بدل لیتی ہے۔“

شاید انہیں اوپر سے پکارا گیا۔ وہ نیچے ”کچھ نہیں“ کا اعلان کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس خارج کیا۔ ساتھ ہی یقین ہوگیا کہ اس دشمن حویلی میں میرے خیر خواہ بھی موجود ہیں اور اب میں انہی کے پاس ہوں۔

کچھ دیر بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ دونوں کارندوں کے توصیفی جملے بڑا سرور دے گئے تھے۔ میری ”آمد“ بڑی تہلکا خیز ثابت ہوئی تھی۔

بونوں کو ”شیطانی بونے“ کہنا اور ان سے خوفزدگی کا اظہار بہت معنی خیز تھا۔ لگتا تھا وہ بڑی خاص چیز تھے۔ اور اس میں شک بھی نہیں تھا۔ شانے، سینے اور کلائی سے اٹھتی ٹیسیں ان کے خاص چیز ہونے کا واضح ثبوت تھیں اور ان کی بھوکی آنکھیں...... خدا کی پناہ ہرگز انسانی نہیں لگتی تھیں۔

تاریکی رفتہ رفتہ میرے حواس پر چھانے لگی۔ ذہن پر خمار سا چھانے لگا۔ زخم زخم جسم کو درد جیسے مٹھیاں سی بھرنے لگا۔

کوئی ستارہ نہ آجائے پاؤں کے نیچے
سنبھل کر قدم اٹھاؤ کہ بہت اندھیرا ہے

ساغر صدیقی کے اس شعر کے ساتھ ہی اس وقت کی یادوں نے مجھ پر یلغار کردی جب بارود کے دھوئیں میں غرق اور دن رات خون کی ہولی کھیلنے والا ”کمالا جٹ“ صرف کمالا پتر ہوتا تھا۔ جو اپنے نام کے ساتھ ”ڈاکٹر“ لکھ کر خوش ہوتا تھا۔ جسے اچھی شاعری مسحور کردیتی تھی۔ جسے تتلیاں، پرندے، سردیوں کی سرمئی شامیں، دوستوں کی محفلوں میں بلند آہنگ قہقہے لگانا، بہن کو تنگ کرنا اور ماں کے ہاتھوں کی بلوری لسی اچھی لگتی تھی۔ اپنا قصبہ ”جٹاں والی“ جس کے سینے میں بستا تھا، اور ستارہ آنکھوں والی ایک لڑکی اس کی کل کائنات تھی۔

برق رفتار کمپیوٹر جیسے زندگی کی فلم کو بجلی کی سی تیزی سے ریوائنڈ کرتا چلا گیا۔ بیگھے ملوں کے ڈیرے سے بے عزت ہوکر آنے کے بعد مجھے والد صاحب نے زبردستی واپس ہوسٹل بھیج دیا۔

میں کھولتے دماغ کے ساتھ واپس آیا تھا۔ جہاں بے عزتی کا احساس رہ رہ کر کچوکے لگاتا تھا۔ وہاں والد صاحب کی فکر بھی ستاتی تھی۔

بعد میں پتا چلا کہ والد صاحب اور میجر صاحب، بیگھے ملوں کے ڈیرے پر گئے تھے۔ جہاں مجھ پر ہونے والے تشدد کے حوالے سے میجر صاحب اور بڑے میاں کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔

بہت عرصے بعد علاقے کے لوگوں نے ریٹائرڈ میجر واجد علی ترین کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ انہوں نے مصلحت کی چادر اتاری اور لوگوں نے ان کے وسیع تعلقات کا کرشمہ دیکھا۔

صرف دو دن میں چنگڑوں کے لڑکے بشمول اغوا ہونے والی لڑکی کا منگیتر وجاہت عرف ہیرا حوالات سے باہر تھے بلکہ لڑکی کے اغوا کے شبے میں میاں ذوالفقار نہ صرف حوالات میں تھا بلکہ اس کے دیگر خاندان کے دو لڑکوں کو پکڑنے کے لیے پولیس بیگھے ملوں کے کئی ڈیروں پر چھاپے مار چکی تھی۔

میرے دل کی حکمران...... میرے قریب تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ میری بیرونی چوٹوں اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے بے خبر رہتی۔

میں نے سب کچھ اس کے سامنے کھول دیا۔ وہ فوراً پرجوش ہوگئی۔ اس کے رشتے کے ایک ماموں ''تحفظ قدرتی ماحول'' کے وفاقی ادارے میں اونچی پوسٹ پر تھے۔ کائنات نے ان سے بات کی۔ کالج کے ہی ایک لڑکے کے والد محکمہ انہار میں بڑے توپ قسم کے آفیسر تھے۔

بیٹے کے دباؤ پر وہ بھی بادل نخواستہ حرکت میں آئے۔ میجر صاحب پہلے ہی سرگرم تھے۔ نتیجہ بہت جلد سامنے آ گیا۔

بیگھے ملوں کی چمڑا رنگنے والی فیکٹری ''سیل'' ہوگئی۔ بھاری جرمانہ علیحدہ سے بھرنا پڑا تھا۔

میں دوبارہ ''جتاں والی'' گیا تو بڑا سرشار تھا۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ کائنات میرے ساتھ تھی۔ وہ شہر کی پلی بڑھی تھی۔ گاؤں کا ماحول' کچے راستے اور چاچا فضی کے تانگے میں ''یادگار'' سفر۔ اس کے لیے یہ سب بہت دلچسپ تھا۔ میں' اسے خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

کائنات کو پانے کے بعد میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے مسکراتا دیکھ کر اگر میں پژمردہ ہوتا تھا تو پژمردگی ایک نرم پھوار جیسی سرشاری میں بدل جاتی ہے۔

وہ 'میرا نام بڑی خوبصورت ادا سے لیتی تھی۔ ''کمال'' کہتے ہوئے اس کے احمریں لب بڑی خوبصورتی سے چھلکتے تھے اور میں مبہوت ہو کر دیکھتا رہ جاتا تھا۔ میری محویت پر وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی تھی۔ اس کے لبوں کی چمک دیکھ کر اکثر میں یہ شعر اسے سناتا تھا۔

شاید تیرے لبوں کی چمک سے ہو جی بحال
اے دوست! مسکرا کہ طبیعت اداس ہے

کائنات کو دیکھ کر چاچا رضی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا ''یہ کون ہے کمال پتر؟''

میں نے بڑی ترنگ میں کہا۔ ''تیری 'نو' ہے چاچا!''

''بڑی سونی ہے۔'' چاچا نے بے ساختہ کہا۔ خدا جوڑی سلامت رکھے۔''

کائنات نے بری طرح جھینپ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

سہاگن

راحیلہ ناز

عورت بظاہر نرم و نازک پھولوں کی مانند شگفتہ حساس اور چھوئی موئی ہوتی ہے' اس کا یہ نازک پن ہی سب کو بھاتا ہے' لیکن یہی عورت جب بیوی اور ماں بنتی ہے تو اپنے سہاگ اور اولاد پر آنچ آتی دیکھ کر شیرنی سے بھی زیادہ خطرناک بن جاتی ہے۔

ایک سہاگن کا احوال' وہ ہر حال اور ہر قیمت پر اپنا سہاگ بچانا چاہتی تھی

وہ ڈبل بیڈ پر ساکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی اور گلا پسینے سے تر ہو رہا تھا اور روبینہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اسے روبینہ کے خراٹوں کا انتظار تھا۔ نجانے کیوں' آج وہ مسلسل کروٹیں لے رہی تھی۔ حسب عادت اچانک لیٹتے ہی اسے نیند نے آ گھیرا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ندیم بہت پریشان تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ اسکرین کے عقب میں ڈرائنگ روم کے برابر کمرہ نما اسٹوڈیو میں وہ کیا کر رہی ہوگی۔

روبینہ نے ایک بار پھر کروٹ بدلی اور دوسری طرف منہ کرلیا۔ ندیم آہستہ آہستہ بیڈ کی نگر کی طرف کھسکنے لگا دوران خون اچانک تیز ہوگیا اور اس کی دھمک کان کے پردوں پر بھی سنائی دینے لگی۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ سیٹی کی آواز سننا چاہتا تھا مگر شاید وہ ناراض تھی۔

''ندیم۔'' اسے معاً روبینہ کی سرگوشی سنائی دی اور اس نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔ ''کیا سوگئے؟'' اس نے اپنے بازو پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک جواب نہیں دے گا وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ روبینہ کو یقین ہے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ ''ندیم......!''

''کیا ہے؟'' اس نے منمناتے ہوئے پوچھا۔

''آج گرمی بہت ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ چڑیل تو سوئی کیوں نہیں۔ ''سونے کی کوشش کرو نیند آ جائے گی۔''

''نہیں آ رہی......!'' روبینہ نے جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''اتنے حبس میں بھلا نیند کیسے آ سکتی ہے ایئر کنڈیشنز بھی گرم ہوا پھینک رہا ہے۔''

ندیم دونوں ہاتھ کنپٹی کے نیچے رکھے لیٹا رہا۔ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ پڑھ لوں۔ شاید اسی طرح نیند آ جائے۔'' اس سے قبل کہ وہ احتجاج کرتا روبینہ نے بیڈ لیمپ روشن کر دیا اور ندیم کی آنکھیں درد کرنے لگیں۔ ''اوہ' پلیز روبینہ بند کرو یہ لیمپ مجھے صبح دفتر بھی جانا ہے' سونے دو۔''

روبینہ کچھ دیر تک اسے گھورتی رہی اور پھر چادر پھینک کر بیڈ سے اتر گئی۔ وہ سرخ نائٹ گاؤن میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن ندیم کی نظروں میں وہ انتہائی بدصورت عورت تھی۔ وہ اسے اپنی تازہ محبت کی راہ میں ایک خطرناک رکاوٹ سمجھتا تھا۔

''پتا نہیں شیری سو رہی ہے یا......!'' روبینہ نے نائٹ گاؤن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ندیم کیا اسے اتنی گرمی میں نیند آ سکتی ہے؟''

''آ سکتی ہے بشرطیکہ تم کھٹر پٹر کر کے اسے

ڈسٹرب نہ کرتی رہو۔" ندیم نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کیونکہ لیمپ کی روشنی بری طرح چبھ رہی تھی۔ "چلو اب لیمپ بجھا کر سو جاؤ۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی گھٹا جیسی زلفیں شانوں پر مچلنے لگیں۔ "ذرا پانی تو پی آؤں خدایا، کتنی پیاس لگ رہی ہے۔ یہ گرمی پتا نہیں کب کم ہوگی۔"

وہ کمرے سے نکل گئی اور ندیم لمبی لمبی سانسیں لے کر بے چینی کم کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اسے ٹوائلٹ کے فلش کی آواز سنائی دی پھر روبینہ نے گلا صاف کیا اور پھر گنگنانے لگی۔ لیکن معاً یہ تمام آوازیں خاموش ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد کولر کے کھلنے اور پانی کے گرنے کی آواز آنے لگی۔

"آہ......!" روبینہ نے یقیناً بڑا سا گھونٹ لیا تھا پھر گلاس کے رکھنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد باتھ روم کی لائٹ بند ہوگئی۔

چند ہی لمحوں بعد وہ مسکراتی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ "ندیم......!"

"کیا ہے بھئی...... پھر جگا دیا......!" اس نے جھنجلا کر تکیے پر سر پٹخ دیا۔

"سوری ڈارلنگ، ارے ہاں یہ بتاؤ تمہیں وہ کتاب پسند آئی جو میں نے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ پوری پڑھی بھی یا نہیں۔" وہ بیڈ کی نگر پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اف...... روبینہ خدا کے واسطے سونے دو۔ لائٹ بند کردو اور خود بھی سو جاؤ، اس طرح باتیں کرنے سے تو نیند نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے بابا تم نے تو جان کھالی ہے بکے جا رہے ہو۔" روبینہ غصیلے انداز میں لیمپ آف کر کے لیٹ گئی لیکن چند لمحوں بعد خود ہی بولی۔ "ذرا جا کر دیکھ لو شیری سوئی بھی یا نہیں۔"

ندیم خاموش رہا۔

"بیڈ روم میں تو بڑا حبس ہو رہا ہے ندیم، پتا نہیں رات کس طرح کٹے گی۔"

ندیم اس مرتبہ بھی خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں تو شیری کا حسین سراپا گھوم رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسٹوڈیو کے کاؤچ پر بے سے لیٹی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شیری اتنی خ... تھی کہ ندیم پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔ اس نے پہلی ملاقات کے بعد بھی نخریلے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہر وقت تیار رہتی تھی۔ ہر پیش قدمی کا جواب بھرپور گرم جوشی سے دینا اس کی فطرت تھی۔ ندیم اسے اپنے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھنے لگا تھا۔

"ندیم! میں مسلسل بولے جا رہی ہوں اور تم نے ہونٹوں پر گوند لگا رکھی ہے۔" روبینہ نے برہمی سے اسے ٹہوکا دیا۔

"میں سونے کی کوشش کر رہا ہوں ڈارلنگ۔"

ندیم کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اسے غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن اس وقت غصے کے اظہار سے صورت حال اور بگڑ سکتی تھی۔ لہٰذا وہ خون کے گھونٹ پی کر پڑا رہا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ شیری کو اب محتاط رہنا چاہیے وہ جوان ہوگئی ہے بچی نہیں رہی۔ جب دیکھو لان میں لیٹی رہتی ہے۔ حرکتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں، پھر اس شہر میں آج کل کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے ابھی کل ہی کسی نے شاہ صاحب کے گھر میں گھس کر اس کی بیٹی کو بے آبرو کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ شیری مقتولہ سے کہیں زیادہ حسین اور پرکشش ہے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا، اسے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔"

"ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہو اب سو جاؤ۔" ندیم نے اس مرتبہ غصے کو بڑی مشکل سے ضبط کیا تھا۔

معاً ندیم کو احساس ہوا کہ وہ سو چکی ہے لیکن اس نے فوراً اٹھنے کی خواہش کو کچل دیا وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے دل و دماغ میں گزشتہ شب اس سے پہلے کی رات اور اس سے قبل کی شب کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ شیری صرف دو ہفتے قبل ان کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھی اور تعلیمی مصروفیات کے باعث وہ روبینہ اور ندیم کی شادی میں بھی شرکت نہ کر سکی تھی۔ ندیم کو روبینہ سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ شیری اس کی بہن ہے اور تعلیمی مصروفیات کے باعث آکسفورڈ میں ہے پھر ایک روز اچانک اطلاع دیے بغیر شیری کسی لطیف جھونکے کی طرح ان کے گھر چلی آئی۔ اسے دیکھ کر ندیم دیوانہ ہوگیا۔ وہ تر و تازہ گلاب کی مانند تھی۔ اس کے سرخ بال اتنے خوب صورت تھے کہ ندیم منٹوں میں ان کا اسیر ہوگیا تھا۔ اس کی سرخی مائل نیلی آنکھوں میں پرسکون سمندروں کی خوب صورتی تھی اور پھر ایک رات جب ندیم نے اس کو چھوا تو اسے بخوبی علم ہوگیا کہ وہ سمندر کی تیز موجوں سے بھی زیادہ شدید جذبے رکھتی ہے۔ ان کا تعلق صرف دو تین راتوں کا تھا مگر ندیم شیری کو ہمیشہ کے لیے حاصل کرنے کی خاطر روبینہ کو طلاق دینے پر بھی آمادہ ہوگیا تھا۔ تاہم جب گزشتہ شب اس نے شیری سے اس کا ذکر کیا تھا تو وہ ایک ادا سے ہنس کر اسے دیکھنے لگی تھی اور اس نے کہا تھا۔

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے ڈارلنگ میں تمہاری ہوں، کیا میں نے ثابت نہیں کردیا ہے کہ میں تمہاری ہوں۔ اگر ہم نے شادی کرلی تو سارا لطف جاتا رہے گا تم جانتے ہی ہو کہ روبینہ کی گھر میں موجودگی کے باوجود یوں ملنا کتنا پراسرار کتنا سنسنی خیز ہے۔" شیری کا ایک ایک جملہ معنی خیز اور اداؤں سے بھرپور تھا۔

وہ دونوں کل دوپہر گیراج میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک روبینہ بھی آگئی اور ندیم گاڑی کے انجن پر جھک گیا۔ شیری نے گھبرا کر ایک بوری ٹانگوں پر ڈال لی اور روبینہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ کھانا تیار ہے۔

ندیم نے سر اٹھا کر روبینہ کی طرف دیکھا اب وہ ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ناچ گئی۔ 'چڑیل' اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر آہستہ آہستہ بیڈ سے اتر گیا۔

اس نے ایک بار پھر روبینہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ روبینہ گہری نیند سوتی ہے ایک بار اس کی آنکھ لگ جائے تو وہ صبح ہونے سے قبل کبھی بے دار نہیں ہوتی۔ اس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔

گھڑی کی سوئیاں سوا دو بجا رہی تھیں۔

اسے دیر ہوگئی تھی لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ شیری اس کے انتظار میں اب بھی جاگ رہی ہوگی۔ کل رات بھی وہ دیر سے اس کے کمرے میں گیا تھا اور اسے دیکھتے ہی شگفتہ گلاب بن گئی تھی۔

وہ ننگے پیر ہی شیری کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہال میں پہنچ کر اس نے رفتار مزید تیز کردی پھر ڈائننگ ہال سے دوڑتا ہوا اسٹوڈیو والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اسکرین کے پردے کے پیچھے وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی شاید سو رہی تھی کمرے کی بتی بند تھی۔ مگر چاندنی کی وجہ سے اندر

زیادہ اندھیرا نہ تھا وہ اسکرین کے قریب کھڑا ہوگیا۔

چادر شیری کی گردن تک پڑی ہوئی تھی۔ خوب صورت ریشمیں بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے شیری کو آواز نہ دی وہ آہستہ آہستہ بیڈ کی طرف بڑھا اور پھر اس نے چادر کھینچ لی۔ ''شیری' شیری میں آ گیا ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا اور پھر معاً اس کا ہاتھ گیلا ہوگیا۔ اس نے چونک کر ہاتھ کی طرف دیکھا۔

''خون......!'' وہ گھبرا گیا۔ شیری کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ تب اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ شیری کا خوب صورت چہرہ مسخ ہونے کے بعد کتنا بھیانک لگ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر پلٹا اور اسکرین سے ٹکرا گیا۔ اسکرین زوردار آواز سے فرش پر گر گئی۔

''ندیم......!'' یہ روبینہ کی آواز تھی۔ سرد اور سپاٹ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ مسکرا رہی تھی لیکن پھر اچانک اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا وہ اسے گھورنے لگی۔

''روبینہ' شیری مر گئی۔'' ندیم نے چیخ کر کہا۔ پھر روبینہ نے بتی کھولی تو وہ دہل کر رہ گیا۔ شیری خون سے لتھڑی پڑی ہوئی تھی خود ندیم کے ہاتھ بھی خون سے آلودہ تھے۔

''ڈارلنگ بہتر ہوگا کہ پولیس کو فون کردو۔'' روبینہ نے پرسکون لہجے میں مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی جنونی موقع پا کر گھر میں گھس آیا تھا اور شبیر صاحب کی بیٹی کی طرح میری بہن کو بھی قتل کر گیا۔ دیکھو فرش پر چاقو پڑا ہے مجرم نے اسی سے میری اکلوتی بہن کا گلا کاٹا ہوگا۔''

فرش پر تیز اور بڑے پھل والا خون آلود چاقو پڑا ہوا تھا۔

''دیر مت لگاؤ ندیم! لیکن ٹھہرو بہتر ہوگا کہ پولیس کو میں فون کردوں تم اچھی طرح ہاتھ دھولو۔ تمہارے ہاتھ خون آلود ہیں اگر تم نے فون کیا تو ریسیور بھی گندا ہوجائے گا۔''

''تم......تم نے شیری کو قتل کیا ہے؟'' ندیم نے بڑی مشکل سے سوال کیا۔ لفظ اس کے حلق میں پھنس پھنس کر نکل رہے تھے۔

''ہاں ڈارلنگ' یہ میرے سہاگ کا مسئلہ تھا۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور یہ نہیں دیکھ سکتی کہ کوئی اور عورت میرے حق پر ڈاکا ڈالے خواہ وہ میری سگی بہن ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے اس پر اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک میں نے تم دونوں کو گیراج میں نہ دیکھ لیا۔ میں نے شیری سے درخواست کی کہ وہ یہاں سے چلی جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ بچپن سے ضدی اور خود سر تھی جب میں نے زور دیا تو وہ چڑ کر بولی کہ ٹھیک ہے میں ندیم کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا ندیم' وہ میرا سہاگ لوٹ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک فیصلہ کیا اور آج جب میں پانی پینے کے لیے کمرے سے آئی تو یہ بے غیرت بڑی بے چینی سے کاؤچ پر لیٹی تمہاری منتظر تھی میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ تم اس کا برا تو نہیں مانا ڈارلنگ۔''

''میں......!''

''چھوڑو جا کر نہا لو میں پولیس کو فون کرتی ہوں میری بہن ایک جنونی کے ہاتھوں ماری گئی بے چاری۔''

ہمرکاب

عبدالسمیع سہل

نمہ داری کا احساس انسان سے زیادہ وفادار پالتو جانور میں ہوتا ہے۔ وہ مرتا مرجاتا ہے لیکن اپنے مالک سے بے وفائی نہیں کرتا جبکہ انسان جو اشرف المخلوق ہے اکثر اپنی غرض پر اپنے جیسے انسان کا دل توڑنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔

ایک پالتو گھوڑے کا احوال' اس نے وقت پڑنے پر اپنے مالک کی لاج رکھ لی تھی

فائر کی وہ آواز میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

وہ آواز بلند اور فیصلہ کن تھی جو آج بھی کبھی کبھی میرے خوابوں میں گونج اٹھتی ہے۔

لیکن یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ تمام بات شروع سے ہی بتائی جائے۔

موت کے بعد قبر کیلتبے پر صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی ہوگا۔

''متوفی مارشل کا مالک تھا۔'' میرے خیال میں اس سے بہتر میرا کوئی تعارف نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کو ریس سے کوئی دلچسپی ہے تو آپ نے مارشل کا نام ضرور سنا ہوگا۔ مارشل اپنے وقت کا چیمپئن گھوڑا ہے ہر ریس میں اول آتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دوڑتا نہیں ہوا میں اڑتا ہے۔ وہ میرے فارم میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ ابتدائی چند ماہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ دنیا کے بہترین گھوڑوں میں شمار ہوگا لہٰذا میں نے یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ دو سال سے پہلے کسی ریس میں حصہ نہیں لے گا۔

جب وہ تین سال کا ہوگیا تھا اس نے پہلی مرتبہ کینٹکی ڈربی ریس میں حصہ لیا۔ اس وقت ریس کا بہترین گھوڑا رائل چیلنج تھا۔ وہ ایک خوب صورت اور شاندار گھوڑا تھا ویسٹ کوسٹ پر ہونے والی کئی ریسوں میں اول آیا تھا مارشل کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ زیادہ تر شائقین نے رائل چیلنج پر رقمیں لگائی تھیں۔

ریس شروع ہوئی اور نہایت سخت مقابلے کے بعد مارشل جیت گیا ریس کے شائقین دنگ رہ گئے۔ رائل چیلنج اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ ہارا تھا۔ اس نے بھرپور مقابلہ کیا تھا۔ مارشل صرف ایک انچ کے فرق سے جیتا تھا۔ اس کامیابی کے بعد ہم نیویارک' لوئی ویل اور امریکا کے دیگر علاقوں میں گئے۔ کئی ریسوں میں حصہ لیا اور مارشل ہر مقابلے میں اول رہا۔ چند دنوں کے اندر وہ پورے امریکا میں مشہور ہوگیا۔

مارشل کے بعد جو دوسری چیز میرے لیے خوشی اور سکون کا باعث تھی وہ میری بیوی سینڈرا تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں پندرہ سال چھوٹی اور نہایت حسین و جمیل خاتون تھی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو اسے گھوڑوں سے کوئی دلچسپی تھی نہ ریس سے۔ اس کے برعکس وہ ریس کو ایک ظالمانہ کھیل تصور کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گھوڑوں کو انسانوں کی تفریح طبع کے لیے دوڑایا جاتا ہے۔ اگر گھوڑوں کو اختیار ہوتا تو وہ کبھی ان مقابلوں میں دوڑنا پسند نہ کرتے۔ تاہم جب اس نے مارشل میں دلچسپی لینی شروع کی تو اس کے خیالات تبدیل ہوگئے۔ اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ گھوڑے پیدا ہی دوڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔

جوں جوں مارشل کامیابی حاصل کرتا گیا سینڈرا کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ اکثر اصطبل میں جا کر مارشل کی گردن تھپتھپاتی اپنے ہاتھ سے اسے چارا کھلاتی۔ یہ

بات میرے لیے باعث مسرت تھی کہ ہم بستر اور دولت کے علاوہ بھی کسی چیز میں شرکت کر سکتے تھے۔ اگر میاں بیوی کے خیال میں ہم آہنگی نہ ہو تو وہ اول الذکر دو چیزوں کے سوا کسی بات میں باہم شرکت نہیں کر سکتے۔

لیکن میں سینڈرا کے ذکر سے آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ سینڈرا کی نہیں مارشل کی کہانی ہے اس سے بہترین گھوڑا کبھی میری ملکیت میں نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس سے بہترین گھوڑا میں نے کبھی دیکھا اور سنا تھا۔ ایک معمر شخص نے فریلپ نامی ایک گھوڑے کا ذکر کیا تھا لیکن وہ پچاس برس قبل ریسوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

پہلی ریس کے بعد مارشل نے مزید دو ریسوں میں رائل چیلنج کو شکست دی اس کے بعد رائل چیلنج کو زبردست تیاری کرائی گئی۔ اگلا مقابلہ بیلمانٹ میں طے پایا۔ اس دوران میں یہ خبر اڑا دی گئی کہ رائل چیلنج کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہے۔ میں اس افواہ کا مقصد فوراً ہی سمجھ گیا۔ وہ لوگ ہمیں ریس میں حصہ لینے سے باز رکھنا چاہتے تھے لیکن ہم ان کی باتوں میں آنے والے نہیں تھے میں نے اخبار میں بھی اس بات کا دوٹوک اظہار کر دیا کہ رائل چیلنج کو مارشل کے مقابلے میں لانے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ مخالف پارٹی یہ بیان پڑھ کر بہت چراغ پا ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت تھی جس کا میں نے اظہار کر دیا تھا۔

تاہم سینڈرا مجھ سے متفق نہیں تھی، بولی۔ ''اگر گھوڑا بیمار ہے تو اسے ریس میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔''

''رائل چیلنج بیمار نہیں ہے، سینڈرا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔ ''یہ لوگ ہمارے مارشل سے ڈرتے ہیں۔ معمولی نزلے زکام کی وجہ سے اتنے بڑے مقابلے سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔''

''اس بات کو یونہی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' سینڈرا نے اصرار کیا۔ ''ہو سکتا ہے رائل چیلنج کو واقعی کوئی متعدی بیماری ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں مارشل کو مقابلے میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔''

''یہ سب کاروباری داؤ پیچ ہیں اگر رائل چیلنج واقعی بیمار ہوتا تو کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی جاتی۔''

سینڈرا کا جذبۂ ہمدردی حیوانات پیدا ہو گیا، بولی۔ ''گزشتہ سال تو تمہیں مارشل کا بہت خیال تھا تم نے کہا تھا کہ دو سال پہلے اسے کسی ریس میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ کیا اب اس کی پروا نہیں رہی؟''

''اس وقت وہ ایک بچہ تھا۔ اب پروفیشنل بن چکا ہے اور جہاں تک پروا کا تعلق ہے تو یقین رکھو مجھ سے زیادہ اس کی کوئی پروا نہیں کر سکتا لیکن میں جذباتی انداز میں نہیں سوچنا چاہتا۔ یہ کاروبار ہے۔ اس میں ہر پہلو کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

بہرحال رائل چیلنج کو مقابلے میں شامل نہیں کیا گیا اور یوں ہم اس کے مقابلے میں گھوڑے کی برتری ثابت کرنے سے محروم رہ گئے۔ تاہم مقابلہ ہوا۔ مارشل دوسرے گھوڑوں سے کم از کم پندرہ بیس گز آگے تھا۔ وہ سب اچھے گھوڑے تھے اور انہیں ہل میں نہیں جوتا جاتا تھا۔ رائل چیلنج کی دستبرداری کے سبب بعض لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ دونوں گھوڑوں کے مالکان نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔

چند ہفتوں کے بعد کیلیفورنیا کے ایک ایجنٹ نے رائل چیلنج اور مارشل کے مابین مقابلے کی دوڑ میں جیتنے والے گھوڑے کے لیے ایک لاکھ ڈالر کا خصوصی انعام رکھنے کی پیش کش کی۔ یہ ایک پرکشش پیش کش تھی اور کسی کے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رائل چیلنج کے مالک مسٹر ایڈی نارمن نے بھی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ تاہم میں فاصلے کے بارے قدرے متذبذب تھا میں چاہتا تھا کہ ریس ڈیڑھ میل کی ہو لیکن منتظمین، امریکن روایت کے مطابق سوا میل کی ریس

کرانا چاہتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ مارشل کم فاصلے کی ریس میں زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ زیادہ فاصلے میں وہ اپنے حریف کو آسانی سے شکست دے سکتا تھا۔ کم فاصلے میں وہی گھوڑا جیت سکتا تھا جو شروع میں ہی برتری حاصل کرلے لہٰذا مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔

لیکن سینڈرا کو اس بات پر سخت اعتراض تھا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص میچ ریس کے بارے میں یقیناً اس کی غلط رہنمائی کر رہا تھا۔ ''مجھے اس میچ ریس پر اطمینان نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم اس ریس میں حصہ نہ لیں۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''اس میں کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔ بلکہ خطرہ ہے۔''

''خطرہ؟ مجھے تو کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ پورے ریس کورس میں دس بیس کے بجائے صرف دو گھوڑے دوڑیں گے پھر خطرہ کیسا؟''

''تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔'' اس نے کہا پھر وہ گویا کوئی رٹا ہوا سبق سنانے لگی۔ ''تمہیں جاننا چاہیے کہ میچ ریس عام ریس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ اس میں صرف دو گھوڑے ہوتے ہیں اور فاصلہ کم ہوتا ہے اس ریس میں صرف وہی گھوڑا جیت سکتا ہے جو آغاز میں ہی برتری حاصل کر لے۔''

''ایک منٹ، میرا خیال ہے کہ کسی نے تمہیں غلط مشورہ دیا ہے۔''

''مجھے کسی نے کوئی مشورہ نہیں دیا کیا یہ حقیقت نہیں کہ میچ ریس جیتنے کے لیے ابتدا میں ہی برتری حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مارشل بھی کم نہیں ہے۔''

''اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''جب گھوڑے کو آغاز میں ہی تیز رفتاری سے دوڑانے کی کوشش کی جائے تو اس کی ٹانگوں پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔ مارشل کا جسم نسبتاً بھاری ہے اور وہ ایک دم سے تیز نہیں دوڑ سکتا۔ اسے تیزی پکڑنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔''

''سینڈرا، یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا؟''

وہ میری بات کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔ ''جانتے ہو فلی نامی گھوڑے کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''پتا نہیں۔ یہ باتیں تم کہاں سے سن کر آئی ہو۔''

''فلی بھی مارشل کی طرح بھاری جسم والا گھوڑا تھا۔ اسے بھی ایک میچ ریس میں دوڑایا گیا تھا اور نتیجتاً اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔''

''وہ محض ایک اتفاق تھا۔''

''اسے اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف یہ تھی کہ ریس کے آغاز میں ہی جاکی نے اسے تیز دوڑانے کی کوشش کی تھی۔ اس غیر فطری کوشش کی وجہ سے گھوڑے کی ٹانگوں پر غیر ضروری بار پڑا اور وہ زندگی بھر کے لیے ناکارہ ہو گیا۔ عام ریس میں یہ حادثہ پیش نہ آتا۔''

اس کے اصرار پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو سینڈرا، تم ریس اور گھوڑوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتیں۔ اس لیے براہ کرم اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ، تم دولت اڑاؤ اور مجھے گھوڑے دوڑانے دو اوکے۔''

اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ کوئی شخص سینڈرا کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً میرے قریبی لوگوں میں سے تھا۔ جب میں نے مزید غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ سینڈرا نے مجھ میں دلچسپی لینی کم کر دی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ کسی دوسرے شخص میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ یہ بات میرے لیے کسی خوشی کا باعث نہیں تھی۔ گو

مجھے سینڈرا سے والہانہ محبت نہیں تھی لیکن بہر حال وہ میری بیوی تھی اور میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے دھوکا دے کر کسی دوسرے کی آغوش گرم کرے۔

سوال یہ تھا کہ اس کا بوائے فرینڈ کون تھا؟ فوری طور پر میرے ذہن میں دو نام آئے پہلا تو میرا ٹرینر کرٹ موبلے۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اچھے قد و قامت کا صحت مند آدمی تھا۔ پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کر چکا تھا اور بچہ کوئی نہیں تھا۔ گو اس کی شکل و صورت زیادہ پرکشش نہیں تھی۔ لیکن عمر میں مجھ سے دس سال چھوٹا تھا۔ دوسرا شخص میرا جاکی سٹکلف تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ کرٹ کے مقابلے میں زیادہ پرکشش تھا اور کنوارا بھی۔ سینڈرا کی عمر اس سے صرف دو سال کم تھی۔ مجھے زیادہ شک سٹ کلف پر تھا تاہم کرٹ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں کو سینڈرا سے ملنے کے مساوی مواقع حاصل تھے۔

میچ ریس کا دن قریب آتا جا رہا تھا اس لیے میں اس معاملے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ میرا زیادہ وقت ریس کی تیاریوں اور انتظامی امور کی نگرانی میں گزرتا تھا۔ مارشل کا ٹرینر کورٹ میری اس بات سے پوری طرح متفق تھا کہ گھوڑے کو شروع سے ہی تیز دوڑانا چاہیے۔ جیتنے کی یہی ایک بہتر صورت تھی لیکن جب جاکی سٹ کلف نے ہمارے فیصلے کی مخالفت کی تو مجھے خاصا تعجب ہوا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ریس کا آغاز اطمینان سے کرنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ پہلے پانچ چھ سو گز تک رائل چیلنج کو جھک مارنے دی جائے۔ اس کے بعد میدان ہمارے ہاتھ ہوگا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو کلف۔" میں نے کہا۔ "اگر رائل چیلنج کو شروع میں برتری حاصل ہو گئی تو پھر اسے پکڑنا مشکل ہوگا۔ تمہیں اسٹارٹ ہی سے زور لگانا ہوگا۔ ورنہ ہماری کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ مخالف پارٹی بھی ہم سے ایسی ہی بات کی توقع کر رہی ہے لیکن۔"

"انہیں ایسی توقع کرنی بھی چاہیے اس ریس میں کامیابی کا یہی ایک ذریعہ ہے بڑی بڑی تاریخی ریسوں کی مثال ہمارے سامنے ہے جو گھوڑا ابتدا میں ہی آگے نکل جاتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔"

"کیا تم مجھے ریس کا طریقہ بتا رہے ہو میں پورے تیرہ سال سے گھوڑے دوڑا رہا ہوں۔"

اس نازک موقع پر میں اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں صرف مشورہ دے رہا ہوں۔ کلف میرے علاوہ کرٹ کا بھی یہی خیال ہے کہ گھوڑے کو گیٹ سے ہی آگے رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اگر کرٹ یہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے بہتر جاکی ثابت ہو سکتا ہے اور میں اس کی خاطر دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔"

"یہ بات نہیں، ہم تم پر اپنی رائے مسلط کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ جہاں تک گھڑ سواری کا تعلق ہے اس میں تمہارا تجربہ ہم سے بہر حال زیادہ ہے۔ اس ساری بات چیت کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں ناکامی نہ ہو۔"

"اوکے میں تمہارے مشورے کو ذہن میں رکھوں گا۔"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ سٹ کلف خاصا ایکسپرٹ جاکی تھا اور ہر قسم کی ریس میں حصہ لے چکا تھا۔ البتہ میرے لاشعور میں تھوڑی سی الجھن ضرور تھی کیونکہ سینڈرا نے بھی کچھ اسی قسم کی بات کی تھی۔ ہمیں ریس کے سلسلے میں مختلف شہروں میں جانا پڑتا تھا اور سفر کے ان ہنگاموں کے دوران سینڈرا اور سٹ کلف کے درمیان تعلقات استوار ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی لیکن میں نے میچ سے پہلے اس معاملے کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں سٹ کلف کو پریشان کر کے مارشل کی کامیابی کو مشکوک نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سٹ کلف کے مقابلے کا جاکی ملنا بہت مشکل تھا۔

ریس ہفتے کے روز طے پائی تھی جمعہ کے روز ہم بذریعہ ہوائی جہاز کیلیفورنیا جانے کی تیاری کر رہے تھے صبح کے وقت کرٹ نے مجھے فون پر بتایا کہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

"مارشل کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یوں تو بالکل فٹ ہے۔ البتہ گزشتہ ہفتے اس کے ٹخنے میں معمولی سی سوجن کا پتا چلا تھا۔ جواب تقریباً ٹھیک ہو چکی ہے۔"

"زیادہ سیریس بات تو نہیں؟"

"نہیں، ہم ایک ہفتے سے اس کی مالش کر رہے ہیں۔ بالکل معمولی سی سوجن تھی تقریباً ٹھیک ہو چکی ہے کل صبح تک اس کا نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔"

"اوکے کرٹ۔" میں نے کہا۔ "ہم آج شام ہی پہنچ رہے ہیں۔"

اتفاق سے سینڈرا خوابگاہ کی اضافی لائن پر ہماری بات چیت سن رہی تھی۔ جب میں نے فون بند کیا تو وہ دندناتی ہوئی نشست گاہ میں آئی آتے ہی چیخنے لگی۔ "یہ مارشل کے ٹخنے پر سوجن کیسی ہے؟"

"پہلے تھی اب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم ہماری بات چیت سن رہی تھیں تو تم نے یہ بھی سنا ہوگا کہ ایک ہفتے سے گھوڑے کی مالش کی جا رہی ہے اور سوجن ٹھیک ہو چکی ہے۔"

"کرٹ نے یہ نہیں کہا کہ سوجن ٹھیک ہو چکی ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "اس نے کہا ہے کہ کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تو پھر اس میں تردد کی کیا بات ہے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ذرا سی سوجن کے سبب مقابلے سے دستبردار ہو جائیں؟ سوری اب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کرٹ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری مایوسی کے پیش نظر اس نے کھل کر بات نہیں کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ معاملہ معمولی سوجن سے بڑھ کر ہے۔"

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔ گھوڑا ایک مضبوط جانور ہے۔ معمولی تکلیف سے متاثر نہیں ہوتا۔ روزانہ درجنوں گھوڑے اس سے بھی خراب حالت میں ریس میں حصہ لیتے ہیں۔"

"ہمیں درجنوں گھوڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔" سینڈرا نے کہا۔ "ہمیں صرف اپنے گھوڑے کی فکر کرنی چاہیے۔ اوہ جان، تم بہت بدل گئے ہو تمہیں مارشل کا کوئی خیال نہیں ہے۔ تم صرف اپنی ضد پوری کرنا چاہتے ہو۔"

"دیکھو سینڈرا مجھ سے زیادہ مارشل کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور مجھ سے زیادہ کوئی اس کا خیال نہیں کر سکتا۔ میری ساری عمر گھوڑوں کی پرورش اور افزائش میں گزری ہے۔ اس معاملے میں تم میرے تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتیں۔ آج سے ایک سال پہلے تم گھوڑوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھیں۔ اگر تمہارے سامنے ٹریگریا فیٹلاک کا نام لیا جاتا تو تم آنکھیں جھپکا کر رہ جاتی تھیں۔ یقین کرو ہمارا گھوڑا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ نازک ہے لیکن شیشے کا بنا ہوا بھی نہیں ہے گھوڑے پیدا ہی دوڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے احساسات ایسے ہی ہیں تو تم گھر میں بیٹھو ریس نہ دیکھو۔"

"میں جاؤں گی ریس دیکھنے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"تو پھر ہنگامہ مت کرو۔"

"جان' ایک بات اچھی طرح سن لو' اگر مارشل ریس ہار گیا تو۔"

"تو کیا؟"

"تو...... تو میرے اور تمہارے تعلقات ختم ہوجائیں گے۔"

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"مطلب بالکل واضح ہے اگر مارشل ریس ہار گیا تو وہ دن ہماری ازدواجی زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

اس وضاحت کے باوجود میری حیرت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے حواس ٹھیک کام نہیں کر رہے ہیں کوئی عورت بقائمی ہوش و حواس ایسا فیصلہ نہیں کرسکتی۔"

"یہی بات تمہارے متعلق بھی کہہ سکتی ہوں۔ کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس ایک بہترین گھوڑے کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

"لیکن یہ علیحدگی والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اگر تمہیں مارشل کی کامیابی کا یقین ہے تو تمہیں میری بات سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر تم متذبذب ہو تو تمہیں مقابلے سے دستبردار ہونا چاہیے۔"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

"قطعی اور آخری۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "گو مارشل کی ناکامی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اگر انہونی ہوگئی تو یاد رکھو میں تمہیں اپنی جائیداد میں سے کچھ نہیں دوں گا۔ بخوشی الگ ہوجانا۔"

"جائیداد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔"

میں غصے میں بھرا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ اس سے سٹ کلف کے بارے میں جواب طلبی کرسکتا تھا مگر اس سے مزید بدمزگی پیدا ہوسکتی تھی۔ میرا ذہن پوری طرح ہفتے کے روز ہونے والی ریس میں الجھا ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک بار پھر اس معاملے کو وقتی طور پر ملتوی کردیا۔

دوپہر کے بعد ہم بذریعہ ہوائی جہاز لاس اینجلز پہنچ گئے۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی۔

میں نے سب سے پہلے مارشل کا معائنہ کیا اس کے ٹخنے پر معمولی سی سوجن باقی تھی۔ مگر وہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ریس سے دستبرداری کا اعلان کردیا جاتا۔ پھر وہ کوئی معمولی میچ ریس نہیں تھی۔ اسے نیشنل ٹیلی ویژن پر پورے امریکا میں دکھایا جارہا تھا۔ ریس کورس کی تمام سیٹیں ریزرو ہوچکی تھیں۔ کروڑوں ڈالر کی شرطیں لگ چکی تھیں۔ میں نے ریس کورس کے ویٹرنری ڈاکٹر کو مارشل کا ٹخنہ دکھایا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا کہ ٹخنے پر کوئی چوٹ لگی تھی۔ تاہم وہ اتنی شدید نہیں تھی کہ گھوڑے کو ریس میں شامل ہونے سے روک دیا جائے۔

بالآخر ریس کا دن آ گیا۔

آپ نے یقیناً اس ریس کو ٹی وی پر دیکھا ہوگا۔ بڑا زبردست مقابلہ تھا۔ تماشائیوں میں زبردست جوش و خروش تھا۔ لوگوں نے دونوں گھوڑوں بڑی رقمیں لگائی تھیں۔ رائل چیلنج پر ایک کے تین اور مارشل پر ایک کے چار روپے جارہے تھے۔ ہم یہ تاریخی میچ دیکھنے کے لیے اپنے باکس میں بیٹھے تھے۔ کرٹ گھوڑے پر زین کسنے کے بعد ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا چہرہ بظاہر بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ سینڈرا ابھی چپ چپ تھی۔ اس نے صبح سے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں

کا تاثر مختلف معلوم ہوتا تھا لگتا تھا کہ وہ اپنے اندرونی جوش کو چھپانے کی کوشش کررہی ہے لیکن اس وقت میری ساری توجہ ریس کے میدان کی طرف تھی۔

کچھ دیر بعد دونوں گھوڑے مقررہ جگہ پہنچ گئے۔ حاضرین نے پرجوش انداز میں تالیاں بجا کر اور شور مچا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ اکثر لوگ ہمارے باکس کے قریب آئے اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ان میں سے کچھ میرے جاننے والے تھے اور کچھ اجنبی لیکن میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ٹرینر کرٹ اور میری بیوی سینڈرا نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے بھی احتراز کررہے تھے۔

"کرٹ!" میں نے کہا۔ "کیا تم نے سٹ کلف سے بات کی ہے کہ وہ کس انداز میں ریس شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"اس نے کہا ہے کہ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

کرٹ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "سٹ کلف اپنے کام کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ کبھی ایسے گھوڑے پر ریس کھیلنا پسند نہیں کرتا جو اس کے خیال میں فٹ نہ ہو۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر گھوڑا موزوں نہ ہو تو ریس شروع ہونے سے دو منٹ پہلے زین سے اتر جایا کرتا ہے۔"

کرٹ کا انداز مجھے پسند نہیں آیا۔ گو مجھے مارشل پر یقین تھا مگر کوئی نامعلوم بات مجھے پریشان کررہی تھی۔ میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔ دونوں گھوڑے گیٹ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ تماشائیوں کا شور اپنے پورے عروج پر تھا۔

دوسرے ہی لمحے ریس شروع ہوگئی۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ واضح طور پر سٹ کلف نے ہمارے مشورے کی پروا نہیں کی تھی۔ ریس شروع ہوتے ہی رائل چیلنج نے تقریباً دو گز کی برتری حاصل کرلی میرے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔

"یہ سٹ کلف کیا کررہا ہے۔" میں نے کرٹ سے چیخ کر کہا۔

"کیا تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ شروع میں ہی گھوڑے کو تیز دوڑانا ہے۔"

"یہ بات اسے بھی معلوم ہے میچ ریس میں کامیابی کا سارا دارومدار اچھے اسٹارٹ پر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گھوڑے کا ٹخنہ اچھی طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔"

"کیا بکتے ہو گھوڑا بالکل ٹھیک ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے ریس ختم ہوجائے تو سٹ کلف سے پوچھ لینا۔"

مجھے یہ احساس ہورہا تھا کہ سٹ کلف زیادہ چابکدستی کا مظاہرہ نہیں کررہا تھا۔ رائل چیلنج کو بدستور برتری حاصل تھی۔ میرے چہرے پر بتدریج مایوسی طاری ہوتی جارہی تھی۔ میں نے آنکھ کے کنارے سے سینڈرا کی طرف دیکھا وہ نہایت سکون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا افسوس نہیں تھا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اس کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو اور کھیلو میچ ریس' دونوں گھوڑے نصف فاصلہ طے کرچکے تھے۔ میں نے دونوں مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور نظر مارشل پر جمی ہوئی تھی۔

دفعتاً یوں محسوس ہوا گویا مارشل کے جسم میں برقی رو دوڑ گئی ہے۔ اس کے جسم کو پر لگ گئے ہیں یا وہ نیند سے بیدار ہوگیا ہے۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند بڑھا۔ رائل چیلنج کے برابر آیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سے آگے نکل گیا۔ دو گز' تین گز' چار گز...... وہ برابر بڑھتا جارہا تھا۔ میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہوگیا اور چیخ کر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ سینڈرا ایک سیٹ پر ہی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی فاتحانہ چمک

غائب ہوچکی تھی اور چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ رائل چیلنج سرتوڑ کوشش کررہا تھا لیکن میرا مارشل ہوا میں اڑا چلا جارہا تھا۔

بالآخر جب وہ ہمارے سامنے اختتامی لائن پر پہنچے تو مارشل کی کامیابی کے لیے کسی آفیشل اعلان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ رائل چیلنج سے کم ازکم دس ہاتھ آگے تھا۔

میں پرجوش انداز میں سینڈرا کی طرف مڑا۔ اس توقع کے ساتھ کہ مارشل کی کامیابی نے اس کے چہرے کی رونق واپس اگئی ہوگی لیکن وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح اپنی نشست پر بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر اس کے منہ سے خوف اور حیرت کی ملی جلی آواز نکل گئی۔ اسی لمحے مجھے مبارک باد دینے والوں نے گھیرلیا۔ میں نے دوسری طرف نظر ڈالی تو کرٹ کہیں نظر نہیں آیا۔

اس وقت مجھے ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں دہری خوشی سے سرشار تھا۔ پہلی خوشی تو مارشل کے جیتنے کی تھی اور دوسری ایک لاکھ ڈالر کے انعام کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شائقین واپس چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ تب مجھے سینڈرا کا خیال آیا۔ اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ کرٹ بھی غائب ہوچکا تھا۔ دونوں کا رویہ خاصا ناقابل فہم تھا۔ انہوں نے اتنی بڑی کامیابی پر مجھے مبارک باد تک نہیں دی تھی۔ سٹ کلف مارشل کو لے کر اصطبل کی طرف جاچکا تھا۔ میں نے سوچا' سب سے پہلے تو مارشل کو تھپکی دینی چاہیے کیونکہ اصل کامیابی تو اس نے حاصل کی تھی۔ میں اصطبل کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو اندر سے سینڈرا کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ وہ کسی بات پر سٹ کلف سے الجھ رہی تھی۔ میں وہیں ٹھٹک گیا اور ان کی گفتگو سننے لگا۔ ''تم نے ساری اسکیم کا بیڑہ غرق کردیا ہے۔'' سینڈرا کہہ رہی تھی۔ ''تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ کھلا کھلا دھوکا کیا ہے۔ مم...... میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کرسکتی۔''

''یقین کرو سینڈرا میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔'' سٹ کلف نے کہا۔ ''شروع میں' میں نے گھوڑے کو کھینچ کر رکھا تھا۔'' یہ سنتے ہی میرے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے خلاف باقاعدہ سازش کی گئی تھی۔ سٹ کلف کہہ رہا تھا۔

''پھر نہ جانے کیا ہوا گھوڑا اچانک میرے قابو سے باہر ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے کو میں نہیں دوڑا رہا تھا گھوڑا مجھے دوڑا رہا تھا۔ میں نے اسے کھینچنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ بہرحال میں تمہارے پچیس ہزار ڈالر واپس دے دوں گا۔''

''ذلیل' کمینے۔'' سینڈرا غرائی۔ ''کرٹ نے جو ایک لاکھ ڈالر کی شرط لگائی تھی وہ کون واپس لوٹائے گا۔''

غصے سے میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ ساری اسکیم دو اور دو چار کی طرح واضح ہوگئی تھی۔ سینڈرا کا اصل عاشق کرٹ تھا۔ دونوں نے مل کر سٹ کلف کو پچیس ہزار ڈالر دیے تھے۔ اس شرط پر کہ وہ مارشل کو جیتنے نہیں دے گا۔ ادھر کرٹ نے رائل چیلنج پر ایک لاکھ کی شرط لگادی تھی۔ یعنی دونوں ایک تیر سے دوشکار کھیلنا چاہتے تھے۔ سینڈرا کو مجھ سے علیحدگی حاصل ہوجاتی اور کرٹ کو تین لاکھ ڈالر مل جاتے لیکن میرے وفادار گھوڑے نے دونوں کی امیدیں خاک میں ملادی تھیں۔

میں نے اس وقت اپنے مارشل پر اتنا فخر محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میرا سینہ کشادہ ہوگیا۔ اب رہ گئی سینڈرا' تو ظاہر ہے کہ میں اس سے علیحدگی اختیار کرنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔

❖

درندہ

انسانی اقدار اگر بدل جائے تو معاشرہ ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں بظاہر انسان رہتے ہیں لیکن ان کی خصلتیں درندوں سے بھی بدتر ہوجاتی ہیں۔ درندے اس وقت ہی کسی جانور کا شکار کرتے ہیں جب بھوک ان کی ہر حس پر غالب آجاتی ہے' ورنہ عام حالت میں وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن جب انسان درندہ بن جاتا ہے تو بلاوجہ اپنے جیسے انسان کو بھنبھوڑنا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے وہ کوئی جواز تلاش نہیں کرتا۔ جیسا کہ آج ہمارے پورے ملک خصوصاً کراچی کی گلیوں میں ہو رہا ہے۔ وہاں روزآنہ تشدد زدہ بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔ خودکش اور پلانٹڈ بم دھماکے ہوتے ہیں' جن میں درجنوں معصوم بچے' خواتین' بوڑھے اور جوان ہلاک ہوجاتے ہیں' نہ مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے' نہ مرنے والے کو کہ اسے کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان درندہ بن چکا ہے۔ درندگی خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے خورشیدہ پیرزادہ کی دلچسپ تحریر

سطر سطر تجسس لفظ لفظ ہنگامے لئے ایک طویل ناول

''ڈاکٹر یہ بچ تو جائے گا نا۔'' راجو نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''خون کافی بہہ چکا ہے بہت سیریس کنڈیشن ہے ہمیں فوراً آپریشن کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی کیجیے۔ مگر خدا کے لیے میرے دوست کو بچالیجیے۔''

مراد کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا اور باہر راجو اور نغمہ بے چینی سے آپریشن کی کامیابی کی دعائیں کرتے رہے۔

''تم آج رات پھر بھولو کے پاس گئی تھیں کبھی تو آرام سے بیٹھ جایا کرو۔'' راجو نے نغمہ کو ٹوکا۔

''نہیں راجو' میں نہیں گئی تھی' وہی مجھے لے گیا تھا۔'' نغمہ نے راجو کو پوری بات بتادی۔

''تو پھر تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کر بھولو کہاں گیا؟'' راجو نے پوچھا۔

''یہی سوچ کر تو میں بھی پریشان ہورہی ہوں میں تو گہری نیند میں تھی پتا نہیں کب باہر نکل گیا۔'' نغمہ نے جواب دیا۔

''ہوں' بھولو پر مجھے پھر سے شک ہونے لگا ہے۔''

''مجھے تو اس پر پہلے سے ہی شک تھا۔''

اسی وقت آپریشن تھیٹر سے ڈاکٹر باہر آیا۔ ''میں اپنی طرف سے جو کوشش کرسکتا تھا وہ کرچکا ہوں' ابھی بے ہوش ہے آپ لوگ دعا کریں۔''

''آپریشن تو کامیاب رہا نا ڈاکٹر صاحب۔'' راجو نے پوچھا۔

''ہاں آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ اب سب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے آپ دعا کریں۔''

تھوڑی دیر بعد مراد کو آئی سی یو میں شفٹ کردیا گیا۔

''تم فکر مت کرو' اسے ہوش آجائے گا۔'' نغمہ نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آج تم نے واقعی بہت اچھا کام کیا ہے نغمہ تم مجھے وقت پر فون نہ کرتیں تو استاد کا بچنا مشکل ہی تھا۔" راجو نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔

"یہ تو میرا فرض تھا راجو اب میں اتنی بھی بری نہیں ہوں۔"

"ارے پگلی میں نے یہ کب کہا کہ تم بری ہو چلو کچھ چائے وغیرہ پی کر آتے ہیں۔" راجو نے کہا۔

کیفے ٹیریا میں چائے پینے کے بعد راجو اور نغمہ واپس آئی سی یو کے باہر آگئے اور رات آہستہ آہستہ اپنی منزل طے کرتی جا رہی تھی صبح کے ساڑھے سات بجے ہوں گے جب ایک نرس آئی سی یو سے باہر نکلتی دکھائی دی۔

"سسٹر میرے دوست کو ہوش آ گیا کیا۔" راجو نے پوچھا۔

"ہاں ابھی ابھی اس نے آنکھ کھولی ہے میں ڈاکٹر کو بتانے جا رہی ہوں۔"

یہ سن کر راجو اور نغمہ کے چہروں پر خوشی اور سکون کا احساس پھیل گیا۔

"تمہاری وجہ سے استاد کی جان بچی ہے اب تو تجھے خوش کرنا ہی پڑے گا۔" راجو نغمہ کو بانہوں میں لیتا ہوا بولا۔ وہ خوشی سے جھومے جا رہا تھا۔

"شش، سسٹر دیکھ رہی ہے۔" نغمہ نے دھیان دلاتے ہوئے کہا۔

"اوہ، خیال نہیں رہا۔" راجو اسے چھوڑتا ہوا بولا اور نرس سر ہلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ڈاکٹر نے مراد کی حالت چیک کی اور باہر آ کر راجو سے کہا۔ "اب تمہارا دوست خطرے سے باہر ہے۔"

ڈاکٹر کی طرف سے امید افزا خبر سن کر راجو نے فوراً خدا کا شکر ادا کیا۔

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں۔"

"نہیں یہ پولیس کیس ہے پہلے پولیس ا
بیان لے گی اس کے بعد تم اس سے مل سکتے ہو

"میں سب انسپکٹر ریاض حسین ہوں میں خود ا
کا بیان لوں گا۔" راجو نے بتایا۔

"اوہ۔ اگر یہ بات ہے تو آپ ضرور اس س
سکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے پولیس وا
بعد میں آ کر اعتراض کرتے ہیں۔"

"ڈونٹ وری ڈاکٹر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" را
نے کہا۔

راجو نغمہ کا ہاتھ پکڑ کے آئی سی یو میں مراد کے پا
آ گیا۔

"استاد یہ تم دارو پیتے پیتے کس چکر میں پھن
گئے تھے کہ تمہاری یہ حالت ہوگئی۔" راجو
مسکراتے ہوئے مراد سے پوچھا۔

"پوچھ مت یار کل کی رات بہت بھیانک
میرے لیے ایک منٹ کے لیے ذرا نغمہ کو باہر
دو۔" مراد نے کہا۔

"نغمہ نے ہی تمہاری جان بچائی ہے استاد
اس کا شکریہ تو ادا کر دو۔" یہ کہہ کر راجو نے مراد کو پو
بات بتائی۔

مراد نے نغمہ کو پاس بلا کر کہا۔ "تمہارا بہت بہ
شکریہ نغمہ تم نے واقعی بہت سمجھداری سے کام لیا۔"

"شکریہ کس بات کا میں نے تو اپنا فرض
ہے۔ تم دونوں بات کرو میں باہر انتظار کرتی ہوں۔"
یہ کہہ کر نغمہ باہر نکل گئی۔

نغمہ کے جانے کے بعد مراد نے راجو کو بابو کے
سے لے کر اس درندے سے مقابلے تک کی پو
داستان سنادی۔

"استاد ایک ایک کر کے تمہارے دوست اوپر اٹھ رہے ہیں میرا کیا ہوگا؟" راجو منہ بنا کر بولا۔

"یہ سب اتفاق ہے۔"

"تم نے اچھا کیا کہ اس درندے کو بھی خنجر گھونپ دیا اسے کم از کم احساس تو ہونا چاہیے کہ کسی کے جسم میں خنجر گھستا ہے تو کیسا درد محسوس ہوتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے اسے بھی بہت گہرا زخم آیا ہوگا اور شاید وہ بھی اس وقت کسی ہسپتال میں اپنا علاج کروا رہا ہو۔" مراد نے خیال پیش کیا۔

مراد کی بات سنتے ہی راجو نے فوراً اپنا موبائل نکالا اور انسپکٹر کو فون لگایا۔ اس نے چوہان کو مراد اور قاتل کی مڈبھیڑ کے بارے میں بتایا۔

"سر اسے بھی خنجر کا زخم آیا ہے ہو نہ ہو وہ بھی کسی ہسپتال میں ہوگا۔ ہمیں شہر کے ہر اسپتال اور کلینک کو چیک کرنا چاہیے۔"

"واہ برخوردار تم تو ابھی سے کام سیکھ گئے میں ابھی الگ الگ ٹیمیں بھیجتا ہوں تم اسی اسپتال میں چیک کرو۔" چوہان نے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے سر ایک دو سپاہی یہاں بھیج دیں جو یہاں میرے دوست کے کمرے کے باہر رہیں۔" راجو نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھیجتا ہوں کم از کم ایک تو بھیج ہی دیتا ہوں باقی کی ڈیوٹی اسپتالوں کی چیکنگ پر لگانی ہے۔"

"ایک بھی چلے گا میں تو ہوں ہی یہاں، میں اسپتال میں چیک کروں گا تو وہ یہاں موجود رہے گا۔" راجو بولا۔ اس کے بعد راجو مراد سے مخاطب ہوا۔

"استاد تم آرام کرو میں اس اسپتال کو چیک کرتا ہوں کیا پتہ وہ بھی یہیں آیا ہو۔"

"وردا کیسی ہے؟" مراد نے پوچھا۔

"وردا میڈم کے بارے میں تو بتانا ہی بھول گیا وہ اپنے گھر چلی گئی ہے۔" یہ کہہ کر راجو نے مراد کو بھی ساری بات سے آگاہ کردیا۔

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا یار میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔" مراد نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچھا ہی ہوا او کے بعد میں بات کرتے ہیں۔"

کمرے سے باہر آ کر نغمہ کو گھر جانے کا کہہ دیا اور نغمہ ایک رکشہ لے کر گھر کی طرف چلی گئی۔ گھر پہنچ کر نغمہ نے تالا کھولا اور چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

"بہت خوب' مجھے یہاں تالے میں بند کر کے بہت اچھا کیا آپ نے۔" سحرش نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم جاگ گئیں سوری مجھے باہر سے تالا لگا کر جانا پڑا۔"

"اور یہ تالا لگا کر آپ کس کے ساتھ گئی تھیں۔ راجو کے ساتھ یا مراد کے ساتھ؟" سحرش نے نغمہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں۔ بھولو لے گیا تھا مجھے۔"

"چھی' وہ بھولو حوالدار اس کی شکل دیکھی ہے آپ نے ایسا بھی کیا کہ آپ ہر کسی کے ساتھ چل دیتی ہیں۔" بھولو کے ذکر پر سحرش گھن کھاتی ہوئی بولی۔

"میرے معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ جو میری مرضی میں آئے گا کروں گی تم اپنے کام سے کام رکھو اور اس وقت میں اسپتال سے آ رہی ہوں کسی کے گھر سے نہیں۔"

"اسپتال...... وہ کیوں؟" سحرش چونکتے ہوئے بولی۔

سحرش کے پوچھنے پر نغمہ نے اسے مراد کے بارے میں بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے ابھی مجھے کالج کے لیے تیار ہونا ہے۔" یہ کہہ کر سحرش واش روم میں گھس گئی۔

"کالج کے لیے تیار ہونا ہے ہونہہ خود پتہ نہیں کیا کرتی ہوگی کالج میں اور مجھے نصیحت کرتی ہے۔" نغمہ اس کی نقل کرتے ہوئے غصے سے بڑبڑائی۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو نے پورا اسپتال چھان مارا اور مریضوں کا رجسٹر بھی چیک کیا مگر اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو وہاں اپنے پیٹ کا آپریشن کروانے آیا ہو۔ چوہان نے جو ٹیمیں مختلف اسپتالوں اور کلینکس میں بھیجی تھیں انہیں بھی ایسا کوئی شخص نہیں ملا۔

"اگر اسے خنجر لگا تھا تو وہ گیا کہاں؟ کیا گھر پر ہی آپریٹ کروا رہا ہے' واقعی بہت شاطر ہے یہ قاتل۔" راجو اپنے ہی خیالوں میں بڑبڑانے لگا۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ مراد کی حالت میں دھیرے دھیرے بہتری آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا تھا۔

"راجو تم بھی گھر جا کر آرام کرو کب تک یہاں بیٹھے رہو گے رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔"

"اس قاتل کا کچھ پتہ نہیں چلا استاد آخر وہ اپنا پیٹ سلوانے کہاں گیا ہوگا۔" سوچوں کی وجہ سے راجو کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

"چلو اب کچھ دن تو وہ کسی کو مارنے کی ہمت نہیں کرے گا پیٹ جو پھاڑ دیا ہے میں نے اس کا۔" مراد ہنس کر بولا۔

"یہ تو ہے' بیٹھا ہوگا کہیں سر پکڑ کے' سوچ رہا ہوگا کہ کس سے پالا پڑ گیا۔"

"آہ......" اچانک مراد کراہ اٹھا۔

"کیا ہوا استاد۔" راجو نے پوچھا۔

"یار یہ جو ہاتھ میں سرنج لگی ہوئی ہے۔ اس سے بہت درد ہو رہا ہے۔"

"ڈرپ کی سرنج ہے نا یہ؟"

"ہاں۔"

"ٹھہرو میں کسی نرس کو بلاتا ہوں۔" راجو یہ کہہ کر باہر نکلا اور چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھوڑا آگے چلا گیا۔

"شاید اس کمرے میں کوئی نہ کوئی نرس مل جائے۔" راجو نے ایک کمرے کے باہر آ کر سوچا' جس پر "ریسٹ روم فار اسٹاف" کا بورڈ لگا ہوا تھا' راجو کمرے میں داخل ہوا اور نرس کو دیکھ کر بولا۔

"میرے دوست کے ہاتھ میں جو سرنج لگی ہے وہ درد کر رہی ہے۔ ذرا آ کر دیکھ لیں۔" راجو نے مدعا بیان کیا۔

"ٹھیک ہے میں آتی ہوں تم جاؤ۔"

"ابھی چلیں وہ بہت پریشان ہو رہا ہے۔"

"چلیے میں آپ کے دوست کو دیکھ لیتی ہوں۔" نرس یہ کہتے ہوئے راجو کے ساتھ چلی آئی۔

کمرے میں آ کر نرس نے سرنج چیک کی۔

"سرنج ٹھیک ہے مگر درد رہے گا آپ زیادہ ہاتھ ہلانے سے پرہیز کریں۔" نرس نے مراد سے کہا۔

"کیا اسے نکال نہیں سکتے۔"

"نہیں یہ ڈرپ ضروری ہے آپ کے لیے۔"

"کوئی بات نہیں استاد ہاتھ کو مت ہلاؤ آہستہ آہستہ درد کم ہو جائے گا۔"

"چلو۔ تم اب جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"باہر ایک سپاہی موجود ہے۔ فکر مت کرنا۔"

راجو نے اسپتال کے کیفے ٹیریا میں آ کر چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پیتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا' راجو کو وہی نرس دوبارہ نظر آئی تو اس نے مراد کے بارے میں پوچھا تو وہ راجو کو لے کر مراد کے پاس آ گئی۔

کمرے میں آ کر نرس نے مراد کو ایک اور ڈرپ چڑھائی۔ مراد ابھی بھی گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ نرس مراد کو چیک کر کے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

رات کرسی پر گزارنے کے بعد صبح کو راجو نے چوہان کا نمبر ملایا۔ "سر وہ بھولو حوالدار آج ڈیوٹی پر آیا تھا کیا؟"

"نہیں وہ تو نہیں آیا کیوں؟"

"ویسے ہی پوچھ رہا تھا کوئی خاص بات نہیں۔"

"اچھا تم ایسا کرو فوراً تھانے آ جاؤ سب انسپکٹر وحید ملک اپنی بہن کی شادی میں گاؤں گیا ہوا ہے اور کام بہت زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے سر میں ابھی پہنچتا ہوں۔" فون کے بعد راجو نے کمرے کے باہر موجود سپاہی کو کچھ ہدایات دیں اور تھانے روانہ ہو گیا۔

"راجو ہمیں کسی بھی طرح اس خاتون کا پتہ لگانا ہوگا جو اس رات سہیل کے ساتھ تھی۔" تھانے پہنچنے پر چوہان نے راجو سے کہا۔

"بالکل سر آپ بولیں مجھے کیا کرنا ہے۔"

"یہ نمبر تھا تو سہیل کے نام پر مگر استعمال وہ خاتون کرتی تھی وہ کہیں نہ کہیں سے ایزی لوڈ بھی ڈلواتی ہوگی اور ہو نہ ہو ایک خاتون ہونے کے ناتے وہ اپنے گھر کے آس پاس سے ہی ایزی لوڈ کی سہولت

"حاصل کرتی ہوگی۔" چوہان نے پرسوچ لہجے میں کہا۔
"سمجھ گیا سر ابھی اس نمبر کے موبائل آپریٹر سے ساری معلومات حاصل کرتا ہوں۔"
"تم بہت اچھے انداز سے اپنا کام انجام دے رہے ہو اسی لیے میں یہ ذمہ داری تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔"
"آپ فکر نہ کریں سر میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔" راجو نے کہا۔
تھانے سے نکل کر راجو سیدھا مراد کی خیریت معلوم کرنے دوبارہ اسپتال پہنچا اور مراد کو ہوش میں دیکھ کر اسے بھی فون اور ایزی لوڈ والی بات بتادی۔
"یار راجو تم تو پکے پولیس والے بنتے جارہے ہو۔" مراد نے تعریفی نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اوئے استاد اب مجھے گھسامت شروع کردینا میں تو بس۔" راجو ایک دوسری نرس کو اندر آتا دیکھ کر چپ ہوگیا۔
نرس نے مراد کی ڈرپ تبدیل کی کمرے سے چلی گئی۔
"یار راجو یہ بتاؤ تمہیں پیار ہوا ہے کبھی؟" مراد نے خیالوں میں کھوتے ہوئے کہا۔
"میں پہلے پیار ویار کے جھنجٹ میں نہیں پڑتا تھا مگر اب یہ مرض مجھے بھی لاحق ہوگیا ہے۔"
"تو تمہیں وردا سے پیار ہوگیا ہے۔" مراد نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہ پیار کرنے لائق ہیں۔ مگر میرا ان کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔"
"مطلب یہ کہ اگر وردا راضی ہوجائے تو تم اس کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کے لیے تیار ہو سکتے ہو۔"
یہ سن کر راجو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور وہ گہرے خیالوں میں کھو گیا۔
"ابے کیا ہوا میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔"
"استاد تم سے ایک مودبانہ درخواست ہے۔ وہ یہ کہ وردا جی کے بارے میں ایسی باتیں مت کیا کرو۔"
"اور یہ پیار تو نہیں۔" مراد بھی اس کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔
"میں کیوں بتاؤں تم مجھے باتوں میں الجھا رہے ہو ویسے یار میں لیٹ ہورہا ہوں۔" راجو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"بس ایک بات اور پوچھنی ہے؟"
"ہاں جلدی بولو؟"
"مجھے ایسا لگتا نہیں بلکہ سو فیصد یقین ہے کہ مجھے پیار ہوگیا ہے۔"
مراد کی بات سن کر راجو لوٹ پوٹ ہونے لگا۔
"پیار اور تمہیں..... کون بدنصیب ہے وہ؟"
"اب تم لیٹ نہیں ہورہے ہو کیا۔" مراد اسے بھگانے کی غرض سے بولا۔
"چلا جاؤں گا' مگر بتادو نا کون ہے وہ؟"
"سحرش۔"
"سحرش؟" راجو کے لہجے میں حیرت تھی۔
"ہاں سحرش' اب میرے دل میں بس وہی ہے یار' اسے کسی طرح میری حالت کے بارے میں اطلاع کردو' کیا پتہ دیکھنے آہی جائے۔" مراد کے لہجے میں محبوب سے دوری کا دکھ واضح تھا۔
"وعدہ نہیں کرتا کیونکہ تم جانتے ہو کہ وہ کتنی سرپھری لڑکی ہے ہاں کوشش کرتا ہوں' اب مجھے دو اجازت کیونکہ میں نے ڈیوٹی بھی انجام دینی ہے اپنا خیال رکھنا اور کوئی بھی اہم بات ہو تو باہر سپاہی موجود

ہے اسے بتادینا اوکے۔"
"میرے لیے صرف سحرش اہم ہے تم کسی طرح اسے ایک بار ہی بھجوادو۔"
"اوکے دیکھتا ہوں کہ اس معاملے میں کیا ہوسکتا ہے۔" یہ کہہ کر راجو وہاں سے باہر نکل گیا اور مراد کی نظریں دروازے پر گڑی رہ گئیں۔
راجو نے اپنی پولیس جیپ اسٹارٹ کی اور اسپتال سے باہر آکر سوچا۔
"تھانے جانے سے پہلے بھولو حوالدار کی خبر لینی چاہیے اور اسی بہانے استاد کا کام کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔"
بیس منٹ بعد راجو' بھولو کے گھر کے باہر موجود تھا۔ اس کے گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا اس لیے راجو کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ بھولو اس وقت گھر میں ہی ہے۔ اس نے جیپ سے اتر کر دروازے پر دستک دی۔
بھولو نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنے اوپر ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔
"اوہ راجو صاحب۔" وہ چونک کر بولا۔
"زیادہ ڈرامے بازی مت کرو اور یہ بتاؤ کہ تم کہاں تھے رات کو نغمہ کو اکیلا چھوڑ کر کہاں غائب ہوگئے تھے تم' سچ سچ بتانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"
"میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا تھا۔ ضروری کام تھا۔" بھولو نے کہا۔
"اتنی رات کو کون سا ضروری کام پڑ گیا تمہیں' یہ چادر ہٹا کر مجھے اپنا پیٹ دکھاؤ۔"
"بات کیا ہے سر۔"
"بس جتنا کہا ہے اتنا کرو۔"
بھولو نے چادر ہٹائی اور بنیان اوپر کر کے اپنا پیٹ دکھایا۔ اس کے پیٹ پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔
"اب تو بتادیں کہ کیا بات ہے سر؟" بھولو نے پھر پوچھا۔
"کچھ نہیں تم تیار ہوکر جلدی تھانے آجاؤ۔ چوہان صاحب کہہ رہے تھے کہ کام کا لوڈ بہت زیادہ ہے۔"
"ٹھیک ہے سر میں ابھی پہنچتا ہوں۔" بھولو نے کہا۔
بھولو سے نمٹ کر راجو کو سحرش کا خیال آیا اور وہ اس کے گھر کی طرف بڑھا نغمہ اسے گھر کے باہر ہی مل گئی۔
"نغمہ تمہاری بہن سحرش ہے کیا گھر میں؟"
"کیوں تمہیں اس سے کیا کام پڑ گیا؟" نغمہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔
"بس ہے ایک کام ابھی نہیں بتا سکتا۔"
"میں نے کہا تھا نا کہ میری بہن سے دور رہو۔"
"ارے وہ بات نہیں ہے ایک اور کام ہے۔"
"وہ کالج گئی ہے۔" نغمہ روکھے لہجے میں بولی۔
راجو کے لیے اس کا انتظار کرنا فضول تھا۔ اس نے سوچا سحرش سے تو بعد میں بھی ملا جاسکتا ہے۔
"اب بتاؤ گے بھی کہ کیا بات ہے؟"
"کوئی خاص بات نہیں ہے میں چلتا ہوں ابھی ڈیوٹی کے لیے لیٹ ہورہا ہوں۔"
یہ کہہ کر راجو نے نغمہ سے جان چھڑائی اور وہاں سے نکل گیا۔
تھانے پہنچ کر اس نے جیپ ایک طرف کھڑی کی اور خود چوہان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ چوہان اسے اپنے کمرے کے باہر ہی مل گیا۔
"اچھا ہوا کہ تم آگئے ڈی ایس پی میڈم بہت غصے میں ہیں' یار بار بار بے بات مجھے ڈانٹ پڑ

رہی ہے ہمیں اس کیس کو جلد سے جلد حل کر کے اپنی جان چھڑانی ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں سر ایک بات پوچھ سکتا ہوں سر؟" راجو نے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"سہیل نے جھوٹا بیان کیوں دیا تھا؟"

"وہی تو سمجھ میں نہیں آرہا' وہ رات کے کوئی ڈھائی بجے کے لگ بھگ تھانے آیا تھا اور اس نے خود کہا کہ میں نے ایک لڑکی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کے ساتھ ایک نقاب پوش بھی تھا اس کا کہنا ہے کہ اس نے لڑکی اور نقاب پوش کو للکارا بھی تھا لیکن وہ کار چھوڑ کر جنگل میں بھاگ گئے وہی ہمیں موقعہ تک لے گیا جہاں ہم نے وردا کی کار اپنے قبضے میں لی کار اور کار میں ملنے والے پرس کی تلاشی کے بعد پتہ چلا کہ کار وردا چلا رہی تھی اس طرح سے سارا الزام وردا پر آ گیا اور پتہ نہیں کیسے میڈیا والوں کو بھی معلوم ہو گیا یوں یہ بات پھیلتی چلی گئی یہ ہے ساری بات۔" چوہان نے ساری تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... مطلب یہ کہ سارے تار سہیل سے ہی جڑے ہوئے ہیں پھر تو اس خاتون کو ڈھونڈنا بہت ضروری ہے شاید اسے کچھ پتا ہو۔" راجو گہری سوچ میں تھا۔

"سہیل کی ایک بہن بھی ہے سونیا نام ہے اس کا' اس سے بھی پوچھ تاچھ کرنی ہوگی۔"

"بالکل سر یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اس نے جھوٹا بیان کیوں دیا اور کس کے کہنے پر دیا جس کے کہنے پر اس نے یہ سب کیا وہی وہ درندہ ہے۔" راجو یقین سے بولا۔

"تمہاری تفتیش بالکل صحیح رخ پر جا رہی ہے برخوردار اس سے پہلے کہ میڈم قیامت میری جان لے لیں یہ کیس ہمیں حل کرنا ہی ہوگا۔"

ابھی راجو اور چوہان یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی تیزی سے ان کی طرف آیا۔

"سر ٹی وی پر اس درندے کی خبر آرہی ہے۔"

"اب وہ کیا دکھا رہے ہیں؟" چوہان نے کہا۔

"اس لڑکی کا انٹرویو دکھا رہے ہیں جن کی پہلے ہمیں تلاش تھی۔"

"اچھا تو اب یہ میڈیا والے مزید کسی مصالحے کی تلاش میں وردا جی تک جا پہنچے ہیں۔" راجو بولا۔

"چلو پہلے یہ خبر دیکھتے ہیں پھر نکلتے ہیں اپنے اپنے کام پر۔"

"جی سر چلیے۔"

ٹی وی اینکر اپنے سنسنی خیز انداز میں ہی ہر بات پیش کر رہا تھا۔

"پتا نہیں یہ میڈیا والے کہاں سے یہ سب خبریں نکال لاتے ہیں۔ چلو راجو لگ جائیں اپنے کام سے یہ سب تو چلتا رہے گا۔" چوہان بولا۔

"تو پھر چلیں۔"

چوہان نے کہا کہ وہ سہیل کی بہن سے معلومات کے لیے جا رہا ہے راجو بھی اپنی تفتیش کے لیے نکل پڑا۔

کچھ ہی دیر میں چوہان سہیل کی بہن سونیا کے گھر کے باہر کھڑا تھا صبح کے دس بج رہے تھے۔ چوہان نے دروازے پر لگی بیل کا بٹن دبایا۔

بیل کی آواز سنتے ہی سونیا ہڑبڑا کر شاور بند کر کے بجلی کی سی تیزی سے بیڈروم میں آئی۔

"اٹھو...... کوئی بیل بجا رہا ہے...... جلدی اٹھو۔" سونیا بولی۔

"تمہارا گھر ہے تم جا کر دیکھو میں جاؤں گا تو کوئی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"بے وقوف میں دروازہ کھولنے کو نہیں کہہ رہی ہوں جلدی کہیں چھپ جاؤ۔"

"اب یہ کون آ گیا؟"

"اوہ ہو نوریز دیکھ کر ہی بتاؤں گی نا تم کہیں چھپ جاؤ جلدی کرو۔"

"ٹھیک ہے یار جو کوئی بھی ہو جلدی سے اسے چلتا کر کے آؤ ابھی تو سارا دن ہے ہمارے پاس۔"

ادھر چوہان بیل بجا بجا کر تھک گیا۔

"کہاں ہیں گھر کے سب لوگ کوئی دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔" چوہان کو غصہ آ رہا تھا۔

اسی وقت سونیا نے دروازہ کھولا باہر پولیس کی وردی میں چوہان کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رہ گئی۔

"کہیے کیا بات ہے۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ ہی سونیا ہیں؟"

"جی ہاں بولیں۔ کیا بات ہے۔"

"مجھے آپ کے بھائی سہیل کے بارے میں کچھ تفتیش کرنی ہے کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔"

"جی بالکل آئیے۔"

چوہان نے اندر آ کر بغور گھر کا جائزہ لیا۔

"آپ نے دروازہ کھولنے میں بہت دیر لگا دی۔"

"وہ...... وہ میں نہا رہی تھی۔"

"آپ گھبرائیں مت میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" چوہان اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

چوہان کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ بیڈروم سے نوریز باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ وہ صرف شارٹس اور بنیان پہنے ہوئے تھا اس کا خیال تھا کہ جو کوئی بھی آیا تھا اب تک سونیا نے اسے چلتا کر دیا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں پولیس انسپکٹر کو دیکھتے ہی نوریز کی پھوک سرک گئی اور سونیا کی حالت تو اس سے بھی زیادہ گئی گزری ہو رہی تھی۔

"یہ کون ہے سونیا جی۔" چوہان نے نوریز کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ میرے شوہر کے دوست ہیں۔" سونیا نے اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی نوریز۔" نوریز نے جواب دیا۔

"اچھا آپ کے شوہر کہاں ہیں انہیں بلائیں۔" چوہان نے کہا۔

"وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں کل شام کو لوٹیں گے۔" سونیا نے کہا۔

"واہ بھئی میاں گھر نہیں آپ کو کسی کا ڈر نہیں' تو یوں کہیں نا کہ شوہر کے پیٹھ پیچھے گل چھرے اڑائے جا رہے ہیں۔" چوہان ہنسے۔

نوریز فوراً بیڈروم میں گیا اور کپڑے پہن کر باہر آیا۔ "تھینک یو سونیا کہ کل رات آپ نے مجھے یہاں رکنے دیا اب میں چلتا ہوں بعد میں ملتے ہیں۔"

"او کے کچھ کھا کر جاتے تو اچھا تھا۔" سونیا نے مہمانداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی میں بہت لیٹ ہو رہا ہوں۔" نوریز یہ کہہ کر چوہان سے نظریں بچاتا ہوا باہر چلا گیا۔

"یہ میرے سامنے کیا ناٹک ہو رہا ہے۔" چوہان خشمگیں لہجے میں بولا۔

"یہ ناٹک نہیں ہے وہ میرے شوہر کا بہت اچھا دوست ہے کل رات گئے لاہور سے آیا ہے اسے نہیں

پتا تھا کہ میرے شوہر گھر پر نہیں ہیں میں نے اسے یہیں سونے کے لیے اپنا بیڈروم دے دیا تھا کیونکہ شہر کے حالات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ رات کے وقت ایک دہشت کا عالم ہوتا ہے۔" سونیا نے کہانی بناتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی اپنے بیڈ روم میں ہی سوئی تھیں؟" چوہان گھور کر بولا۔

"آپ جو جاننا چاہتے ہیں وہ پوچھیں میری نجی زندگی سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے؟"

"مطلب تو کہیں نہ کہیں سے نکل ہی آتا ہے سونیا جی، کہیں بھی کبھی بھی کوئی کسی بھی بات کا کوئی بھی مطلب نکال سکتا ہے۔" چوہان کی زبان چلنے لگی۔

"آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"ایک گلاس پانی ملے گا بہت پیاس لگی ہے۔" چوہان اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

سونیا نے چوہان کو گھور کر دیکھا اور بولی۔ "ابھی لاتی ہوں۔"

سونیا جب پانی لانے کے لیے چلی تو چوہان اس کی مستانی چال میں کھو سا گیا تھوڑی دیر میں سونیا پانی لے آئی اور پانی لیتے وقت بھی چوہان کے دل میں یہی بات تھی کہ اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔

"اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے بھائی نے وردا شمسی کے خلاف جھوٹی گواہی کیوں دی۔" چوہان نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔ "اسے وردا کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ کیونکہ اس موضوع پر میری سہیل سے زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔" سونیا نے کہا۔

"کچھ تو معلوم ہوگا آپ دیکھیں سہیل نے یہ سب کسی کے کہنے پر ہی کیا ہے کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ ایسا کون شخص ہے جو سہیل سے یہ کام کروا سکتا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا آپ یہاں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔" سونیا بولی۔

"او کے، ایک کام کریں مجھے سہیل کے سارے دوستوں کے نام پتے دے دیں شاید کچھ بات بن جائے۔"

"اب میں اس کے سارے دوستوں کو تو نہیں جانتی کچھ کا مجھے پتہ ہے لیکن ان کے ایڈریس بھی مجھے معلوم نہیں ہیں۔"

"سہیل کا کسی لڑکی کے ساتھ افیئر بھی تھا کیا؟" چوہان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری نالج میں تو نہیں ہے۔"

"لیکن آپ کا افیئر ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ کیوں؟ کیا ابھی آپ کے شوہر سے بات ہو سکتی ہے۔"

"کس بارے میں؟" سونیا گھبرا کر بولی۔

"جاننا چاہتا ہوں کہ نوریز ان کا کتنا اچھا دوست ہے۔" چوہان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"اس کا آپ کے کیس سے کیا واسطہ۔"

"واسطہ ہے مگر آپ نہیں سمجھیں گی، چلو آج نہیں تو کل بات کرلوں گا ان سے۔"

"آپ ان سے نوریز کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے انہیں برا لگے گا میں نے ان سے پوچھے بنا نوریز کو یہاں روک لیا تھا۔"

چوہان سونیا کے نزدیک آیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

"تم نے انجوائے کیا تھا؟"

"پلیز اپنا ہاتھ ہٹالیں میری پیٹھ سے۔"

"جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔" چوہان نے

سخت انداز میں کہا۔

"ہاں۔" مختصر سا جواب۔ "اپنا ہاتھ ہٹالیں پلیز۔"

"کیوں میرا ہاتھ اچھا نہیں لگ رہا تمہیں یا میرا ساتھ اچھا نہیں لگ رہا۔"

سونیا آگے بڑھ کر چوہان سے دور ہٹ گئی۔ "کل شام میرے شوہر سے مل لینا۔" سونیا جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہ تو ملوں گا ہی مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا میرا ساتھ چاہیے یا نہیں؟"

سونیا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی چوہان کھڑا ہو کر سونیا کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو نے مطلوبہ موبائل فون کمپنی سے اس موبائل نمبر کی ساری تفصیل نکلوالی تھی۔ اس نے کمپنی سے ملنے والے ریکارڈ کو غور سے دیکھا۔ زیادہ تر ایک ہی دکان سے پیسے ڈلوائے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد راجو مطلوبہ دکان پر پہنچ گیا یہ ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ جہاں ایزی لوڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔

"جناب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ نمبر کس کا ہے۔" راجو نے دکان میں موجود لڑکے سے پوچھا۔

"نمبر لے کر آپ گھوم رہے ہیں تو آپ ہی کو پتا ہوگا کہ یہ نمبر کس کا ہے۔" لڑکے نے ایک گاہک کو نمٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"ذرا دھیان سے بچے تم اس وقت ایک پولیس والے سے مخاطب ہو جلدی سے نمبر کے بارے میں بتا دو ورنہ۔" راجو نے پولیس والا اسٹائل اپناتے ہوئے کہا۔

"سوری سر۔" پولیس کا سن کر لڑکا ڈھیلا پڑ گیا۔

"پہلے بتا دیتے نا یہ نمبر...... یہ نمبر...... ارے ہاں یہ تو مینا باجی کا ہے۔"

"کون مینا اور یہ مینا کون سے درخت کے گھونسلے پر رہتی ہے۔" راجو نے اپنا انداز ہلکا کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا سر؟" لڑکے نے پوچھا۔

"تم اس کا پتا بتاؤ اب خاص بات ہے یا نہیں اس سے تمہیں کیا۔"

"سوری مینا باجی کا گھر نزدیک ہی ہے۔ چلیں میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جلدی چلو۔" راجو اتنی جلدی کامیابی ملنے پر بہت خوش بھی ہو رہا تھا اور اس مینا سے ملنے کو بے تاب بھی۔

اس لڑکے نے اسٹور میں موجود دوسرے لڑکے سے کچھ کہا اور راجو کے ساتھ جا کر اسے مینا کا گھر دکھا دیا۔

راجو نے لڑکے کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کیا اور گھر کی ڈور بیل بجائی۔ دروازہ مینا نے ہی کھولا۔

"جی کہیے؟"

"کیا آپ ہی مینا ہیں؟" راجو نے پوچھا۔

"ہاں کیوں کیا کام ہے؟" مینا کچھ حیران سی لگ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"نہیں، کون ہیں آپ، میں آپ کو نہیں جانتی۔" ظاہر ہے وہ اسے کہاں پہچانتی تھی۔

"کچھ دن پہلے فون پر بات ہوئی تھی آپ نے سہیل کو فون ملایا تھا غلطی سے میں نے ریسیو کیا تھا میں سب انسپکٹر ریاض حسین ہوں کچھ یاد آیا۔"

مینا کے تو جیسے پاؤں تلے زمین نکل گئی لیکن پھر بھی خود کو سنبھالتی ہوئی بولی۔ "آپ کیا بول رہے ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"

''آپ جھوٹ بول کر اپنے لیے ہی مشکلات کھڑی کریں گی پہلے آپ نے سم سمیت موبائل جھاڑیوں میں پھینک کر پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور اب میرے سامنے جھوٹ بول رہی ہیں اگر آپ یہاں سچ نہیں بولیں گی تو مجھے آپ کو تھانے لے جانا ہوگا اور آپ تو جانتی ہی ہوں گی کہ ہماری پولیس کتنے جدید طریقوں سے بات اگلوانے کا فن جانتی ہے۔'' راجو نے اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو ہر حال میں آپ کو بولنا ہی پڑے گا اب کیسے بولتی ہیں یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔''

راجو کی بات سن کر مینا گھبرا گئی۔ ''سر آئیں اندر آ کر بات کریں۔''

''اندر بھی آ جاؤں گا پہلے آپ سچ تو قبول کریں۔''

''کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟''

''یہ ہوئی نہ بات چلیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' راجو نے کہا۔

''آپ کچھ لیں گے۔ ٹھنڈا، گرم۔'' مینا نے پوچھا۔

''بس ایک گلاس پانی۔''

تھوڑی ہی دیر میں راجو مینا سے پانی کا گلاس لے کر پی رہا تھا۔

''آپ بہت نوجوان آفیسر ہیں پولیس میں اتنے نوجوان افسر میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔'' مینا تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ویسے آپ بھی کافی ینگ ہیں شادی شدہ ہیں؟''

''جی میں شادی شدہ ہوں۔'' مینا نے جواب دیا۔

''آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ اوہ جاب پر ہوں گے شاید۔'' راجو نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے ڈالا۔

''ہاں وہ باہر گئے ہیں۔''

''باہر یعنی گھر سے باہر یا شہر سے باہر؟''

''فیصل آباد گئے ہیں وہ اکثر بزنس ٹور پر رہتے ہیں۔''

''تب ہی شاید آپ نے سہیل کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔'' راجو نے مسکرا کر کہا۔

''میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کام کی بات کریں۔''

''سوری اگر آپ کو برا لگا ہو تو بس میرے منہ سے ویسے ہی نکل گیا۔''

''اٹس او کے۔''

''اب آپ یہ بتائیں کہ آپ نے سم اور موبائل جھاڑیوں میں کیوں پھینکا ایسا کیا ڈر تھا آپ کو اگر یہ ڈر تھا کہ کہیں پولیس آپ تک نہ پہنچ جائے تو دیکھ لیجئے میں پہنچ چکا ہوں آپ تک۔''

''میں کسی مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی آپ سے بات کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ سہیل مر چکا ہے اور میں اس رات اس کے ساتھ تھی مجھے لگا کہ کہیں پولیس مجھے بھی اس کیس میں شامل نہ کر لے مجھے اپنی بدنامی کا خوف تھا اس لیے میں نے موبائل پھینک دیا تھا۔'' مینا نے اپنے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''وہ قاتل سارے شہر میں کھلے عام گھوم رہا ہے اگر آپ کو اس بارے میں کچھ بھی پتہ ہے تو بتا دیں میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی نجی زندگی پر الزام نہیں آنے دوں گا۔''

''جب میں سہیل کے گھر میں تھی تو مجھے گھر کے پیچھے کچھ آہٹ سنائی دی تھی میں نے اس بارے میں سہیل کو بتایا بھی تھا لیکن اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور میرے جانے کے بعد سب کچھ

ہوگیا۔“

”کیا آپ نے وہاں کسی کو دیکھا تھا؟“ راجو نے پوچھا۔

”نہیں میں نے بس پولیس کے دو سپاہیوں کو ہی دیکھا تھا۔“ مینا نے جواب دیا۔

”وہ دونوں سپاہی بھی مارے گئے۔“ راجو کے لہجے میں افسوس تھا۔

”ہاں خبروں میں دیکھا تھا۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے کہ سہیل نے پولیس میں جھوٹی گواہی کیوں دی؟“

”مجھے خود یقین نہیں تھا کہ وہ لڑکی خونی ہے اور میرا یقین سچ نکلا میں نے سہیل سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن اس نے یہی کہا کہ اس نے خود اس لڑکی کو خون کرتے دیکھا ہے میں نے اور زیادہ اس بارے میں بات نہیں کی تھی۔“

”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ اب میں چلتا ہوں۔“ راجو اٹھتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں مجھے جو پتا تھا وہ بتا دیا پلیز اس کیس میں میرا نام نہ آئے میری ازدواجی زندگی کا سوال ہے۔“ مینا کے لہجے میں التجا تھی۔

”میں سمجھ رہا ہوں آپ بے فکر رہیں۔“ راجو نے اسے تسلی دی۔

راجو یہ کہتا ہوا دروازے پر آیا لیکن دروازہ کھولنے پر اسے پتا چلا کہ باہر تو بہت تیز بارش ہو رہی ہے حالانکہ اندر بیٹھے ہوئے اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

”یہ اچانک بارش کہاں سے آ گئی اور میں جیپ بھی پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔“ راجو نے بادلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے کہ آپ تھوڑی دیر رک جائیں۔“

”میں رک تو جاؤں لیکن آپ بہت خوبصورت ہیں اور یہ عاشقانہ موسم مجھے کہیں بہکا نہ دے۔“ راجو دنیا بھر کا عشق اپنے چہرے پر سمیٹتے ہوئے بولا۔

راجو کی بات سن کر مینا شرما گئی۔ ”مذاق مت کریں۔“

”مذاق نہیں کر رہا ہوں آپ سچ میں بہت خوبصورت ہیں کیا آج تک کسی نے آپ کو بتایا نہیں اس بارے میں ایسے موسم میں آپ کا ساتھ ہو تو کوئی بھی بہک سکتا ہے۔“ راجو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

مینا ہنسنے لگی۔ ”بس بس آپ تو فلرٹ کر رہے ہیں میرے ساتھ۔“

”یہ بھی عجیب مصیبت ہے کہ مرد کی زبان سے نکلا ہر اچھا جملہ عورت کو فلرٹ لگتا ہے۔“

”آپ نے تو میرا ڈر ہی بھگا دیا اگر آپ کی جگہ کوئی اور پولیس والا ہوتا تو اب تک میری جان ہی نکل گئی ہوتی میں ویسے بھی کئی دنوں سے اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان تھی۔“

راجو مینا کو پیار سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہ سچ ہے کہ میں فلرٹ ہوں کیا کروں عادت سے جو مجبور ہوں لیکن یہ بھی کھلا سچ ہے کہ آپ بہت خوب صورت ہیں سہیل جیسے لوگوں کے چکر سے خود کو بچا کر رکھیں دیکھا نا آپ نے کہ اس نے پولیس تک سے مکاری کا مظاہرہ کیا سوچ سمجھ کر دل دیا کریں۔“

”میں نے توبہ کر لی ہے آئندہ سے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“

”ارے ایسا تو نہ کہیں۔“ راجو جلدی سے بولا۔

”ہم جیسوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔“

راجو کی بات سن کر مینا مسکرا دی۔

”لگتا ہے میرا فلرٹ کام کر رہا ہے آپ میرے جال میں پھنستی جا رہی ہیں۔“ راجو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جی نہیں وہم ہے آپ کا۔“ مینا فوراً بولی۔

”ہاں ویسے آپ میرے چکر میں مت پھنسنا۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔“

”واہ آپ تو اپنے ہی خلاف بول رہے ہیں۔“ مینا حیرانگی سے بولی۔

”ایک پولیس افسر ہونے کے ناطے آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔“

”آپ بہت ہی دلچسپ انسان ہیں۔“ مینا اس سے متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

”یہ بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ مزید تیز ہوتی جا رہی ہے۔ آپ چائے ہی پلا دیں۔ موسم بھی سرد ہو رہا ہے۔“ راجو نے کہا۔

”ابھی لاتی ہوں۔“ مینا خود کو سنبھال کر کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

بارش بڑھتی جا رہی تھی اور راجو دروازے پر کھڑا اپنے اندر کی کشمکش میں کھویا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ادھر چوہان اپنی عادت سے مجبور یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا جیسے اس نے سحرش پر دباؤ ڈال کر اسے شکار کیا تھا ایسے ہی وہ سونیا کو بھی شکار کرنا چاہتا تھا۔

”کیا ہوا آپ تو گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ میرے سوال کا جواب نہیں دیا آپ نے ویسے کہا جاتا ہے کہ خاموشی کا مطلب ہاں ہی ہوتا ہے تو میں آپ کی اس خاموشی کو ہاں سمجھوں کیا۔“

سونیا مشکل میں تھی کہ کیا جواب دے یہ ٹھیک ہے کہ اس کے نوریز کے ساتھ تعلقات تھے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ ہر کسی کے سامنے دسترخوان کی طرح بچھ جائے مگر سونیا چوہان کے آگے مجبور تھی پھر وہی ہوا جو چوہان چاہتا تھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ پولیس سے اس طرح تعاون کرنے کا بھول چوک ہو گئی تو معاف کرنا اگر آپ کو مزید کوئی بھی معلومات ملے تو مجھے فوراً اس نمبر پر رنگ کر دینا۔“ یہ کہتے ہوئے چوہان نے اپنا کارڈ سونیا کو دیا۔

چوہان کے جاتے ہی سونیا نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملاتے ہوئے بولی۔ ”آ جاؤ انسپکٹر چلا گیا۔“

☆☆☆☆☆☆☆

مینا چائے لے آئی اور راجو دروازے پر کھڑا بارش کا نظارہ کرتے ہوئے چائے پینے لگا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میرا یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں ہے۔“ راجو نے خالی کپ مینا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ مینا تو خود یہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ بلا ٹلے۔ لیکن کچھ سوچتے ہوئے وہ اچانک بولی۔ ”مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے اس رات بھی میں سہیل کے ساتھ ہی تھی۔“

”یہ آپ کس رات کی بات کر رہی ہیں۔“ راجو متجسس ہو کر بولا۔

”جس رات سہیل نے تھانے جا کر جھوٹی گواہی دی تھی۔“

”اوہ تفصیل سے بتاؤ یہ تو بہت کام کی بات لگتی ہے۔“

مینا نے اپنی یادداشت کو کھنگالتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

”میں اس رات تقریباً دس بجے سہیل کے گھر پہنچی

تھی میرے شوہر گھر پر نہیں تھے اس لیے میرا ارادہ پوری رات سکندر کے گھر پر رہنے کا تھا ڈنر بھی میں نے سہیل کے گھر پر ہی بنایا اور ہم دونوں نے ساتھ ہی کھایا تھا اس کے بعد ہم ٹی وی دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے یوں باتوں باتوں میں رات کا ایک بج گیا جس رات ہمارے پاس کھلا وقت ہوتا تھا تو ہم ایسے ہی باتیں کرلیا کرتے تھے اسی دوران ایک بجے کے قریب گھر کی بیل بجنے لگی ہم دونوں حیران تھے کہ رات کے ایک بجے یہ کون آسکتا ہے سہیل دروازہ کھولنے چلا گیا مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا مجھے سب سے زیادہ یہ ڈر تھا کہ جس نے بیل بجائی ہے کہیں وہ اندر نہ آجائے یہ سوچ کر میں بیڈروم میں جا کر لحاف میں منہ ڈھک کر لیٹ گئی بیڈروم ڈرائنگ روم کے بالکل ساتھ تھا اس لیے مجھے دروازہ کھولنے کی آواز صاف سنائی دی سہیل نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ ''ابے کے کے تم! اتنی رات کو یہاں کر رہے ہو۔'' مجھے بس سہیل کی ہی آواز سنائی دی تھی وہ کے کے یا تو بہت آہستگی سے بات کر رہا تھا یا پھر وہ سہیل کو دروازے سے دور لے گیا تھا جو بھی تھا مجھے اس کے کے کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھوڑی دیر بعد سہیل واپس اندر آیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو وہ بولا کہ ابھی کسی ضروری کام سے باہر جانا ہے تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا مجھے بہت حیرانی ہوئی میں نے اس سے پوچھا بھی کہ یہ کے کے کون ہے تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس نے صرف یہی کہا کہ واپس آکر بتادوں گا پھر وہ باہر نکل گیا شاید اسی کے کے کے ساتھ اور میں سہیل کا انتظار کرنے لگی یہاں تک کہ صبح کے چھ بج گئے لیکن سہیل واپس نہیں آیا تھک ہار کر میں واپس اپنے گھر آگئی اگلے دن میں نے ٹی وی پر دیکھا کہ سہیل کسی واقعے کا عینی شاہد بنا ہوا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا ویسے تو سہیل اپنی ہر بات میرے ساتھ شیئر کرتا تھا لیکن گواہی والی بات کی حقیقت اس نے مجھے بھی نہیں بتائی مجھے خود بھی حیرت تھی کہ ایسا کیسے ہوا سہیل تو کے کے ساتھ گیا تھا پھر وہ کسی موقع واردات پر کیسے پہنچ گیا میں نے اگلے دن سہیل سے اس بارے میں پوچھا بھی' کیونکہ مجھے وہ لڑکی کسی بھی زاویے سے قاتل نہیں لگی تھی مگر سہیل یہی کہتا رہا کہ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ سچ بول رہا ہے میں نے اس بارے میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کی باقی میں بتا ہی چکی ہوں کہ میرے سہیل کے گھر سے جانے کے بعد اس کا قتل ہوگیا تھا بس یہ تھی وہ بات جو میں آپ کو بتانا چاہتی تھی شاید ان باتوں سے آپ کو کچھ مدد مل سکے۔''

راجو نے مینا کا کہا ہوا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ ''آپ نے تو بہت ہی کام کی بات بتائی ہے یہ سب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' راجو بولا۔

''میں خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی سب جانتے ہیں کہ پولیس کے چکر میں پھنس کر انسان کو صرف پریشانیاں ہی ملتی ہیں اور میں اپنی شادی شدہ زندگی پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ آپ مجھے دوسرے پولیس والوں سے بالکل الگ لگے اس لیے میں نے یہ بات آپ کو بتادی مگر پلیز میرا نام کہیں نہیں آنا چاہئے آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ میری عزت کا معاملہ ہے۔'' مینا کے بولنے کا انداز ایسا تھا جس نے راجو کے دل کو چھولیا تھا۔ مینا کا یہ اعتماد پولیس ڈپارٹمنٹ پر نہیں صرف راجو کی اپنی ذات پر تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں آپ بے فکر رہیں میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا ویسے آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ کے کے کون ہوسکتا ہے۔''

''مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے پتا ہوتا تو آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی بتادیتی۔ سہیل نے بھی کبھی میرے سامنے کسی کے کے کا ذکر نہیں کیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں اس کے کے کو بھی جلد ہی ڈھونڈ نکالوں گا ہو نہ ہو وہی نفسیاتی قاتل ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے جس طرح سے پورا واقعہ رونما ہوا ہے اس سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کے کے ہی وہ قاتل ہے۔'' مینا نے راجو کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

بارش اور تیز ہوتی جارہی تھی اور باہر گھنے بادلوں کی وجہ سے ملگجا اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ اچانک پھر سے بجلی کڑکی اور مینا کانپ کر رہ گئی۔

''توبہ ہے۔ یہ بارش تو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔'' راجو نے کہا۔

راجو کی بات سن کر مینا بھی اس کے برابر میں آکر کھڑی ہوگئی۔ ''بہت دنوں بعد ایسی بارش ہوئی ہے۔''

''مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔''

''ہاں ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔''

''ہاں بولیئے۔''

''میں ہمیشہ اپنے اور سہیل کے تعلق کو لے کر الجھی رہی ہوں میرے دل میں ہمیشہ یہ کشمکش رہی ہے اور ہمیشہ یہ احساس میرے اندر ابھرتا رہا ہے کہ میں اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں میں سہیل کے ساتھ تعلقات ختم کرنا چاہتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں نہیں کرپائی اب جبکہ وہ مرچکا ہے تو یہ تعلق اپنے آپ ہی ختم ہوگیا ہے میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے بہت پیار دیں گے اور شاید پیار کے اس سفر پر میں بھی چلنا چاہتی ہوں لیکن دل کے ایک کونے میں میرا یہ احساس بھی چبھ رہا ہے کہ یہ سفر ہر حال میں غلط ہی کہلائے گا میں دوبارہ بھٹکنا نہیں چاہتی اب میں آپ کے سامنے ہوں آپ کوشش کریں گے تو میں آپ کی پیش قدمی کو روکوں گی نہیں آپ مجھے اچھے لگے ہیں لیکن آپ بھی سچے دل سے سوچیں کہ کیا یہ ٹھیک ہے سہیل سے ناتہ جوڑ کر میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں ہر وقت پریشان رہی ہوں اب دوبارہ ایسا ہوا تو شاید میں بکھر کر رہ جاؤں گی حالانکہ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہمارے بیچ بہت خوبصورت تعلق قائم ہوسکتا ہے لیکن اپنے اندر کے وسوسوں کی وجہ سے تعلق کی یہ خوبصورتی بھی مجھے کانٹوں کا بچھونا لگ رہی ہے یہی وجہ تھی کہ میں آپ کے سوالوں کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔'' مینا نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

راجو یہ سب سن کر مینا سے دور ہٹ گیا۔

''آپ کو میری بات بری تو نہیں لگی؟''

''نہیں دل سے کہی ہوئی بات کبھی بری نہیں لگتی آج کی دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں غلط کام کرتے وقت احساس رہتا ہے کہ وہ کچھ غلط کر رہے ہیں یہی احساس تو انسان کو انسان بناتا ہے۔ ورنہ ہم میں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ آپ بہت اچھی عورت ہیں میرے دل میں ہمیشہ آپ کے لیے عزت و احترام رہے گا آپ کا کہا ایک ایک لفظ میرے دل کو چھو گیا ہے ان سب باتوں کو کہنا آسان نہیں ہے۔ اپنے اندر کے جذبات کو مارنا بہت مشکل کام ہے۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ ایک بہت اچھے انسان

ہیں اسی لیے آپ کے سامنے وہ ساری باتیں رکھ دیں جو میری روح کو زخمی کر رہی ہیں۔" بینا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں اگر انجانے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی چاہتا ہوں اپنا خیال رکھنا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا اور راجو وہاں سے نکل آیا۔

اب بارش تقریباً تھم چکی تھی، راجو کی جیپ وہاں سے روانہ ہوئی تو بینا دروازے پر کھڑی دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اور چہرے پر ایسی خوشی تھی جیسے وہ ایک مرد کے سامنے ان تمام عورتوں کا مقدمہ رکھ کر اپنی ہی نظروں میں سرخرو ہوگئی ہو جو اپنے شوہر کے ہوتے غیر کی بانہوں میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ضمیر کی خلش ان کی روحوں کو بے چین رکھتی ہے۔

راستے میں راجو نے چوہان کا نمبر ملایا۔

"سر موبائل والا کام ہوگیا' آپ کہاں ہیں؟"

"میں تھانے میں ہوں برخوردار یہیں آجاؤ۔" چوہان نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وردا اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی بارش کا نظارہ کر رہی تھی بارش کی چھم چھم اسے بہت بھلی لگ رہی تھی بچپن کی طرح اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر نکل کر بارش کا لطف اٹھائے مگر سرد موسم اس بات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"بیٹا! کب سے کھڑکی پر جمی کھڑی ہو چلو کچھ کھا لو۔" اس کی امی نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی ابھی نہیں آپ جانتی ہیں نا کہ مجھے بارش کتنی اچھی لگتی ہے ابھی مجھے یہیں رہنے دیں۔" وردا نے جواب دیا۔

"جیسے تمہاری مرضی میں جانتی ہوں کہ یہ تمہاری بچپن کی عادت ہے کہ تم بارش دیکھ کر جیسے باؤلی ہو جاتی ہو۔" امی نے ہنس کر کہا۔ یہ کہہ کر امی واپس چلی گئیں لیکن وردا یونہی کھڑکی پر جمی رہی۔

"آخر میں کب تک خود کو گھر میں قید رکھوں گی مجھے کل آفس جانا چاہئے باس سے بات تو ہو ہی گئی ہے وہ بھی ساری صورت حال سمجھ گئے ہیں یونہی ڈر کر گھر میں بیٹھنے سے کیا فائدہ' مجھے اس بارے میں انسپکٹر چوہان یا پھر راجو سے بات کرنی پڑے گی۔" وردا کا سوچنا بھی ٹھیک ہی تھا کیونکہ نہ صرف اس کے معمولات بلکہ اس کی ملازمت بھی متاثر ہو رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ ایسی اچھی ملازمت روز روز نہیں ملا کرتی اور اس جاب کی وجہ سے وردا کے دل کو یہ سکون بھی رہتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ پر بوجھ نہیں بنی ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

تھانے پہنچ کر راجو نے چوہان کو اپنی اب تک کی تفتیش اور کے کے کے بارے میں بتایا یہ سن کر چوہان نے فوراً سونیا کا نمبر ملایا جس وقت بیل بجی اس وقت سونیا پھر نوریز کے ساتھ مشغول تھی۔

"اف اب کس کی کال آگئی؟" وہ جھلا کر بولی۔

"لگتا ہے آج سب نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہمارا سکون برباد کر کے ہی رہیں گے۔" نوریز نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور اپنے برابر میں رکھا ہوا فون اٹھا کر سونیا کی طرف بڑھایا۔

"ہیلو۔" سونیا نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو سونیا میں انسپکٹر چوہان بول رہا ہوں۔"

"ہاں بولیں۔ آہ۔" نوریز کی شرارت سے سونیا بات کرتے ہوئے کراہ اٹھی۔

"آپ کراہ کیوں رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"جی...... ہاں میں ٹھیک ہوں آپ بولیں۔"

"کیا آپ سہیل کے کسی ایسے دوست کو جانتی ہیں جو کے کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔" چوہان نے پوچھا۔

"میں کسی کے کے کو نہیں جانتی مجھے جو پتہ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے میری درخواست ہے کہ اب مجھے بار بار پریشان نہ کریں مجھے کئی ضروری کام ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر سونیا نے فون کاٹ دیا۔

"کون تھا؟" نوریز نے پوچھا۔

"وہی انسپکٹر تھا۔"

☆☆☆☆☆☆☆

مراد کی حالت اب پہلے سے بہتر ہو رہی تھی وہ پلکیں بچھائے سحرش کا انتظار کر رہا تھا لیکن اسے نہ آنا تھا اور نہ وہ آئی حالانکہ راجو نے خود اس سے مل کر درخواست کی تھی لیکن اس نے راجو کو بھی ٹکا سا جواب دے دیا تھا کہ اسے مراد میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر مراد پھر بھی امید لگائے بیٹھا تھا کہ وہ آئے گی اور ضرور آئے گی جس قسم کی زندگی اس نے اب تک گزاری تھی اسے دیکھتے ہوئے صرف ایک لڑکی کے لیے ایسی تڑپ مراد کے خیالات میں بدلاؤ کا کھلا اظہار تھی۔

راجو اور چوہان کے کے کو ڈھونڈنے کے مشن پر لگ گئے لیکن انہیں کہیں سے بھی اس نام کے کسی شخص کے بارے میں کوئی بھنک نہیں ملی اور اسی بھاگ دوڑ میں ان کا ایک ہفتہ ضائع ہوگیا تھا لیکن ایک اطمینان بخش بات یہ تھی اس پورے ہفتے میں کوئی بھی ایسی واردات نہیں ہوئی تھی جو سیریل کلر کے کھاتے میں جاتی یہ سب شاید مراد کی ہمت کا کمال تھا کہ وہ درندہ اس کے ہاتھوں کسی کونے میں دبکا اپنے پیٹ کا زخم چاٹ رہا تھا وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن شہریوں میں قاتل کا خوف اب بھی برقرار تھا سب کے ذہنوں میں یہی خیال تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔

ایک ہفتے بعد مراد کو بھی اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی لیکن اس کے زخم بھرتے بھرتے ایک مہینہ گزر گیا اس دوران اس درندے کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی واردات ہوئی لیکن پولیس ڈپارٹمنٹ ابھی بھی الرٹ تھا کیونکہ وہ درندہ ابھی بھی قانون کے پنجرے میں نہیں لایا جاسکا تھا۔

صبح کے دس بج رہے تھے اور چوہان بے چینی سے ٹہل رہا تھا اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ راجو تھانے میں داخل ہوا تو اس نے چوہان کی بے چینی کو محسوس کرلیا۔

"کیا بات ہے سر آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" راجو نے پوچھا۔

"پوچھو مت برخوردار یوں سمجھو شامت آنے والی ہے میڈم صاحبہ نے ارجنٹ میٹنگ بلائی ہے سمجھ لو آج خوب ڈانٹ پڑنے والی ہے۔"

"ہم جو کر سکتے تھے کر رہے ہیں اب اس کے علاوہ اور کیا کریں؟"

"ارے ان کے سامنے مت بول دینا یہ بات زبان کھینچ لے گی تمہاری۔"

"نہیں سر ان کے سامنے کیوں بولوں گا میں یہ سب' میرا دماغ اتنا بھی خراب نہیں ہے مگر سر مجھے لگتا ہے کہ فی الحال وہ درندہ انڈر گراؤنڈ ہوگیا ہے میں نے کئی انگلش فلموں میں دیکھا ہے کہ ایسے نفسیاتی قاتل اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور اچانک ہی واپس نمودار ہو جاتے ہیں۔"

"مگر یہاں فلم نہیں چل رہی ہے برخوردار یہاں

سب حقیقی ہو رہا ہے یہاں تو اگلے پل کا پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو جائے اوپر سے اس کے کیے کا بھی کچھ پتا نہیں چل پایا ہے اب تک۔"

"سر ایک بات اور بھی تو ہو سکتی ہے؟" راجو نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"میرے دوست نے اس کے پیٹ میں خنجر مارا تھا اور سارے اسپتالوں اور کلینکس کو کھنگالنے کے بعد بھی ہمیں ایسا کوئی مریض وہاں نہیں ملا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے گھر پر ہی علاج کروایا ہو اور اگر کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں مل پایا ہوگا تو وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوگا کہیں وہ اس زخم کی وجہ سے مر مرا تو نہیں گیا۔"

"یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی اس بات سے ہمارا کیس تو حل نہیں ہوا نا۔"

سب انسپکٹر وحید ملک ان کی طرف بڑھتا ہوا آیا۔

"کیا بات ہے سر کوئی بہت ہی اہم باتیں ہو رہی ہیں کیا چلیں میٹنگ کا وقت ہو گیا ہے۔" وحید ملک نے وقت کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا چلو جلدی کہیں وہ اسی بات پر نہ برس پڑے۔" چوہان نے جلدی سے کہا۔

جب وہ تینوں میٹنگ روم میں داخل ہوئے تو ڈی ایس پی شہلا احمد پہلے سے ہی وہاں موجود تھی انہیں دیکھتے ہی چوہان کو اپنا گلا سوکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"مسٹر چوہان اس نفسیاتی قاتل والے کیس کی کیا رپورٹ ہے؟" شہلا احمد نے سیدھا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

ان کا سوال سن کر چوہان اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔ اس بیچارے کے پاس کہنے کے لیے تھا بھی کیا اس سے کچھ بولے ہی نہیں بن پا رہا تھا۔

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں میڈم وہ قاتل شاید انڈر گراؤنڈ ہو چکا ہے۔" چوہان کو چپ دیکھ کر راجو بیچ میں بول پڑا۔

"میں نے تم سے پوچھا کچھ۔" شہلا نے خشمگیں نظروں سے راجو کو گھورتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔

"جس سے پوچھا جائے وہی جواب دے۔"

"میڈم ہم پوری کوشش کر رہے ہیں ہم دن رات اسی کیس میں لگے ہوئے ہیں۔" چوہان ہمت کر کے بولا۔

"کیا فائدہ اس دن رات کی محنت کا، کوئی رزلٹ بھی تو آنا چاہیے میڈیا والے روزانہ ہمارے محکمے کے لتے لے رہے ہیں اور اوپر والوں کو تو مجھے ہی جواب دینا پڑتا ہے نا، اچھا میں تھوڑی دیر میں شہر کا ایک راؤنڈ لگانا چاہتی ہوں تم میں سے کون چلے گا میرے ساتھ۔" شہلا بولی۔

"سب انسپکٹر وحید ملک کو لے جائیں میڈم۔" چوہان نے اپنے سر سے بلا اتارتے ہوئے کہا۔

"سر وہ مجھے اپنی گھر والی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔" وحید ملک نے چوہان کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہیں ہونا تھا مگر میٹنگ کی وجہ سے یہاں آنا پڑا۔"

میڈم کے ڈر کی وجہ سے چوہان خود بھی ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔

"تو میڈم ریاض حسین چلا جائے گا آپ کے ساتھ۔" چوہان نے یہ مصیبت راجو کے گلے باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

راجو نے فوراً چوہان کو گھورا اور چوہان اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"ٹھیک ہے ہم تھوڑی دیر میں نکلیں گے میٹنگ ختم سمجھیں اور ہاں ہو سکے تو کچھ زیادہ محنت کرو اس

کیس پر۔" شہلا اٹھتے ہوئے بولی۔

"بالکل میڈم ہم آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔" چوہان نے کہا۔

شہلا اٹھ کر چلی گئی ان کے جاتے ہی راجو بولا۔

"سر آپ نے مجھے کیوں پھنسا دیا ان کے ساتھ۔"

"کوئی بات نہیں برخوردار تمہیں آفیسر کو ڈیل کرنا بھی آنا چاہیے بس ان کے سامنے اپنی زبان کم سے کم کھولنا باقی مجھے یقین ہے تم سب سنبھال لو گے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مراد اب بالکل صحت یاب ہو چکا تھا لیکن شاید اب اس کا دل بیمار ہو چکا تھا اس وقت بھی وہ بائیک لیے سحرش کے کالج کے سامنے کھڑا تھا کئی لڑکیاں اندر باہر آ جا رہی تھیں لیکن اسے سحرش کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اس کے چہرے پر مایوسی ابھرنے لگی۔

"اوہ سحرش کہاں ہو تم ہر وقت کلاس میں ہی بیٹھی رہتی ہو کیا۔" مراد نے اسے دل میں پکار کر کہا۔

تب ہی اسے سحرش اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ گیٹ سے نکلتی دکھائی دی اور مراد کا چہرہ کھل اٹھا اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور سحرش کے پاس آ کر روکی اپنے سامنے اچانک بائیک کو رکتا دیکھ کر لڑکیاں ٹھٹک گئیں لیکن مراد کو دیکھتے ہی سحرش کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

"تم...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سحرش نے غصے سے پوچھا۔

"تم جانتی ہو اسے۔" ایک لڑکی بولی۔

"ہاں ہمارے علاقے میں ہی رہتا ہے۔"

"نہیں دل میں بھی تو نہیں رہتا۔" دوسری لڑکی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ اور میرے دل میں مجھے تو نفرت ہے اس سے۔" سحرش کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

مراد سب سن رہا تھا۔ "ان کی نفرت میں بھی پیار چھلکتا ہے میں لاکھ سنبھالوں دل کو یہ اسی جانب کھنچتا ہے۔"

"واہ یہ تو کوئی شاعر لگتا ہے۔" دونوں لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"چلو یہاں سے یہ تو پاگل ہے۔" سحرش دونوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی لیکن دونوں لڑکیاں پیچھے مڑ مڑ کر مراد کو دیکھتی رہیں۔

"بہت بڑا فلرٹ ہے وہ، چلو ہمیں فلم کے لیے دیر ہو جائے گی۔" سحرش نے کہا۔

یہ بات مراد نے بھی سن لی ان تینوں نے ایک رکشہ روکا اور اس میں بیٹھ کر چلی گئیں مراد نے بھی اپنی بائیک ان کے پیچھے لگا دی۔

"اگر اس کو اپنا نہیں بنا پایا تو زندگی بیکار ہے میری۔" مراد خود سے مخاطب ہوا۔

سنے پلیکس پہنچ کر تینوں لڑکیاں اندر چلی گئیں۔ انہیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ مراد ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے مراد نے بھی ٹکٹ لیا اور ان کے پیچھے داخل ہو گیا۔

"ہائے یہ تو دیوانہ لگتا ہے تمہارے پیچھے یہاں تک آ گیا۔" ایک لڑکی نے مراد کو دیکھ کر کہا۔

"تم مذاق کر رہی ہو۔" سحرش بولی۔

"مڑ کے تو دیکھو بالکل تمہارے پیچھے بیٹھا ہے۔"

ابھی فلم شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے ہال میں روشنی ہو رہی تھی سحرش نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ "تم یہاں بھی آ گئے آخر تم چاہتے کیا ہو۔"

"مجھے جو چاہیے وہ تمہیں پتا ہے ان کے سامنے کیسے کہوں۔"

"شٹ اپ۔" سحرش نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"چپکے چپکے وہ کیا کہہ رہا تھا تم سے؟"

"کچھ نہیں تم اس پر زیادہ دھیان مت دو پاگل ہے وہ۔"

تھوڑی دیر بعد ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہوگئی مراد سحرش کی طرف جھک کر بولا۔ "اگر یہ رومانٹک فلم ہم دونوں مل کر دیکھیں تو زیادہ مزا آئے گا پیچھے آجاؤ نا میرے پاس میرے ساتھ والی سیٹ خالی ہے۔"

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو تم بلاؤ گے اور میں آجاؤں گی ہونہہ، تمہارے پاس آئے گی میری جوتی چپ چاپ فلم دیکھو ورنہ سینڈل سے خاطر تواضع کروں گی تمہاری۔" سحرش نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"ایسی حرکت مت کرنا آج تک میں نے سینڈل نہیں کھائی اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔" مراد سے جلدی سے بولا۔

"نہیں کھائی تو اب کھالو گے اور ذائقہ بھی پتا لگ جائے گا دیکھو مجھے غصہ مت دلاؤ۔"

"کیا کروں یہ تو شعلے اگل رہی ہے۔" مراد نے سوچا۔

کچھ دیر بعد سحرش کی ایک سہیلی کرن کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر پیچھے مراد کے پاس آکر بیٹھ گئی اس کی یہ حرکت دیکھ کر سحرش بھی حیران رہ گئی لیکن وہ کچھ بولی نہیں مراد بیچارہ الگ حیران پریشان تھا۔

"تمہارا شاعرانہ انداز مجھے بہت اچھا لگا میرا نام کرن ہے کیا آپ مجھ پر کوئی غزل کہیں گے۔" کرن، مراد کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کوئی شاعر نہیں ہوں وہ تو میں یونہی کچھ تک بندی کر رہا تھا آپ کی سہیلی کے لیے، سحرش سے میری دوستی کروادو نا۔" مراد نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ اسے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تم اور پر ٹرائی کیوں نہیں کرتے۔" کرن نے مشورہ دیا۔ مراد خاموش ہوگیا تھا اس کی نگاہیں اسکرین پر اور دماغ نجانے کہاں تھا پھر اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب فلم ختم ہوگئی اور کرن اس کے پاس سے اٹھ کر گئی۔ اس نے ارد گرد دیکھا مہوش اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ہجوم میں غائب ہوچکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

راجو جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے کن اکھیوں سے میڈم شہلا کو دیکھ رہا تھا جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"ٹریننگ کیسی چل رہی ہے تمہاری؟" شہلا نے پوچھا۔

"بہت اچھی چل رہی ہے میڈم چوہان صاحب بہت توجہ دے رہے ہیں میری تربیت پر۔" راجو نے کہا۔

"ویسے وردا شمسی کو میرے پاس لاکر تم نے بہت اچھا کام کیا۔"

"جی میڈم مجھے یقین تھا کہ آپ سچ کو پرکھ سکتی ہیں اور آپ ہی کی وجہ سے تو مجھے یہ ملازمت ملی ورنہ میں تو چکر لگا لگا کر تھک گیا تھا اگر آپ نہ آتیں تو میری جوائننگ کبھی نہ ہوتی۔"

"اپنی ڈیوٹی ہمیشہ ایمانداری سے انجام دینا پولیس میں آکر اکثر لوگ بگڑ جاتے ہیں۔" شہلا نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ نے بتایا نہیں کہ اس وقت کہاں چلنا ہے؟"

"ویسے ہی چکر لگانے کا دل کر رہا تھا زیادہ سے

زیادہ شہر کا چکر لگانا چاہتی ہوں میں۔"

"اوکے میڈم ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو۔" راجو نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"آپ کیسے آگئیں پولیس میں۔"

"کیسے آگئی کیا مطلب سول سروسز کا امتحان پاس کرکے آئی ہوں۔" شہلا نے بتایا۔

"میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو دلچسپی تھی اس محکمے میں یا پھر......"

"دلچسپی تو نہیں تھی لیکن کوئی بات نہیں یہ محکمہ بھی اچھا ہے۔"

"میری تو ہمیشہ سے خواہش تھی پولیس میں آنے کی آپ کی وجہ سے مجھے میرے خواب کی تعبیر ملی ہے میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" راجو تشکر سے بولا۔

"یہ کہاں آگئے ہم۔ یہاں تو سڑک کے دونوں طرف ہی جنگل ہے۔" شہلا نے چونک کر کہا۔

"ہاں میڈم یہ بہت بڑا جنگل ہے اسی روڈ پر وردا شمسی کے ساتھ وہ واقعہ ہوا تھا۔" راجو بولا۔

"اوہ ہاں یاد آیا اس طرف میں پہلی بار آئی ہوں۔"

"شہر سے نزدیک یہ جھاڑیوں کا جنگل اندر سے بہت گھنا ہے اور جرائم پیشہ افراد اس کا فائدہ ضرور اٹھاتے ہوں گے۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ ایسے سنسان جنگل اکثر جرائم کا اڈہ بن جاتے ہیں، وہ......وہ کون ہیں جنگل میں۔" شہلا ایک طرف کسی کو دیکھ کر چونک گئی راجو نے فوراً جیپ روک لی۔

"کہاں میڈم مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

"نہیں میں نے ابھی اس طرف ایک سائے کو دیکھا ہے اور شاید اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہے چلو چیک کرتے ہیں۔"

"کیا دیکھ لیا ان میڈم صاحبہ نے مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔" راجو جیپ سے اترتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کون ہے وہاں باہر آجاؤ ورنہ گولی ماردوں گی۔" شہلا اپنا سروس پستول نکال کر للکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں کسی جنگلی جانور کو نہ ماردے یہ قیامت۔" راجو نے سوچا۔

"میڈم شاید کوئی جانور ہوگا۔"

"شٹ اپ یو ایڈیٹ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں میں نے دیکھا ہے کسی کو، ہے کون ہو تم باہر آؤ۔"

باہر تو کوئی نہیں آیا البتہ ایک گولی تیزی سے شہلا کی طرف آئی اور اس کے سر کے عین نزدیک سے ہوتی ہوئی نکل گئی۔ شہلا فوراً زمین پر لیٹ گئی راجو کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا وہ جیپ کے پیچھے چھپ گیا۔

"میڈم ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کون ہے یہ بندہ جو سرعام پولیس پر گولی چلا رہا ہے۔"

شہلا ہاتھ میں پستول لیے جھکی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی شہلا نے ایک طرف فائر کیا اور فائر ہوتے ہی کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی راجو بھی جھکا ہوا شہلا کے پاس آگیا۔

"آپ صحیح کہہ رہی تھیں میڈم۔" راجو نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہمیشہ صحیح ہی کہتی ہوں آئندہ میرے کسی اندازے پر شک کیا تو معطل کردوں گی۔"

"نہیں کروں گا میڈم بالکل نہیں کروں گا مجھے لگتا ہے کہ جو بھی تھا بھاگ گیا ہے۔"

"میرے اوپر گولی چلانے والے کو میں چھوڑوں گی نہیں اسے پکڑنا ہی ہوگا۔" شہلا کا ارادہ پختہ لگتا تھا۔

”میڈم ہم صرف دو ہیں مزید نفری منگوالوں کیا۔“
”ہاں چوہان کو فون کرو تب تک ہم اسے پکڑنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔“ شہلا نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
”میڈم سوچ لیں جنگل ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں گھات لگا کر بیٹھا ہو ہمیں نشانے پر لینے کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے مجھے ابھی تک سروس پستول بھی نہیں ملا ہے۔“ راجو نے اپنی مجبوری بتائی۔
”تم میرے پیچھے پیچھے آؤ گھبراؤ مت۔“
راجو نے فون کر کے چوہان کو ساری صورت حال بتا کر نفری بھیجنے کو کہا۔
”میڈم کہیں یہ وہی درندہ تو نہیں۔“ راجو نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ ”بنا سوچے سمجھے پولیس پر گولی چلا دی اس نے ایسا کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔ اسے صرف باہر آنے کو ہی تو کہہ رہی تھیں آپ۔“
”شاید تمہارا اندازہ درست ہے کہ یہ وہی درندہ ہے۔“ بولتے وقت شہلا کا دھیان راجو کی طرف ہو گیا اور وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرنے لگی راجو اسے سنبھالنے کی کوشش خود ہی اس کے اوپر گر گیا یہ بہت ہی عجیب سی صورت حال تھی کہ ڈی ایس پی صاحبہ نیچے پڑی تھی اور سب انسپکٹر اس کے اوپر۔
”میڈم آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔“ راجو نے پوچھا۔
”پہلے میرے اوپر سے تو ہٹو۔“ شہلا نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا راجو فوراً دوسری طرف لڑھک گیا۔
”تم یہ کیا حرکت کرنا چاہ رہے تھے۔“ شہلا اسے گھورتی ہوئی بولی۔
”سوری میڈم آپ گرنے لگی تھیں تو آپ کو سنبھالنے کے چکر میں، میں بھی گر گیا۔“ راجو نے صفائی پیش کی۔
”تم نے تو میری کمر ہی توڑ کر رکھ دی ویسے تو [illegible] میں بچ بھی جاتی بے وقوف کہیں کے۔“ شہلا درد [illegible] کراہ اٹھی تھی اور اپنا غصہ راجو پر نکال رہی تھی۔
”سوری میڈم میں تو بس۔“
”شٹ اپ مجھے کبھی بھی کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہتی سمجھے تم آئندہ سے ایسا کیا تو معطل کر دوں گی۔“
”میری نوکری تو لگتا ہے ہر وقت تلوار کی دھار [illegible] لٹکی ہوئی ہے۔“ راجو آہستہ سے بڑبڑایا۔
”کیا کہا تم نے؟“ شہلا نے پوچھا۔
”کچھ نہیں میں سوچ رہا تھا کہ آپ پر گولی چلانے والا کس طرف گیا ہو گا جنگل تو بہت بڑا ہے ہم اسے کس طرف ڈھونڈیں۔“
”جس طرف میں جاؤں گی تم بس اسی طرف چلتے رہو باقی باتیں بھول جاؤ۔“
”یہ میڈم تو قیامت سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے ان سے بہت سنبھل کر رہنا ہو گا ورنہ تو نوکری گئی ہی سمجھو راجو میاں۔“ راجو نے سوچا۔
”کیا سوچ رہے ہو چلو اب یا پھر اس کے لیے بھی باقاعدہ دعوت نامہ دینا پڑے گا۔“ شہلا تیز لہجے میں بولی۔
”چلیے میڈم ایسے موقعوں کے لیے آپ میرا سروس پستول ریلیز کروا دیں ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔“
”واپس جا کر دیکھیں گے ابھی تو چپ چاپ آگے بڑھو۔“
اور راجو میڈم کے پیچھے چل پڑا۔
شہلا پستول تانے آگے بڑھ رہی تھی اور راجو اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
”کہاں گیا وہ۔“ شہلا بولی۔
”میڈم اتنا بڑا جنگل ہے کہیں بھی جا سکتا ہے۔“

”تم ہر طرف نظر رکھو ہو سکتا ہے وہ یہیں کہیں چھپا ہو گا۔“ شہلا نے کہا۔
”ٹھیک ہے میڈم میں نظر رکھے ہوئے ہوں۔“
اچانک شہلا کو کوئی آہٹ سنائی دیتی ہے اور وہ رک گئی راجو دوسری طرف دیکھ رہا تھا بے دھیانی میں وہ شہلا سے ٹکرا گیا اور شہلا کا ماتھا ایک درخت سے ٹکرایا تو اس کا پارہ چڑھ گیا راجو بیچارے کے پیروں کے نیچے سے تو جیسے زمین نکل گئی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا کہے وہ چہرہ لٹکائے چپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔
”دھیان کہاں ہے تمہارا کبھی میرے اوپر گر جاتے ہو کبھی پیچھے سے ٹکراتے ہو یہ ساری کی ساری گولیاں تمہارے بھیجے میں اتار دوں گی پتا نہیں میں کس گدھے کو لے آئی اپنے ساتھ۔“ شہلا نے غصے سے کہا۔
”میڈم میرا دھیان دوسری طرف تھا آپ مجھے جتنا چاہیں ڈانٹ لیں لیکن گدھا مت کہیں مجھے۔“
”کیوں نہ کہوں جب گدھوں جیسی احمقانہ حرکتیں کرو گے تو اور کیا کہوں؟“
”گدھے مجھے اچھے نہیں لگتے کسی اور جانور کا نام لے سکتی ہیں۔“ راجو سنجیدہ لہجے میں بولا۔
”اوہ مائی گاڈ اب چپ رہو تم کیا سامنے کی جھاڑیوں میں تمہیں کوئی آہٹ سنائی دی۔“ شہلا نے پوچھا۔
”جی سنائی تو دی ہے۔“ دونوں آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔
”بالکل چپ چاپ دبے پاؤں چلو کوئی آواز مت کرنا۔“
”کوئی آواز نکالنے لائق چھوڑا ہی کہاں ہے جو آواز کروں گا۔“ راجو پھر بڑبڑایا۔
”کچھ کہا تم نے۔“
”جی نہیں میڈم چلیں دیکھتے ہیں کیا ہے ان جھاڑیوں کے پیچھے۔“ راجو نے دھیرے سے کہا۔
شہلا دبے پاؤں پستول لیے جھاڑیوں کی طرف بڑھی راجو بھی اس کے پیچھے تھا جھاڑیوں کے پیچھے کچھ اور نہیں بلکہ ایک جنگلی بلی تھی جو شہلا کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔
لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ وہ شہلا کے پیروں کے بیچ سے ہو کر بھاگی یہ سب کچھ اتنی تیزی سے کہ شہلا اور راجو کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا شہلا گھبرا کر تیزی سے گھومی اور راجو پیچھے ہی کھڑا تھا وہ کب اپنی ہی جھونک میں راجو کو لیے زمین پر گر گئی شہلا کو پتہ ہی نہیں چلا اس بار راجو نیچے تھا اور ڈی ایس پی صاحبہ اوپر۔
”کھڑے کھڑے دیکھ رہے تھے کچھ کر نہیں سکتے تھے تم۔“ شہلا نے جھینپ کر اپنا غصہ راجو پر نکالا اور کھڑی ہو کر کپڑے جھاڑنے لگی۔
”میڈم آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے میں نے اسی لیے نہیں سنبھالا آپ کو کہ کہیں آپ مجھے معطل نہ کر دیں۔“ راجو معصومیت سے بولا۔
”شٹ اپ آؤ آگے بڑھتے ہیں۔“
”چلیے میڈم۔“
ایک نقاب پوش نے شہلا کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ گولی اس کے پستول سے نکل چکی تھی۔ راجو فوراً شہلا پر جھپٹا اور اسے لیتا ہوا زمین پر آ گیا۔ ایک بار پھر راجو شہلا کے اوپر تھا۔ شہلا نے بھی وقت گنوائے بغیر فوراً اسی سمت میں فائر کیا۔ لیکن نقاب پوش بھاگ چکا تھا۔
”ہٹو بھی اب میرے اوپر ہی پڑے رہو گے کیا۔“ شہلا نے راجو کو دھکا دیا۔

”سوری میڈم۔ لیکن میں وقت پر آپ کو نہ گراتا تو وہ گولی لگ چکی ہوتی آپ کو۔“ راجو نے کہا۔
شہلا نے راجو کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔
”ایک بار پھر بچ گیا کمینہ۔“ شہلا کے لہجے میں غصہ بھرا ہوا تھا۔
اسی وقت پولیس کی دو مزید جیپیں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ پورا جنگل چھان مارا گیا لیکن اس نقاب پوش کا کچھ پتہ نہیں چلا۔
شہلا راجو کے ساتھ تھانے کی طرف چل پڑی۔
”ایک دم نکمی پولیس فورس ہے ہماری ایک تو دیر سے پہنچے اوپر سے جنگل میں کسی کو ڈھونڈ بھی نہیں سکے۔“ شہلا ابھی بھی طیش میں تھی۔
”اس سے یہ بات صاف ثابت ہو جاتی ہے میڈم کہ وہ نقاب پوش ہی درندہ تھا وہ واپس آ گیا ہے اب جس بے خوفی سے وہ گولی چلا رہا تھا اس سے تو لگتا ہے کہ وہ وہی درندہ قاتل ہے۔“
”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو ریاض مگر آج تم نے مجھ پر ایک احسان کر دیا۔“
”احسان؟ کون سا احسان میڈم۔“ راجو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔
”میری جان بچانے کا شکریہ اس وقت میں ان کے سامنے کچھ بول نہیں پائی تھی۔“ شہلا نے احسانمندی سے کہا۔
”میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا میڈم اس درندے کو تو مزا چکھانا ہے میں نے۔“
راجو کی بات سن کر شہلا کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی اس کی یہ مسکراہٹ راجو سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔
”پہلی بار آپ کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔“
”میں بھی انسان ہوں کوئی پتھر نہیں ہوں۔“ شہلا بولی۔
”میڈم اگر یہ وہی درندہ ہی ہے تو ہمیں اب چوکنا رہنا ہوگا اگلی بار اسے ہمارے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہئے۔“
”یہ کام تو تم لوگوں کو ہی کرنا ہے۔“
”میڈم آپ پلیز میرا سروس پستول دلوا دیں۔ اگر آج میرے پاس بھی پستول ہوتا تو میں بھیجہ اڑا دیتا اس کا۔“
”آج شام تک تمہیں مل جائے گی۔“ شہلا نے کہا۔
پھر شہلا کے حکم پر شام تک راجو کو سروس پستول دے دیا گیا شہلا کی یہ خوبی تھی کہ جو کہتی تھی وہ کر بھی دکھاتی تھی راجو اپنے پستول کو ہولسٹر میں لٹکا کر تھانے سے نکلا اس کے دماغ میں کچھ الجھنیں تھیں۔
”مجھے فوراً وردا سے ملنا ہوگا۔ اگر آج جنگل میں ٹکرانے والا وہ نقاب پوش قاتل ہی تھا تو وہ کسی بھی طرح سے وردا کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ کیونکہ صرف وردا ہی جانتی تھی کہ وہ قاتل کون ہے۔ اور اس جنگل پر بھی مجھے شبہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر وارداتیں اس جنگل یا اس کے آس پاس ہی ہوئی ہیں۔ اس رات وردا کے ساتھ جو واقعہ ہوا تھا وہ بھی اسی جنگل کی درمیانی سڑک پر ہوا تھا۔ اور آج وہ پستول لیے دن میں ہی جنگل میں گھوم رہا تھا۔ ضرور اس جنگل سے کوئی راز وابستہ ہے۔ مجھے یہ بات شہلا میڈم کو بھی بتانی ہوگی۔ مگر پہلے وردا سے مل لیتا ہوں کہیں وہ آفس سے نکل نہ پڑے۔ اور زیادہ تر وہ کے راستے ہی گھر جاتی ہے۔“

یہ سب سوچتے ہوئے راجو نے اپنی جیپ کا رخ وردا کے آفس کی طرف موڑ دیا۔ جب وہ وردا کے آفس پہنچا تو وہ بلڈنگ سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے بلیو جینز اور وہائٹ ٹاپ پہنا ہوا تھا راجو تو وردا کو دیکھتا ہی رہ گیا راجو نے پہلی بار وردا کو جینز میں دیکھا تھا۔ وہ تو دور سے اس لباس میں وردا کو پہچان بھی نہیں پایا تھا۔
”کچھ بھی ہو لیکن خدا نے جو روپ اور خوبصورتی وردا کو بخشی ہے وہ انمول ہے۔“ راجو یہ سوچتا ہوا وردا کی طرف بڑھا۔
وردا اس کی آمد سے بے خبر سیدھی اپنی کار کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنے لگی۔
”وردا جی۔“ راجو نے آواز دی۔
وردا آواز سن کر چونک گئی اور فوراً پیچھے مڑی اور راجو کو دیکھ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”راجو تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“
”میں تو اس لباس میں آپ کو پہچان ہی نہیں پایا تھا۔“ راجو نے کہا۔
”کیا بات ہے تم یہاں کیسے؟ سب خیریت تو ہے نا۔“
”آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
”کس بارے میں؟“ وردا نے پوچھا۔
”شاید وہ درندہ دوبارہ لوٹ آیا ہے۔“ راجو نے جنگل میں ہونے والا واقعہ بتاتے ہوئے کہا۔
”او مائی گاڈ یہ سب کب ختم ہوگا اتنے دنوں سکون رہا تو میں سمجھی اب سب ٹھیک ہو چکا ہے لیکن اب پھر وہی۔“ وردا پریشان ہو کر بولی۔
جب تک وہ درندہ پکڑا نہیں جاتا یا اس کا انکاؤنٹر نہیں ہو جاتا۔ تب تک وہ یونہی وارداتیں کرتا رہے گا میں بس اتنا ہی کہنے آیا تھا کہ آپ اپنا خیال رکھنا اور ہوشیار رہنا کیونکہ ہر وقت پولیس تو ساتھ نہیں ہوتی کوئی بھی انہونی ہو سکتی ہے اور اگر آپ کچھ گڑبڑ محسوس کریں تو فوراً مجھے فون کر دینا۔“
”آپ کی اس توجہ کا بہت بہت شکریہ میں خیال رکھوں گی۔“ وردا نے کہا۔
”ایک بات اور ہے؟“
”وہ کون سی؟“
”آپ کا اس جنگل کے راستے سے آنا جانا ٹھیک نہیں ہے پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔“ راجو نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”مجھے بھی وہ راستہ پسند نہیں ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے گھر وہی راستہ جاتا ہے اسی لیے مجھے وہاں سے تو گزرنا ہی ہوگا۔“ وردا نے اپنی مجبوری بتائی۔
”آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ کا اکیلے وہاں سے گزرنا ٹھیک نہیں ہے۔“ راجو نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔
”ارے نہیں میں چلی جاؤں گی تم رہنے دو۔“
”ویسے اب تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا آپ مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہیں کیا آپ کو مجھ سے کسی قسم کا کوئی ڈر خوف ہے۔“
”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“
اب وردا اسے اپنے خواب والی بات کا راز کیسے بتاتی وہ تو ہر حال میں راجو سے دور ہی رہنا چاہتی تھی۔
”اچھا میں چلتی ہوں گھر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“
”وہ سمجھ ہی نہیں رہی ہیں کہ ان کی جان کو کتنا خطرہ ہے۔“
راجو نے اپنی جیپ وردا کی کار کے پیچھے لگا دی۔ نہ ہی وردا نے دھیان دیا اور نہ ہی راجو نے خیال رکھا

کہ پاس ہی بلیک اسکارپیو کار میں ایک شخص بیٹھا انہیں گھور رہا تھا۔

اس کا ہاتھ برابر والی سیٹ پر پڑے خنجر پر تھا۔ وہ خنجر پر ہلکے ہلکے ایسے ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے اپنی محبوبہ کے بال سہلا رہا ہو۔

"کوئی بات نہیں بس تھوڑا انتظار کرو تمہیں وردا شمسی کا پیٹ چیرنے کا موقع بھی مل جائے گا' ابھی چل کسی اور کو کاٹتے ہیں۔"

وردا نے بیک ویو مرر میں دیکھ لیا کہ راجو جیپ لے کر اس کے پیچھے ہی آرہا ہے۔ "اس درندے سے زیادہ تو مجھے راجو سے ڈر لگتا ہے میں نہیں چاہتی کہ وہ گندا خواب کبھی سچ ہو جائے۔"

وردا بغیر کسی دقت کے اپنے گھر پہنچ گئی گھر پہنچتے ہی وہ راجو کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے کی طرف لپکی۔ راجو بھی چپ چاپ آگے بڑھا لے گیا۔

رات کے دو بجے تھے جب وردا ہڑبڑا کر نیند سے جاگ گئی اس نے پھر خواب دیکھا تھا اور خواب میں وہی راجو اور وہ راجو کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کہہ رہی تھی۔ "آئی لو یو۔ آئی لو یو۔"

"اف پھر وہ خواب' مگر یہ سچ نہیں ہوگا رات کے دو بجے ہیں اور صبح کے خواب ہی سچے ہوتے ہیں مگر پہلے والا خواب تو صبح دیکھا تھا نہیں' نہیں راجو کے ساتھ میرا افیئر ...... چھی ...... کبھی نہیں پتہ نہیں یہ راجو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے لیکن میں اس کے ارادے کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" وردا نے جیسے ایک عزم کے ساتھ سوچا۔

ادھر بلیک اسکارپیو کار میں موجود شخص کافی دیر تک وردا کے آفس کے سامنے کھڑا رہا یہاں تک کہ سڑک سنسان ہونے لگی تب وہ کار سے باہر آیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اس کا ہاتھ جیب میں موجود خنجر پر بے چینی سے گھوم رہا تھا اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نشئی کا نشہ ٹوٹ رہا ہو اور اسے نشے کی بے پناہ طلب ہو رہی ہو' تھوڑی دیر بعد ایک آدمی گنگناتا ہوا آتا دکھائی دیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے اس کے من کی مراد پوری ہو گئی ہو۔

جب وہ آدمی اس شخص کے قریب پہنچا تو اس نے آواز دے کر اسے روکا۔ "بھائی صاحب آپ کے پاس ماچس ہوگی۔"

اس آدمی نے ٹھٹک کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس رک کر اپنی جیب ٹٹولنے لگا پھر جیسے ہی اس نے جیب سے ماچس نکال کر اس شخص کی طرف بڑھائی درد کی شدت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ایک لمحے میں ہی اس شخص کا پیاسا خنجر اس آدمی کا پیٹ چیر چکا تھا وہ نیچے گر کر تھوڑی دیر تڑپ کے ساکت ہو گیا تو اس شخص نے مرے ہوئے آدمی کی شرٹ سے اپنا خنجر صاف کیا اور اسے چوم لیا۔

"اب تو خوش ہونا میں نے تمہاری آج کی رات ضائع نہیں ہونے دی' چلو اب چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے خنجر واپس اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور کار میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وردا کو چھوڑ کر راجو سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا' تنہائی ملتے ہی راجو گہرے خیالوں میں کھو گیا اور انہی خیالوں میں اس نے نکیئے کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ "وردا جی میں ٹھیک سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر ہاں شاید مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

اس رات راجو کو نیند کا ایک جھونکا تک نہیں آیا۔ وہ تکیئے کو دبوچے دائیں بائیں کروٹیں بدلتا رہا۔

وہاں رات کے دو بجے وردا اپنے خواب سے ڈر کر اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ' ایسے خواب کیوں آرہے ہیں مجھے' راجو کو تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بدتمیز کہیں کا۔ اسے کوئی حق نہیں ہے مجھے چھونے یا چاہنے کا۔ چاہے وہ حقیقت ہو یا خواب۔" وردا بڑبڑا رہی تھی۔ مگر اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

رات کے آخری دروازے پر صبح دستک دینے لگی تھی۔ راجو ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا تھا۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا اور وردی پہن کر مراد کے گھر کی طرف چل دیا۔

جب دل کسی وجہ سے بہت بے چین ہو تو ایسے میں انسان اپنے دوست کی ہمراہی چاہتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنا غم بانٹ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔

"راجو تم اتنی صبح' آج کیسے یاد آ گئی میری۔" مراد نے پوچھا۔ "اور کوئی نئی تازی۔" مراد نے پوچھا۔

"پوچھو مت استاد۔ ایک عجیب سی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ کل ساری رات سو نہیں پایا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہو گئی۔ طبیعت تو ٹھیک تھی نا تمہاری؟" مراد فکر مند ہو کر بولا۔

"لگتا ہے پھر سے محبت ہو گئی ہے مجھے۔" راجو نے ایسے کہا جیسے اپنے کسی گناہ کا اقرار کر رہا ہو۔

"واہ میرے پٹھے۔ کون ہے وہ بدنصیب؟"

"مذاق مت کرو استاد۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ کیا میں تم کو سنجیدہ نظر نہیں آرہا۔" راجو اپنے چہرے پر دنیا جہان کی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔

"اب یہ بتاؤ کون ہے وہ حسینہ جو تم جیسے فلرٹ کا دل لے اڑی۔"

"وردا جی...... مگر کسی کو بتانا مت۔" راجو نے ہلکے سے کہا۔

"کیا...... تمہیں وردا سے محبت ہو گئی ہے؟ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو میرے دوست۔" مراد نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ تم اور پریشان مت کرو۔"

"تو ابھی تک تم نے اس سے کچھ کہا؟" مراد نے تجسس سے پوچھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا...... وہ میری زبان کھینچ لے گی۔ ابھی کچھ نہیں کہوں گا۔ بس اپنی اس محبت کو اپنے دل تک ہی محدود رکھوں گا۔"

"پھر تو پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔" مراد نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی کل رات اسی چکر میں نیند نہیں آئی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر جا کر وردا کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کے رکھ دو۔ پریشانی کیا ہے؟"

"نہیں استاد۔ میں انہیں کچھ نہیں بتا پاؤں گا۔ بس تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا پھر سے محبت کے چکر میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" راجو بولا۔

"چکر میں تو تم پڑ ہی چکے ہو۔ تمہارا دل وردا لے گئی اور میرا دل سحرش۔ ہم دونوں ہی اس چکر میں بری طرح سے پھنس چکے ہیں یار۔" مراد نے اپنی اور راجو کی مصیبت کا کھل کا اظہار کیا۔

"استاد تمہارا تو پھر بھی تھوڑا بہت چانس ہے۔ لیکن میرا دل تو کم بخت ایسی جا اٹکا ہے جہاں کوئی

چانس ہی نہیں ہے۔ اچھا استاد اب میں چلتا ہوں۔ ڈیوٹی پر لیٹ ہو رہا ہوں......" راجو اٹھتے ہوئے بولا۔ "ارے ہاں۔ ایک بات اور کہنی تھی۔"

"وہ کون سی؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اس جنگل میں ہی کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ درندہ اپنی زیادہ تر وارداتیں اس جنگل یا اس کے آس پاس ہی کرتا رہا ہے۔ تم اس کی وجہ سمجھ سکتے ہو؟"

"بات تو تمہاری صحیح ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ جنگل اپنے اندر کوئی راز لیے ہوئے ہو۔" مراد نے کہا۔

"میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔" راجو نے کہا اور مراد سے اجازت لے کر چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو نے تھانے پہنچ کر چوہان سے وردا کے لیے دو سپاہی مزید مانگ لیے۔ جو وردا کی گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک کی حفاظت کے لیے ہوں۔

"جن سپاہیوں کی ڈیوٹی وردا کے آفس کے باہر لگائی ہے وہ بھی اس کے ساتھ آ جا سکتے ہیں۔ پرابلم کیا ہے۔" چوہان نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے سر...... میں ذرا میڈم سے مل آؤں۔"

"بالکل مل آؤ...... ہم تو دور ہی رہتے ہیں ایسی قیامت سے۔" چوہان ہنستا ہوا بولا۔

راجو نے شہلا کے کمرے میں داخل ہو کر سلیوٹ مارا۔

"سروس ریوالور مل گئی تمہیں۔" شہلا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"جی میڈم۔ تھینک یو میڈم آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

"کچھ مصروف ہوں۔ اگر بہت ضروری ہے تو بولو۔" شہلا نے کہا۔

"میڈم اس درندے کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے بیٹھ کر بتاؤ کیا بات ہے۔"

"میڈم میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ اس قاتل نے زیادہ تر وارداتیں جنگل یا اس کے آس پاس ہی کی ہیں۔"

"آج کی واردات کا پتہ چلا تمہیں؟" میڈم نے ایک انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میڈم۔ کیا ہوا۔"

"کل وردا شمسی کے آفس کے عین باہر قتل ہوا ہے۔ کہاں رہتے ہو تم۔ ایسے کرو گے نوکری؟" شہلا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا...... مجھے کسی نے انفارم ہی نہیں کیا۔" راجو فوراً بولا۔

"آس پاس کیا ہو رہا ہے اس کی خبر رکھنا تمہاری ڈیوٹی ہے۔ یہ کسی اور کی ڈیوٹی نہیں کہ تمہیں انفارم کرتا پھرے۔ ایسے بے خبر رہو گے تو پولیس کے محکمے میں زیادہ عرصہ نہیں چل پاؤ گے۔"

شہلا کی بات سن کر راجو کا چہرہ اتر گیا۔

"مجھے لگتا ہے وہ درندہ وردا کے لیے ہی آیا تھا وہاں۔ لیکن کسی وجہ سے وہ وردا کو نقصان نہیں پہنچا سکا۔" راجو پرخیال لہجے میں بولا۔ "اس کا مطلب ہے وردا جی کو پہلے سے زیادہ پروٹیکشن کی ضرورت ہے۔"

"بالکل۔ آج سے تم چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہو گے۔ وردا کی حفاظت کرنا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ میں نے وردا کو بھی بتا دی ہے یہ بات، وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ تمہاری جگہ کسی اور کو رکھا جائے۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟" شہلا کی نظریں

راجو پر گڑی ہوئی تھیں۔ "لیکن کچھ وجوہات کی وجہ سے مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"ایسا کیوں میڈم؟"

"اس درندے کی جانب سے مجھ پر جو گولی چلائی گئی تھی۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی ہے۔ وہ گولی جیپ میں گھس گئی تھی۔ میں نے اس کی جانچ کروائی ہے۔"

"یہ تو بہت گمبھیر بات ہے میڈم۔ آپ نے اتنی بڑی بات مجھے بتا دی۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد ہے۔" راجو نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اگر ایسے بے خبر رہو گے تو جلد ہی میرا اعتماد کھو دو گے۔ تمہیں بہت الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔"

"سمجھ گیا میڈم۔"

"جاؤ اب۔ آج سے تمہاری ڈیوٹی بس وردا کی حفاظت ہے۔ اگر درندے کو پکڑنا ہے تو وردا کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔" شہلا نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی بھی تو اس کی زندگی سے جڑی ہے۔" راجو بڑبڑایا۔

"کچھ کہا تم نے؟"

"نہیں میڈم۔ اب مجھے اجازت؟"

"ہاں جاؤ۔ اور ہاں وہ سب سپاہی جو وردا کی حفاظت پر مامور کیے گئے ہیں وہ اب تمہارے ماتحت کام کریں گے۔ اپنی ڈیوٹی اچھے طریقے سے انجام دینا۔"

"مجھے معطل نہیں ہونا ہے میڈم۔" راجو نے کہا۔

"اوکے۔ اب جا کر اپنی ڈیوٹی کرو۔"

"تھینک یو میڈم۔" راجو شہلا کو سلیوٹ کر کے باہر نکل آیا۔

وردا جی کے ساتھ چوبیس گھنٹے۔ اس سے اچھی ڈیوٹی اور کیا ہو سکتی ہے میرے لیے۔ مگر وہ اس بات کو لے کر کیا سوچ رہی ہوگی۔" راجو تھانے سے باہر نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

راجو جیپ میں بیٹھ کر وردا کے آفس کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت تو وہ آفس میں ہی ہوگی۔ پتہ نہیں مجھے دیکھ کر ان کا کیا ردعمل ہوگا۔ مگر یہ پولیس کی گولی والا معاملہ تو اور بھی زیادہ الجھا ہوا ہے۔ آخر میڈم کا مطلب کیا تھا اس بات سے...... کیا وہ درندہ کوئی پولیس والا ہے......؟ یا پھر وہ بلیک مارکیٹ سے پولیس کی گولیاں خرید کر استعمال کر رہا ہے۔ صرف پولیس کی گولی ہونے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ پولیس والا ہے۔ جو بھی ہو۔ یہ معاملہ ہے بہت پیچیدہ۔ مجھے الرٹ رہنا ہی ہوگا۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی بھی وردا جی کو خراش تک نہیں پہنچا سکتا۔"

"کل خون کس جگہ ہوا تھا۔" وردا کے آفس پہنچ کر اس نے ڈیوٹی پر موجود سپاہی سے پوچھا۔

"سر جہاں آپ کھڑے ہیں۔ بالکل اسی جگہ لاش ملی تھی۔"

"کیا کہا۔" راجو فوراً اس جگہ سے ہٹ گیا۔

"تم لوگوں نے دیکھا تھا کچھ؟"

"سر ان میڈم کے چلے جانے کے بعد ہم بھی چلے گئے تھے۔ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔" سپاہی بولا۔

"اب میری ڈیوٹی بھی میڈم کی حفاظت پر لگا دی گئی ہے۔ مجھے بتائے بنا ادھر ادھر مت جانا۔ میرا موبائل نمبر لے لو۔ کوئی بھی بات ہو تو فوراً مجھے کال کر دینا۔"

"اوکے سر۔" دونوں سپاہیوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

راجو نے آفس کے باہر اچھی طرح معائنہ کیا۔ پھر پہلے تو وردا کی وجہ سے اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی آفس کے اندر جانے کی مگر پھر ہمت کر کے اندر چلا ہی گیا۔

"کوئی اور راستہ ہے آفس میں آنے کا۔" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔ بس یہی ایک راستہ ہے۔ جہاں سے آپ اندر آئے ہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"پیچھے کی طرف تو کوئی دروازہ نہیں ہے نا؟"

"نہیں صاحب۔ پیچھے کی طرف کوئی دروازہ نہیں ہے۔" چوکیدار بولا۔

راجو چوکیدار سے باتیں کرتا ہوا اندر آ رہا ہے اور سامنے سے وردا فائل ہاتھ میں لیے اپنے باس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے پر دھیان نہیں تھا۔ اور اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ وردا کی نظر راجو پر پڑ گئی۔

"تم آفس میں کیا کر رہے ہو؟"

"وردا جی! آپ کے حفاظتی انتظامات کے لیے آفس کا معائنہ کر رہا ہوں۔ میں نے چیک کر لیا ہے۔ اندر آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور باہر ہم موجود ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے تم باہر ہی رہو گے۔ شکریہ۔" وردا نے کہا۔

"ہاں میں باہر ہی رہوں گا۔ اگر کوئی بھی بات ہو تو آپ مجھے فون کر دینا۔"

"ہاں ٹھیک ہے تم باہر ہی رہو۔ بار بار اندر مت آنا۔ آفس کے کام میں خلل پڑتا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں وردا جی۔ میری وجہ سے آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر راجو آفس سے باہر آ گیا اور آفس کے سامنے کھڑی اپنی جیپ میں بیٹھ گیا۔

وردا جی تو آج بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر غصہ کیوں آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں حسین لوگوں کی ناک پر اتنا غصہ کیوں دھرا رہتا ہے۔ راجو یہ سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھنگھور اندھیرا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ بہت گھبرا گئی۔ پہلے تو اسے لگا کہ یہ ایک خواب ہے۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کہاں ہوں میں۔" اس نے سوچا۔

وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ اچانک وہ کسی سے ٹکرائی۔

"کک.... کون ہے۔" اور وہ وہاں سے پیچھے ہٹ گئی۔

"پہلے تم بتاؤ تم کون ہو۔" اسے آواز سنائی دی۔

"یہ کیا مذاق ہے۔ میں یہاں کیسے آئی؟"

"کیا تمہاری آنکھ بھی یہیں کھلی ہے۔ مجھے بھی ابھی ہوش آیا تو خود کو اس اندھیری جگہ پر پایا۔"

تب کمرے میں ایک بلب روشن ہوا جس سے تھوڑی دیر کے لیے ان کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لڑکی جوان تھی۔ عمر یہی کوئی اکیس بائیس سال کے لگ بھگ رہی ہو۔ آدمی چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کئی سوال ان کے دل میں ابھر آئے۔

"تم دونوں کو یہاں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔" کرسی پر بیٹھا ہوا نقاب پوش گویا ہوا۔

اس آواز کو سن کر وہ حیران رہ گئے۔ انہیں لگا تھا کہ

وہ دونوں یہاں اکیلے ہیں۔

"تم کون ہو بھائی اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" آدمی نے پوچھا۔

"ایک درندہ صفت قاتل سے اس کی پہچان پوچھتے ہو۔ زیادہ سوال کرو گے تو ابھی کاٹ ڈالوں گا۔" درندہ غرایا۔

یہ سنتے ہی دونوں بری طرح کانپنے لگے۔

"آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟" آدمی نے پھر پوچھا۔

"تم اس لڑکی کا ریپ کرو اور یہ لڑکی تم سے بچنے کی کوشش کرے گی۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں چھوڑ دوں گا اور اس لڑکی کو کاٹ ڈالوں گا۔ اگر یہ لڑکی خود کو تم سے بچا لے گی تو اسے یہاں سے جانے دوں گا اور تمہیں کاٹ ڈالوں گا۔ سمپل گیم ہے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" درندے نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

دونوں یہ حکم سن کر بھونچکا سے رہ گئے۔

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" لڑکی نے کانپتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کے پاس یہ کھیل کھیلنے کے لیے صرف ایک گھنٹے کا وقت ہے۔ نہیں کھیلو گے تو دونوں مرو گے۔ لیکن کھیل کے نتیجے میں کسی ایک کی جان بچ سکتی ہے۔" درندے نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پلیز ہمیں چھوڑ دو۔"

درندے نے پستول اٹھائی اور آدمی کا نشانہ لیا۔

"رک.... رکو...... میں کوشش کرتا ہوں۔" آدمی نے جان کے خوف سے جلدی سے کہا۔

"کیا! تم اس درندے سے ڈر کر میرے ساتھ یہ کرو گے۔ میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" لڑکی بولی۔

"ہا.... ہا۔ یہی تو ساری گیم ہے۔ یہ لڑکی تو بڑی جلدی سمجھ گئی۔" درندہ بے رحمی سے ہنستے ہوئے بولا۔

"وقت برباد مت کرو۔ ورنہ دونوں مارے جاؤ گے۔"

آدمی تیزی سے لڑکی کی طرف بڑھا اور اسے دبوچ لیا۔

"مجھے یہاں سے زندہ نکلنا ہے۔"

لڑکی نے زور کا دھکا دیا جس سے وہ دور جا گرا۔

"پاگل مت بنو۔ یہ ویسے بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" شاید لڑکی اس درندے کی فطرت کو سمجھ گئی تھی۔

لیکن وہ آدمی بات ان سنی کرتے ہوئے دوبارہ لڑکی پر ٹوٹ پڑا اور اسے بری طرح سے مارنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی چکرا کر زمین پر گر گئی۔

"مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ لیکن صورتحال ہی ایسی ہے۔ ہر انسان کو اپنی جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ آدمی لڑکی پر حاوی ہونے لگا۔ لڑکی خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی تو آدمی نے تین چار تھپڑ اور جڑ دیئے۔

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"بہت خوب۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ہی یہاں سے باہر نکلو گے۔" درندے نے اسے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

آدمی نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لڑکی کو بے لباس کر دیا اور ادھر کمرے میں لڑکی کی چیخ گونجی ادھر وہ آدمی بھی بری طرح سے چیخ پڑا۔

"نہیں۔"

درندے نے اپنا خنجر اس کی گردن میں گھونپ دیا تھا۔ لڑکی نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ ماجرا دیکھا تو خوف کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئی۔

"یہ پلان اچھا ہے شکار کو اٹھا کر یہاں لاؤ اور آرام سے جب دل کرے سکون سے کاٹ ڈالو۔

لڑکی تو شاید بے ہوش ہوگئی۔ یہ بہت کام آئے گی۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

شہلا اپنے آفس میں فون پر کسی سے بات کررہی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی چھلک رہی تھی۔ فون رکھ کر اس نے بیل بجائی۔

"جی میڈم۔" سپاہی اندر آکر بولا۔

"انسپکٹر چوہان کو بلاؤ۔ جلدی۔" شہلا نے کہا۔

"او کے میڈم۔" سپاہی سلیوٹ مار کر نکل گیا اور تھوڑی ہی دیر میں چوہان تقریباً بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"جی آپ نے بلایا۔" انسپکٹر چوہان نے کمرے داخل ہوکر کہا۔

"ہمارے اس حلقے کے جو ایم پی اے ہیں ان کی بیٹی نشاء کو درندے نے اغواء کرلیا ہے اور اس نے مطالبہ کیا ہے کہ وردا شمسی کو اس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ نشاء کو مار ڈالے گا۔"

"اس درندے نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔" چوہان نے کہا۔

"جب ہمارا محکمہ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرے گا تو یہی ہوگا۔ کل جنگل میں بھی بیس منٹ کا بول کر ایک گھنٹے میں پہنچی تھی تمہاری کمک۔ تم سب ایک نمبر کے نکمے ہو۔" شہلا نے طیش میں آکر کہا۔

"سوری میڈم۔ لیکن سب کو اکٹھا کرنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جاؤ اور پتہ کرو کہ اس درندے نے فون کہاں سے کیا تھا ایم پی اے کے گھر۔ کچھ کرو ورنہ ہم سب کی نوکری خطرے میں ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میڈم۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ مجھے اجازت؟"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ لیکن میں رزلٹ چاہتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔

"میرے علاقے میں ہی ہونا تھا یہ سب۔" چوہان کے جانے کے بعد شہلا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"نشاء...... میری پیاری نشاء...... اٹھ جاؤ... سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اٹھو نا۔" درندے... نشاء کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

لگتا تھا نشاء کو بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا وہ... خون خرابہ دیکھ کر اسے اب تک ہوش نہیں آیا... درندہ بڑی بے صبری سے اس کے ہوش میں آنے... انتظار کر رہا تھا۔

وہ نشاء کے گالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "نشاء...... اٹھو...... میں تمہاری ان پیاری آنکھوں... بسا ہوا خوف دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتنا حسین خوف بار... کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب میں نے لائٹ آن... تھی تو تمہارے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف... بہت لطف اندوز ہوا تھا میں...... دوبارہ وہ خوف... دکھاؤ نا۔ اٹھو نا۔" درندہ کسی ضدی بچے کی طرح بے چین ہو رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے لاشعور میں نشاء نے اس کی بات سن لی ہو۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں... لیکن درندے کو پاس بیٹھا دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگی۔... کا ڈر اپنی انتہا کو چھو رہا تھا۔

"اٹھ گئی میری پیاری نشاء۔" درندہ خوش ہو... ہوئے بولا۔ "گڈ۔ اب مزا آئے گا۔"

"مجھے جانے دو پلیز...... مجھ پر رحم کرو...... نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" نشاء رو پڑی۔

"میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر سب ... کرنے لگوں گا تو پھر کاٹوں گا کس کو۔ تم بات کو...

کوشش کرو۔" درندہ بڑی رسانیت سے بولا۔ جیسے وہ کسی کو مارنے کی نہیں کھانے پینے کی بات کر رہا ہو۔

اب نشاء نے غور کیا تو اسے لگا کہ وہ اس پہلی جگہ پر نہیں ہے جہاں اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کمرے میں کوئی بیڈ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور وہ درندہ اب اس کے بیڈ کے پاس کھڑا ہوگیا تھا۔ لیکن یہ کمرہ بھی اس پہلے والے کمرے سے ملتا جلتا ہی تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو چاروں طرف۔ چلو ایک اور کھیل کھیلتے ہیں۔ یہ خنجر دیکھو۔ کتنا تیز ہے۔ اور میں...... تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں بھی کتنا تیز ہوں۔ اب تمہیں بتانا ہے کہ تمہیں کس کی تیزی پسند ہے۔ میری یا اس خنجر کی۔ اگر خنجر کہو گی تو یہ خنجر آرام سے تمہارے اس خوبصورت بدن کی کھال کو کاٹتا ہوا اندر کا گوشت باہر نکال لائے گا اور میں پسند ہوں۔ تو...... تو پھر میں وہی کروں گا جو ایک مرد کو تم جیسی حسین لڑکی کے ساتھ کرنا چاہیے۔"

"مجھے کوئی کھیل نہیں کھیلنا۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ۔ پلیز مجھے چھوڑ دو۔" نشاء پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"فنکار ہوں میں فنکار...... قتل کرنا بھی ایک فن ہے۔ بہت ہی آرٹسٹک طریقے سے مارتا ہوں میں لوگوں کو۔ مرنے والوں کو تو فخر ہونا چاہیے کہ وہ میرے فن کا حصہ بنے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میں نے اس آدمی کو کتنے خوبصورت انداز سے مارا تھا۔ تاریخ میں سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے لائق...... ایک قاتل کو اتنا ہی اسٹائلش ہونا چاہیے۔ تم نے دیکھا میں نے اس کمینے کو یہ حرکت کرنے سے پہلے ہی تمہیں اس سے نجات دلا دی...... کیوں...... اس لیے کہ بھئی ریپ

مسلمان کا حق

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔

۱۔ جب ملاقات کرے تو سلام کرے۔
۲۔ جب وہ بلائے تو اس کی دعوت رد نہ کرے۔
۳۔ جب وہ مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دے۔
۴۔ جب وہ چھینکے تو الحمد اللہ کہے۔
۵۔ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے (یعنی بیمار پرسی کرے)
۶۔ جب وہ مرجائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔

(مرسلہ: **محمد ایوب**...... گجرات)

کرنا بہت بری بات ہے۔ اس آرٹسٹک قتل میں، میں نے لوگوں کو یہی پیغام دیا ہے۔ وہ نئے لوگ جو اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ اب تم بتاؤ کہ تمہیں کیا پسند ہے۔ خنجر یا میں...... فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ جلدی سے بتاؤ ورنہ میں خود کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلوں گا اور ہوسکتا ہے میرا فیصلہ تم کو پسند نہ آئے۔ اور ہاں زبان سے بولنا ہے۔ خنجر یا درندہ۔" درندہ مزے لے لے کر نشاء کا خون خشک کر رہا تھا۔

نشاء بیچاری کرتی بھی تو کیا۔ اس نے روتے ہوئے درندے کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔

"بولے گا کون...... تیرا باپ بولے گا کیا؟" درندہ پھر غرایا۔

"درندہ۔" نشاء نے لاچاری سے کہا۔

"یعنی تم مجھے وہ سب کرنے کی اجازت دے رہی ہو جو ایک مرد کسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ کرتا ہے۔"

"ہا...... ہاں۔" نشاء نے جیسے تیسے کہا۔

"تم جیسی بے شرم لڑکی تو میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" درندہ غصے سے بل کھاتا ہوا بولا۔ "پہلے تم نے اپنے کنوارے بدن پر اس آدمی کو حاوی ہونے دیا اور

اب مجھے کھلے عام دعوت دے رہی ہو۔ تم نے تو ایک ہی دن میں طوائف بننے کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اب تمہارے جسم میں یہ خنجر ہی جائے گا۔ سمجھ لو...... مجھے تم جیسی بے شرم لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ یہ خنجر تمہاری گوری چمڑی کے پار جائے گا تو آرٹ کا ایک اور شاہکار وجود میں آئے گا۔ ہی...... ہی...... لیکن ابھی نہیں...... ابھی کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ تمہارے بدلے میں نے وردا شمسی کو مانگا ہے۔ اس وردا شمسی نے میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس وقت سے میں ہوشیار ہو گیا ہوں۔ اب میں یہ نقاب پہن کر اپنا فن دکھاتا ہوں۔ میرے جیسا فنکار گمنام ہی رہے تو اچھا ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔"

"جب وہ وردا شمسی تمہیں مل جائے گی تو تم مجھے چھوڑ دو گے نا۔" نشاء نے سسکتے ہوئے پرامید لہجے میں پوچھا۔

"اپنا اصلی کھیل میں کسی سے ڈسکس نہیں کرتا۔ اس آدمی کو بھی یہ امید تھی کہ وہ تمہارا ریپ کرے گا تو بچ جائے گا۔ لیکن میرا کھیل یہ تھا کہ جیسے ہی وہ تم پر حاوی آئے گا میں اس کی گردن کاٹ دوں گا۔ بہت باریک بینی کا کام ہے یہ فن ہے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بس ایک بار وردا مل جائے۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔" اور کمرے میں درندے کے بھیانک قہقہے گونجنے لگے۔

"تم جو چاہو میرے ساتھ کرلو۔ لیکن پلیز مجھے مت مارو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔" نشاء نے کہا۔ اس کا گلابی چہرہ ڈر کے مارے سفید پڑنے لگا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

"یہی تو وہ خوف ہے۔ جس کی پرچھائیں میں تمہارے دمکتے ہوئے چہرے پر دیکھنا چاہتا ہو[ں] شاندار...... انتہائی خوبصورت۔" درندہ نشاء کے خ[وف] سے محظوظ ہوتا ہوا بول رہا تھا اور نشاء کو اپنی زندگی کے لمحات کم ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شہلا احمد بہت پریشانیوں میں گھری ہوئی تھ[ی] اسے اوپر سے بار بار فون آ رہے تھے۔ اس کی تو جان بن آئی تھی۔ ایک ایم پی اے کی بیٹی کا اغواء کوئی معم[ولی] بات نہیں تھی۔ اس وقت شہلا پر بہت زیادہ سیاسی [دباؤ] تھا۔ سینئر آفیسروں کی ڈانٹ الگ کھانی پڑ رہی تھ[ی] اس پر یہی دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وردا شمسی ایک عام [لڑکی] ہے۔ اسے چپ چاپ درندے کو سونپ کر ایک س[یاسی] شخصیت کی بیٹی کو بچا لیا جائے۔ کیونکہ ایک عام ش[خص کی] لڑکی کے مقابلے میں وی وی آئی پی شخصیت کی بیٹ[ی کی] زندگی زیادہ قیمتی تھی۔

کچھ سوچ کر شہلا نے راجو کو فون کیا۔

"جی میڈم۔ بولیئے۔"

"وہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے میڈم۔ میں آفس کے باہر مو[جود] ہوں۔ میری نظر اس کے آفس پر ہی ہے۔"

"آفس پر نظر رکھ کر کیا کرو گے بے وقوف۔ [اس] کے پاس رہو۔ اس پر نظر ہونی چاہیے تمہاری۔ با[ت] بہت سیریس ہوتی جا رہی ہے۔"

"کیا بات ہے میڈم۔ آپ کے لہجے سے لگ[تا ہے] کہ جیسے آپ بہت پریشان ہیں۔" راجو نے پوچھا۔

"بات ہی پریشانی کی ہے۔" یہ کہہ کر شہلا [نے] راجو کو ساری بات بتادی۔

"اوہ میرے خدا۔ اس درندے کی ہمت تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

"جب پولیس کچھ نہیں کر پائے گی تو اس کا انجام یہی ہونا ہے۔ تمہیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"کیا ہم وردا کو اس درندے کے حوالے کر دیں۔ صرف اس لیے کہ ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو بچانا ہے۔" راجو نے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

شہلا کچھ نہیں بولی۔ اس کے پاس راجو کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"میڈم اگر ایسا ہوتو میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔ مجھے نہیں کرنی ایسی نوکری جہاں زندگی کے معاملے میں بھی امتیاز برتا جائے۔" راجو بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ کیا یہ وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ایک بات اور سن لو اگر اس درندے کے مطالبے کے آگے ہمارے محکمے کو جھکنا پڑا تو میں بھی استعفیٰ دے دوں گی۔ وہ درندہ بہت خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔"

شہلا کی باتوں سے راجو کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "آپ بے فکر رہیں میڈم۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری ایمانداری سے انجام دوں گا۔"

جیسے ہی راجو نے فون بند کیا اسے وردا آفس کے گیٹ سے باہر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اور راجو کی آنکھیں اس پر چپک کر رہ گئیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے راجو کی آنکھیں چھلک آئیں۔

"میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا وردا جی۔ کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

وردا کے کچھ ضروری کاغذات کار میں رہ گئے تھے وہ انہیں لینے آئی تھی۔ کاغذات لے کر جب وہ آفس جانے کے لیے مڑی تو اس نے راجو کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی وردا کی آنکھوں

اقوال زریں

۱۔ گلے اور شکوے سے زبان بند رکھو راحت نصیب ہوگی۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

۲۔ جس پر نصیحت کا اثر نہ ہو وہ جانے کہ میرا دل ایمان سے خالی ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

۳۔ حصول علم کے لیے دلجمعی درکار ہے اور دلجمعی معلومات کو بڑھانے سے نہیں گھٹانے سے حاصل ہوتی ہے۔

(امام ابوحنیفہؒ)

۴۔ جو علم کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔

(امام ابوحنیفہؒ)

۵۔ سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے۔

(افلاطون)

۶۔ صورت بغیر سیرت کے ایک پھول ہے جس میں کانٹے زیادہ ہوں اور خوشبو بالکل نہ ہو۔

(ارسطو)

۷۔ خامیوں کا احساس کامیابی کی کنجی ہے۔

(بقراط)

(مرسلہ: سید عتیق الرحمن...... کراچی)

میں جیسے شعلے اتر آئے۔ وہ پلٹتی ہوئی تیزی سے اس کے قریب آئی اور اسے آتے دیکھ کر راجو کی حالت غیر ہونے لگی۔

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔ کیوں گھور رہے تھے مجھے۔ تمہیں یہاں میری حفاظت کے لیے رکھا گیا ہے۔ مجھے گھورنے کے لیے نہیں۔ آئندہ ایسا کیا تو تمہاری شکایت کردوں گی تمہاری میڈم سے۔" وردا نہایت غصے سے بول رہی تھی۔

راجو بیچارے سے کچھ بولے نہیں بن رہا تھا۔ وہ

ویسے بھی اس وقت وردا کے لیے جذباتی ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں اسے وردا کی پھٹکار بھی ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی اس پر پھول برسا رہا ہو۔ اس حالت میں بھی وہ وردا کو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

"بہت بے شرم ہو تم۔ ابھی بھی گھور رہے ہو مجھے۔" وردا کا غصہ اور بڑھ گیا۔

راجو کو جیسے ہوش آ گیا۔ "اوہ سوری..... آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"غلط نہیں۔ میں تمہیں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ اس طرح ٹکٹکی لگا کر مجھے گھورنے کا مطلب کیا ہے؟"

"ڈی ایس پی صاحبہ کا حکم ہے کہ آپ پر نظر رکھوں۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو سوری۔" راجو بولا۔

"آئندہ ایسے کیا تو خیر نہیں تمہاری۔" یہ کہہ کر وردا پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

"وہ ڈانٹ رہی تھی مجھے اور میں سمجھ ہی نہیں پایا۔ مجھے لگا کہ وہ پیار سے بات کر رہی ہیں۔" خود بخود راجو کے ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا ہونے لگے۔

وردا آفس کی طرف جا رہی تھی اور اس کی ہرنی جیسی چال راجو کے دل پر ستم ڈھا رہی تھی۔

"کاش میں آپ کو اپنے دل کی بات کہہ پاتا۔ مگر جو بات ممکن نہیں، اس کے کہنے سے بھی کیا فائدہ۔ خدا آپ کو صحیح سلامت رکھے وردا جی۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ آپ سب سے الگ ہیں۔ کوئی لڑکی آپ کی برابری نہیں کر سکتی۔" راجو کے دل سے یہی آواز اٹھ رہی تھی۔

درندے نے وردا کو اس کے حوالے کرنے کے لیے چار دن کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ اور اس بات سے پورے محکمے میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ درندے کو ٹریس کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ سب سے زیادہ دباؤ کا شکار شہلا احمد تھی۔ اسے ہی اعلیٰ حکام کی طرح طرح کی باتیں سننا اور برداشت کرنا پڑ رہی تھیں۔ ادھر راجو بھی وردا کے لیے بہت فکر مند تھا، وہ الجھن کا شکار تھا کہ اس کا محکمہ وردا کے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ سارا دن وردا کے آفس کے باہر بیٹھا رہتا اور شام کو اسے گھر تک پہنچاتا۔ کیونکہ اس کی تو چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی لگی تھی وردا کی حفاظت کے لیے۔

"وردا جی آپ کسی بات کی فکر مت کریں۔ میں ہوں نا یہاں ہر وقت۔"

"تم ہو۔ تبھی تو فکر مند ہوں۔" وردا نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ کہا آپ نے؟"

"کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وردا اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ اور راجو باہر اپنی جیپ میں بیٹھ گیا۔ چاروں سپاہیوں کو اس نے الرٹ رہنے کا کہہ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے اور ایک ٹرین کراچی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس ٹرین کو صبح سات بجے کراچی پہنچنا تھا۔

ایک حسین اکیس سالہ لڑکی سیٹ پر بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ ناول کا نام تھا "بلاوا"۔ اس ایئر کنڈیشنڈ کوپے میں وہ اکیلی ہی تھی اور پوری طرح سے ناول کے دلچسپ واقعات میں کھوئی ہوئی تھی۔

ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی اور کوپے کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکا ڈھیر سارا سامان لے کر چڑھ آیا۔

"اف اتنا سارا سامان کہاں ایڈجسٹ ہوگا۔"

ٹرین چل پڑی اور وہ لڑکا سامان ترتیب سے رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس کوشش میں اس نے کافی ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔

"ایکسکیوز می۔ یہاں کوئی اور بھی ہے۔ آپ مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔" لڑکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ پہ تو سب سے پہلے نظر گئی تھی۔ سوری سامان کچھ زیادہ ہے۔ لیں ہو گیا ایڈجسٹ۔ آپ سکون سے ناول پڑھ سکتی ہیں۔ ویسے مجھے رفیق کہتے ہیں۔ رفیق مغل۔ کراچی جا رہا ہوں۔ کیا آپ بھی وہیں جا رہی ہیں۔" رفیق نے خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اب ڈسٹرب مت کرنا۔ مجھے ناول پڑھنے دو۔"

"ہاں بالکل۔" رفیق نے ہنس کر کہا۔ "وہ بلاوا پڑھ رہی ہیں آپ۔ میں بھی یہ ناول پڑھ چکا ہوں نئے افق ڈائجسٹ میں۔ بہت دلچسپ کہانی ہے۔ ہندو مائتھالوجی کو بہت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے مصنف نے۔"

لڑکی نے رفیق کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ناول پڑھنے میں مگن ہو گئی۔ "اسٹوپڈ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"شکر ہے میرے پاس بھی ناول ہے۔ میں بھی سیوک پڑھتا ہوں بیٹھ کر۔ آپ بھی پڑھیے میں بھی پڑھتا ہوں۔" یہ کہہ کر رفیق لڑکی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"آپ سیوک پڑھ رہے ہیں۔" لڑکی نے تجسس کے مارے پوچھ بیٹھی۔ لگتا تھا وہ کتابوں کی عاشق تھی۔ ورنہ عام طور پر تو آج کل مطالعے کا شوق ختم ہی ہوتا جا رہا ہے۔ "کس بارے میں ہے یہ؟"

اسراف

حضرت قیس انصاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے بھائیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی کہ ہمارا بھائی بہت اسراف کرتا ہے اور اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے باغ میں سے اپنا حصہ لیتا ہوں اور اس حصے کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں اور جو مجھ سے ملنے جلنے آتا ہے ان کو بھی کھلاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر تین بار ارشاد فرمایا کہ خرچ کیا کرو اللہ جل شانہٗ تجھ پر خرچ فرمائیں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں ایک سفر پر گیا تو میرے پاس سواری بھی اپنی تھی اور اپنے سب گھر والوں سے زیادہ ثروت مجھے حاصل تھی یعنی جو لوگ احتیاط کے ساتھ خرچ کرتے تھے ان کے پاس اتنا نہ تھا جتنا مجھ دریغ خرچ کرنے والے کے تھا۔

(مرسلہ: **محمد حاشم خان** ..... مندہ خیل)

"یہ ناول ایک معصوم سی لڑکی کے بارے میں ہے جس کی جنات سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سادہ سی کہانی ہے۔ بس سسپنس ہے اس میں۔" رفیق نے ہلکی سی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں۔ اب یاد آیا۔ میں نے بھی پڑھی ہے یہ کہانی بہت اچھی ہے۔"

"تو آپ نے بھی پڑھی ہے۔ اس میں سب سے اچھا کردار کون سا لگا آپ کو؟" رفیق شاید باتوں کے موڈ میں تھا۔

"آپ کہانی پڑھیں اور مجھے بھی پڑھنے دیں۔" لڑکی نے خشک لہجے میں کہا۔

"آپ کا نام جان سکتا ہوں۔ ہم سفر کی حیثیت سے کم از کم اتنا جاننا تو میرا حق بنتا ہے۔"

"ریما۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ کہیں آپ فلم سٹار ریما تو نہیں۔" رفیق نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ کیا میں آپ کو عمر رسیدہ کی نظر آتی ہوں؟ اب پلیز کیا آپ مجھے سکون سے ناول پڑھنے دیں گے۔" ریما نے کہا۔

"میں نے بھی اس ناول کا پہلا باب ہی پڑھا ہے۔ کچھ ڈسکس کریں اس بارے میں۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ۔"

"آپ اپنا ناول پڑھیں اور مجھے اپنا ناول پڑھنے دیں۔" ریما نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

رفیق چپ ہو کر کہانی پڑھنے لگا اور اس کے چہرے کی بیچارگی دیکھ کر ریما مسکرا دی۔

"یہ تو مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ مذاق بنا لیا ہے اس نے مجھے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔" یہ سوچ کر رفیق برتھ سے اٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" ریما نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ مجھے آپ کے سامنے نہیں بیٹھنا۔ کہیں اور بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ آپ تو مجھے کارٹون سمجھ کر ہنسے جا رہی ہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ سوری اگر میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہو تو۔"

رفیق آ کر ریما کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"آپ کا ایسے مسکراتے ہوئے دیکھنا مجھے تڑپا رہا ہے۔ میں بہک گیا تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"اب نہیں مسکراتی۔ آپ پڑھ لیجئے۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" رفیق نے ایسے کہا جیسے ریما نے اس پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔ "اچھا تمہارے بھیا کا نام کیا ہے؟" رفیق نے پوچھا۔

"راحت چوہان..... کیوں؟" ریما بولی۔

"بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

سات بج رہے تھے جب ٹرین کراچی کے کینٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ رفیق اور ریما نے ایک دوسرے کو بائے کہا اور اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک دس بج رہے تھے جب رفیق مغل تھانے میں داخل ہوا۔

"آ گئے آپ؟" چوہان نے کہا۔

"جی ہم آ گئے۔"

"ڈی ایس پی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ سنبھل کر رہنا۔ قیامت ہے قیامت۔ میری تو جان چھوٹی آپ کے آنے سے۔ اب اس درندے کا کیس آپ سنبھالیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس درندے کو بھی دیکھ لیں گے کہ اس کے دانت کتنے تیز ہیں۔ میں میڈم سے مل کر آتا ہوں۔" انسپکٹر رفیق مغل مسکراتا ہوا شہلا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"اب پتہ چلے گا اسے کہ پولیس کی نوکری کیا ہوتی ہے رفیق مغل۔ ہونہہ۔" چوہان بڑبڑایا۔

رفیق شہلا کے کمرے میں داخل ہوا۔ شہلا فون پر مصروف تھی، رفیق چپ چاپ اندر آ کر ان کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شہلا نے فون رکھا اور بولی۔

"جی۔ آپ کون؟"

"میں رفیق..... رفیق مغل۔"

"اوہ..... آج ہی آ گئے تم۔"

"اب جب آپ نے میری معطلی ختم کروا دی تو آنے میں دیر کیوں کرتا۔" رفیق نے جواب دیا۔

"گڈ..... بیٹھو..... میں نے تمہارا سروس ریکارڈ دیکھا ہے۔ میں تمہیں ایک بہت الجھا ہوا کیس دینا چاہتی ہوں۔ ہینڈل کر لو گے۔"

"آپ حکم کریں۔ اچھا کام کرنے پر ہی میں معطل ہوا تھا۔" رفیق نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"بس زیادہ کہانیاں مت سناؤ۔ میں سب جانتی ہوں تب ہی تو تمہیں دوبارہ لیا گیا ہے محکمے میں۔" شہلا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت کڑک ہے بھئی یہ تو۔" رفیق نے سوچا۔

"سیریل کلر کا کیس اب تم دیکھو گے۔ اور مجھے ہر حال میں رزلٹ چاہئے۔ اوپر سے بہت دباؤ ہے۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا میڈم۔ آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔" رفیق نے کہا۔

"اب تم جا کر چوہان سے اس کیس کا سارا ریکارڈ اپنی کسٹڈی میں لے لو۔ اس قاتل نے ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اور بدلے میں وردا کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ہمیں ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو بھی اس کے چنگل سے چھڑانا ہے اور وردا کو بھی اس کے حوالے نہیں کرنا۔ اب تم نے دیکھنا ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ میں جلد سے جلد اس درندے کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔" شہلا نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا میڈم۔"

"تمہارے پاس دوسرا کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تم کچھ نہیں کر پائے تو پھر سے معطل ہو جاؤ گے۔ از دیٹ کلیئر؟" شہلا نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ترکی بہ ترکی

جاحظ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے۔

"میں ایک بار بصرہ کی ایک مشہور شاہراہ سے گزر رہا تھا۔ میں نے جوتوں کی ایک شاندار دوکان دیکھی۔ میں اس کے اندر چلا گیا اور ایک خوبصورت بغدادی جوتا پسند کیا اور صاحب دوکان سے اس کی قیمت دریافت کی۔ جواب ملا "دس درہم" یہ بہت زیادہ تھے۔ اس لیے مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا "اگر یہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر جو گائے قربان کی تھی اس کی کھال کا بھی بنا ہوا ہوتا تب بھی میں اس کے لیے ایک درہم سے زیادہ ادا نہ کرتا۔" دوکان دار نے یہ سنا اور جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک اٹھا میری طرف نظریں اٹھائیں اور کہا "اگر تمہارے پاس اصحاب کہف والے درہم ہوتے تب بھی میں تمہیں یہ جوتا ایک درہم میں نہ دیتا۔"

(مرسلہ: **حق نواز**..... کراچی)

"میڈم اب تو سب کچھ کلیئر ہو گیا۔"

"گڈ۔ اب جاؤ اور اپنی ڈیوٹی انجام دو اور اب مجھے اسی وقت اپنی شکل دکھانا جب تم کچھ کر لو۔"

رفیق کچھ بولنا چاہتا تھا مگر اسے لگا کہ اس کا گلا سوکھ گیا ہے۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" یہ کہہ کر شہلا نے ایک فائل کھول لی۔

رفیق باہر آیا تو اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"چوہان صحیح کہتا تھا۔ یہ تو سچ میں قیامت ہے۔ حالت خراب کر دی میری۔" رفیق بڑبڑایا۔

رفیق نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور چوہان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"گڈ مارننگ سر۔" باہر کھڑے بھولو نے رفیق کو دیکھ کر بتیسی نکال کر کہا۔

"مارننگ...... ارے بھولو۔ کیسے ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں سر۔ آپ کو دوبارہ دیکھ کر اچھا لگ رہا ہے۔" بھولو نے کہا۔

رفیق کمرے میں داخل ہوا تو وہ چائے پی رہا تھا۔

"آپ یہاں بیٹھ کر چائے پیتے رہتے ہیں تب ہی تو مجرم کھلے عام گھوم رہے ہیں۔" رفیق بولا۔

"زیادہ بکواس مت کرو۔ تم ابھی نئے نئے ہو پولیس میں۔ دیکھتا ہوں کیا کرلو گے۔ اگر زیادہ ہی دم ہے تو پکڑو اس درندے کو جس نے شہر میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔"

"اس کا پورا کیس ریکارڈ تو دو مجھے۔" رفیق بولا۔

"پہلے چائے تو پی لوں۔ میرے ساتھ زیادہ پنگا مت لیا کرو۔ بڑی مشکل سے نوکری پر بحال ہوئے ہو۔ پھر سے معطل ہو سکتے ہو۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں؟" چوہان نے اپنا رعب جماتے ہوئے کہا۔

"اس کو اگر پتہ چل جائے کہ ٹرین میں میرا اور اس کی بہن کا کیا سلسلہ بن چکا ہے تو پھر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔" رفیق یہ سوچتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"کیا ہوا ہنس کیوں رہے ہو؟" چوہان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آپ مجھے ریکارڈ دے دیں۔ وقت کم ہے میرے پاس۔ کچھ نہیں کیا تو پھر سے معطل ہو جاؤں گا۔"

"وہ تو تمہیں یہ کیس کروا ہی دے گا فکر نہ کرو۔" چوہان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے سارا ریکارڈ رفیق کے حوالے کر دیا اور وہ بڑی باریک بینی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

"ایک بات ہے۔ اس قاتل کا کوئی پیٹرن نہیں ہے۔ جسے سمجھ کر ہم کچھ نتیجہ اخذ کر سکیں۔ یا پھر پیٹرن ہے۔ جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ کسے کے کون ہو سکتا ہے۔ اف اتنا مشکل کیس اور اتنا کم وقت۔ رفیق بیٹا تمہاری معطلی تو پھر سے پکی ہے۔" رفیق نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اپنے کیبن سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ شہلا اپنے چہرے پر شکنیں سی لیے اپنے کیبن سے باہر نکل رہی ہے۔

"تم نے کیس اسٹڈی کر لیا؟" وہ رفیق سے مخاطب ہوئی۔

"یس میڈم۔" رفیق نے ادب سے کہا۔

"ایس پی صاحب نے بلایا ہے مجھے۔ تم بھی ساتھ چلو۔"

"اوکے میڈم۔" رفیق نے کہا۔ پھر دل میں سوچا۔ "شاید اب میڈم کو ڈانٹ پڑے گی۔ کیونکہ وہ کمینہ ڈانٹنے کے لیے ہی بلاتا ہے۔"

"میڈم کیا آپ پہلے ملی ہیں ایس پی صاحب سے؟" رفیق نے پوچھا۔

"ہاں ملی ہوں۔ جب یہاں جوائن کیا تھا تب ہی ملی تھی۔ آج انہوں نے پہلی بار بلایا ہے۔"

"برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" رفیق بولا۔

"اپنا منہ بند رکھو۔ مجھے زیادہ بکواس سننا اچھا نہیں لگتا۔" میڈم کا اکھڑ جواب سن کر رفیق کی تو بولتی بند ہو گئی۔

ایس پی صاحب کے کمرے کے پاس پہنچ کر شہلا نے کہا۔ "تم یہیں رکو۔ میں مل کر آتی ہوں۔ کوئی بھی ضرورت ہوئی تو تمہیں بلا لوں گی۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

شہلا نے اس کی بات سنی اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ کافی تناؤ کا شکار لگ رہی تھی۔

"آئیں ڈی ایس پی صاحبہ۔ کیا ہوا اس سیریل کلر والے کیس کا۔ ایم پی اے صاحب کی بیٹی کا کچھ

پتہ چلا۔ کچھ کر بھی رہی ہیں آپ یا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔" ایس پی صاحب کا لہجہ قدرے تیز تھا۔

"سر ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔" شہلا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا کوشش کر رہی ہو تم۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو اغوا ہوئے۔ تم نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ اوپر والوں کی ساری باتیں تو مجھے سننی پڑتی ہیں۔"

"سر ہم اپنی بہترین کوششیں بروئے کار لا رہے ہیں۔"

"بل شٹ...... اگر بہترین کوشش کی ہوتی تو تمہارے پاس اس کا کوئی رزلٹ بھی ہوتا۔ تمہیں تو پولیس میں آنے کی بجائے ماڈلنگ کرنی چاہئے تھی۔ تم وہاں زیادہ کامیاب رہتیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر تم نے پولیس جوائن کی ہے۔ اب جاؤ اور کچھ کرو ورنہ اپنی جاب ختم سمجھو۔ جا کر گھر بیٹھو۔ چولہا ہانڈی سنبھالو۔ یہ پولیس کا محکمہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔" یہ ایس پی کچھ زیادہ ہی بدتمیز ٹائپ کا تھا۔

شہلا کو اس طرح کی ڈانٹ کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پائی۔

"مجھے وہ درندہ چاہئے۔ زندہ یا مردہ۔ نشاء اور وردا دونوں کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ جاؤ اب یہاں سے۔ کھڑی کیا سوچ رہی ہو۔" ڈانٹ کا ایک اور وار ہوا۔

"تھینک یو سر۔" صرف یہی بول کر شہلا چپ چاپ باہر نکل گئی۔ جب وہ باہر آئی تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

رفیق، شہلا کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ خوب ڈانٹ پڑی ہے۔ اس لئے شہلا سے کچھ نہیں پوچھا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ اندر کی ڈانٹ کا بدلہ کہیں وہ اس کے سر پر نہ اتارے۔

☆☆☆☆☆☆☆

لنچ بریک میں وردا اپنی ایک ساتھی کے ساتھ باہر ٹہلنے کے لیے نکلی تو راجو کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ٹہلتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔

"وردا جی! زیادہ دور مت جانا۔ یہیں آس پاس ہی رہنا۔" راجو نے کہا۔

وردا نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کی ساتھی بولی۔ "اوہ تو یہ ہیں وہ حضرت جو تمہاری حفاظت پر مامور ہیں۔"

"ہاں یہ وہی ہے۔ ویسے اس نے ایک بارڈر کے

خطرناک غلطیاں

☆ اس نیت سے عیب کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اس سے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆ ہر انسان کے متعلق ظاہری صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

☆ کسی کام کو ادھورا چھوڑ کر دوسرے وقت پر مکمل کرنے کی امید رکھنا۔

☆ اپنے ماں باپ کی خدمت نہ کرنا اور اولاد سے اس کی توقع رکھنا۔

☆ ہر ایک سے بدی کرنا اور خود آرام سے رہنے کی توقع رکھنا۔

☆ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند اور لائق تصور کرنا۔

☆ لوگوں کی تکلیف میں حصہ نہ لینا اور پھر ان سے ہمدردی کی امید رکھنا۔

(مرسلہ: **عمر ابراھیم**...... لاہور)

مارے میرے سامنے پیشاب کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی حفاظت کرے گا یہ میری۔" وردا کی بات سن کر اس کی ساتھی بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

راجو کا چہرہ اتر گیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ کیا کرے۔ پھر وہ بولا۔ "ہاں یہ پرابلم ہے میرے ساتھ۔ وہ اچانک ڈر گیا تھا میں اس دن۔ ویسے بچپن میں بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔ علاج بھی کروایا میں نے۔ ٹھیک بھی ہو گیا تھا۔ مگر اس دن پھر سے ایسا ہو گیا۔"

"وردا یہ بہت بری بات ہے۔ یہ تو میڈیکل پرابلم ہے اور تم مذاق بنا رہی ہو ان کا۔"

راجو کی بات سن کر وردا بھی چپ ہو گئی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی آفس فیلو کے سامنے ایسی بات کیوں کہہ دی۔ وہ اپنی ساتھی سے بولی۔ "تم جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"کیا بات ہے۔ لیٹ مت ہو جانا۔ ورنہ باس سے ڈانٹ پڑے گی۔"

"ہاں۔ میں بس آ رہی ہوں۔" وردا نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد وردا بولی۔ "سوری راجو۔ پتہ نہیں میں نے ایسا کیوں بول دیا۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے اس بات کا۔ میں نے ایسی میڈیکل پرابلم کے بارے میں سنا تو تھا۔ مگر اب یقین ہوا کہ ڈر کی وجہ سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں وردا جی...... بہت سالوں بعد ہوا ہے ایسا۔ چلو اچھی بات ہے نا کہ میری وجہ سے کسی کے ہونٹوں پر ہنسی تو آئی۔ کیا یہ کم بڑی بات ہے۔ اب آپ جائیں۔ لیٹ ہو جائیں گی۔"

"آئندہ سے میں ایسے نہیں ہنسوں گی۔"

"آپ ہنسیئے۔ مشکل کیا ہے۔ میری وجہ سے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔" راجو بولا۔

"بس اب فلرٹ شروع مت کرو۔" یہ کہہ کر وردا آفس کی طرف مڑ گئی۔

دونوں کو ذرا برابر بھی خبر نہیں تھی کہ دور سے دو خونخوار آنکھیں مسلسل انہیں دیکھ رہی ہیں۔

"دیکھتا ہوں۔ کب تک بچو گی تم۔ تمہارے لیے تو ایسا آرٹسٹک پلان ہے میرا کہ تمہیں فخر ہو گا کہ تم میرے ہاتھوں ماری گئیں۔" درندے کی ہنسی میں غراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

شہلا اور رفیق، ایس پی صاحب کے آفس سے واپس اپنے تھانے آ گئے۔ شہلا بغیر کچھ کہے اپنے کیبن میں چلی گئی۔ رفیق نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ میڈم سارا غصہ اس پر نکال سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد شہلا نے خود ہی رفیق کو اپنے پاس بلا لیا۔

"کہیئے میڈم۔ کیا حکم ہے؟" رفیق نے کہا۔

"کیس فائل پڑھ کے تمہیں کیا لگتا ہے؟" شہلا نے پوچھا۔

"میڈم فائل پڑھ کے تو ابھی تک مجھے دو ہی باتیں کام کی لگی ہیں۔ ایک عینی شاہد ہے وردا شمسی جس نے درندے کو دیکھا ہے۔ جتنے بھی جرائم پیشہ افراد کی تصویریں ہمارے ریکارڈ میں ہیں وہ سب وردا کو دکھانی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے یہ درندہ کوئی پرانا مجرم ہو۔ دوسری کام کی بات ہے اس آدمی کا نام جو اس رات سہیل سے ملنے آیا تھا۔ لیکن وہ نام ادھورا ہے۔ کے کے کا کچھ بھی مطلب ہو سکتا ہے۔ میں کل وردا سے ملوں گا اور اسے سارے مجرموں کی تصویریں

دکھاؤں گا۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہی کوئی ہمارا مطلوبہ مجرم ہو۔ اسی بہانے وردا سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔" رفیق نے تفصیل کے ساتھ شہلا کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

"کیا تم جانتے ہو وردا شمسی کو؟"

"جی ہاں۔ ہم کالج فیلو رہے ہیں۔"

"اس چوہان نے تو کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا۔ مجرموں کی تصویریں تو بہت پہلے دکھانی چاہیئے تھیں وردا کو۔"

"ایک بات اور ہے میڈم۔ زیادہ تر قتل جنگل یا اس کے آس پاس ہوئے ہیں۔ اس جنگل میں ہی کوئی راز پوشیدہ ہو سکتا ہے۔" رفیق بالکل صحیح رخ پر تفتیش کر رہا تھا۔

"اوہ ہاں۔ ریاض حسین بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"ریاض حسین کون میڈم؟" ابھی تک رفیق کا سامنا راجو سے نہیں ہوا تھا۔

"سب انسپکٹر ہے وہ۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی جوائن کیا ہے اس نے۔ میں نے اسے چوبیس گھنٹے وردا کی پروٹیکشن کی ڈیوٹی پر لگا دیا ہے۔"

"یہ کام کسی نووارد کو نہیں دینا چاہیئے تھا میڈم۔" شاید رفیق کو اپنے سینئر ہونے کا زعم تھا۔

"میرے فیصلہ پر کبھی سوال مت اٹھانا۔ سمجھے۔" شہلا نے گھور کر کہا۔

"سمجھ گیا میڈم۔" کیونکہ سمجھنے میں ہی رفیق کو اپنی خیر نظر آ رہی تھی۔

"ایک بات اور ہے۔ اور وہ بات تمہیں فائل میں نہیں ملے گی۔ دھیان سے سنو۔" شہلا نے اسے جنگل میں پیش آنے والا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "اس قاتل نے جو گولی مجھ پر چلائی تھی وہ ہمارے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ہے۔ مجھے یہاں کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ اس لیے راجو کو وردا کی حفاظت پر مامور کر دیا ہے۔ اور اسی لیے تمہاری معطلی ختم کروا کر تمہیں یہ کیس سونپا ہے۔ اب سمجھے کچھ۔ بنا سوچے سمجھے کچھ مت بولا کرو میرے سامنے۔" شہلا نے کہا۔

"سوری میڈم۔" رفیق کا چہرہ لٹک سا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ خیال رکھنا کہ میرے سامنے جب بھی بولنا۔ سوچ سمجھ کر بولنا۔"

"خیال رکھوں گا میڈم۔"

"یہ وردا کو تصویریں دکھانے والا آئیڈیا اچھا ہے۔ سب سے پہلے تم یہی کام کرو۔" شہلا نے اسے ہدایت دی۔

"بالکل میڈم۔ مگر یہ کام کل ہی ہو سکتا ہے۔ سارے مجرموں کی تصویریں دستیاب نہیں ہیں آج۔"

دل اور زبان

ایک دن حکیم لقمان نے اپنے ملازم سے کہا کہ "آج کھانے میں بکری کے وہ اعضا پکا کر لاؤ جو جسم انسانی میں سب سے بہتر عضو خیال کیے جاتے ہوں۔" ملازم نے دل اور زبان پکا کر پیش کر دیئے۔

دوسرے دن لقمان نے بدترین اعضاء پکانے کا حکم دیا تو ملازم اس روز بھی دل اور زبان پکا کر لے آیا۔

لقمان نے اس سے سوال کیا کہ "یہ کیا بات ہے کہ جب میں نے بہترین اعضاء پکانے کو کہا تو تم دل اور زبان لے کر آئے اور جب میں نے بدترین اعضاء کی تاکید کی تب بھی تم یہی دونوں چیزیں پکا کر لے آئے۔" ملازم نے جواب دیا کہ "اے حضرت اگر دل اور زبان ذکر الٰہی معمور اور ارشاد خداوندی کے تابع ہوں تو یہ بہترین حصہ جسم ہیں اور اگر اس کے برعکس صورت حال ہو تو یہ بدترین حصہ جسم ہیں۔"

(مرسلہ: ساجد علی...... ملتان)

"او کے۔ تب تک فیلڈ انکوائری کرو۔ کسی کو کچھ تو پتہ ہوگا اس قاتل کے بارے میں۔" شہلا نے دوسری ہدایت دی۔

"میں وہی سوچ رہا تھا میڈم۔ آپ اجازت دیں تو میں جاؤں۔"

"ہاں۔ گڈ لک۔"

رفیق نے کمرے سے باہر آ کر بھولو سے کہا۔

"بھولو جیپ لگواؤ۔ ہمیں راؤنڈ پر نکلنا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں رفیق پولیس جیپ لے کر تھانے سے باہر آ گیا۔

"کالو جرم کی دنیا میں سب کی خبر رکھتا ہے۔ سب سے پہلے اسی سے ملنا چاہئے۔" رفیق نے سوچا۔

بیس منٹ بعد رفیق کی جیپ کالو کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے جیپ سے اتر کر دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے......؟ بعد میں آنا' ابھی میں مصروف ہوں۔" اندر سے آواز آئی۔

یہ سن کر رفیق کو غصہ آ گیا اور اس نے ایک زور کی لات دروازے پر ماری اور دروازہ کھل گیا۔ رفیق بے دھڑک اندر آیا تو دنگ رہ گیا۔ کالو ایک خاتون کے ساتھ ضروری کارروائی میں مصروف تھا۔

"ابے رک۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"بس تھوڑا وقت اور دیں سر۔"

"ابے کتنا وقت لے گا۔ میں کیا فالتو نظر آتا ہوں تمہیں۔" یہ کہہ کر رفیق نے پستول کی نال کالو کی کھوپڑی سے لگا دی۔ "تیری مستی پوری ہونے تک کا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

رفیق کی بات سن کر اور اپنی کھوپڑی پر پستول کی سرد نال محسوس کرتے ہوئے کالو نے خاتون کو چلتا کر دیا۔

"سر آپ بھی نا ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہو کر آتے ہو۔ اب بولیں کیا بات ہے؟"

"وہ سیریل کلر جس نے پورے شہر میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ کیا کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں۔" رفیق نے پوچھا۔

"سر مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں پتہ۔ مجھے تو کیا بلکہ کسی کو کچھ نہیں پتہ۔ میں تو خود اس سے ڈرا رہتا ہوں کہ کہیں کسی دن اس کا سامنا نہ ہو جائے۔ اس لیے میں بھی کبھی رات کو دیر تک باہر نہیں رہتا۔ شرافت سے نو بجے سے پہلے گھر واپس آ جاتا ہوں۔ سوری سر۔ میں اس بارے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ مجرموں کی دنیا میں اس کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ لگتا ہے یہ ان عادی مجرموں سے ہٹ کر ہی کوئی ہے۔" کالو نے بیچارگی سے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" یہ کہتے ہوئے رفیق نے پانچ سو روپے کا نوٹ کالو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "یہ دروازہ ٹھیک کروا لینا۔"

کالو کے گھر سے مایوس ہو کر رفیق پھر سڑک پر آ گیا۔

"اب تک کی تفتیش سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی وہ درندہ کوئی عام مجرم نہیں بلکہ ایک ایسا شخص ہے جس کی معاشرے میں بہت عزت ہے۔ وہ وردا کا مطالبہ اس لیے کر رہا ہے کیونکہ اسے خوف ہے کہ کہیں وردا اسے بے نقاب نہ کر دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سر عام ہمارے سامنے گھومتا پھرتا ہو۔ ہم سے ملتا ہو لیکن ہم اسے پہچان نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمیں ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ یہی قاتل ہو سکتا ہے۔ اس درندے کو پنجرے میں بند کرنا بہت ضروری ہو گیا

ہے۔ دیکھتا ہوں کب تک بچتا ہے میرے ہاتھوں سے۔" ڈرائیو کرتے ہوئے مختلف سوچیں رفیق کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام ہو چکی تھی اور وردا آفس سے نکل رہی تھی۔ راجو حسب معمول خوشی سے جھوم اٹھا اور فوراً وردا کے پاس پہنچ گیا۔

"چھٹی ہو گئی؟"

"تم اپنی ڈیوٹی پر دھیان دو۔ مجھ سے فضول باتیں مت کیا کرو۔" وردا خفگی سے بولی۔

"آپ مجھ سے خفا کیوں رہتی ہیں۔ محبت کرتا ہوں آپ سے۔ کوئی مذاق نہیں۔" جذبات کی رو میں بہہ کر آخر راجو کے منہ سے دل کی بات نکل ہی گئی۔ اور پھر وہ خود یہ الفاظ بول کر پچھتایا کیونکہ یہ باتیں سنتے ہی وردا کی آنکھیں غصے سے لال ہونے لگی تھیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک زناٹے دار تھپڑ راجو کے گال پر دے مارا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ بولنے کی۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے نہیں چاہئے ایسی پروٹیکشن۔"

"سوری وردا جی۔ غلطی ہو گئی۔ بس منہ سے نکل گیا۔ میں تو آپ سے کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پتہ کیسے یہ سب بول گیا۔" راجو گڑگڑا کر بولا۔

وردا اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ راجو بھی اپنی جیپ میں بیٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گھر پہنچ کر وردا اندر چلی گئی وہ راجو سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چاروں طرف گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف بھیانک سناٹے کا راج تھا۔ راجو اور وردا سخت گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہوئے تھے۔ اور گھبراہٹ کیوں نہ ہوتی' ان کے سامنے درندہ ریوالور تانے کھڑا تھا۔

"تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو کہ پہلے کون مرنا چاہتا ہے۔" قاتل بولا۔

"ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ پہلے تم مرو گے۔" یہ کہہ کر راجو نے پاؤں سے قاتل کی طرف مٹی اچھالی اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا۔ اس کا خنجر بھی زمین پر گر چکا تھا۔ مگر وہ درندہ خالی ہاتھ بھی درندہ ہی تھا۔ وہ راجو پر حاوی آنے لگا۔ کسی نہ کسی طرح خنجر راجو کے ہاتھ میں آ گیا اور راجو نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر پوری طاقت سے وہ خنجر درندے کے پیٹ میں گھونپ دیا اور وہ کراہتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ راجو کو ایسا لگا کہ درندہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر وردا کی طرف بڑھا۔ لیکن پیچھے سے درندے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"پہلے وردا ہی مرے گی۔ بچا سکتے ہو تو بچا لو اسے۔"

راجو نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ ریوالور درندے کے ہاتھ میں تھا اور اس نے وردا کو اپنے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ گولی چلتے ہی راجو گولی اور وردا کے بیچ میں آ گیا اور برق رفتار گولی نے راجو کو زمین پر بچھا دیا۔ گولی بالکل اس کے دل کے پاس ہی لگی تھی۔ وردا بھاگ کر راجو کے قریب آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایسا کیوں کیا تم نے۔ مجھے مر جانے دیتے۔"

"میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی مذاق نہیں۔" راجو نے کہا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"راجو۔" وردا زور سے چلائی اور گہری نیند سے بیدار ہو گئی۔ خواب تھا ہی اتنا عجیب و غریب۔ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور بولی۔ "میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی مذاق نہیں...... راجو نے شام کو

یہی الفاظ کہے تھے۔ اف...... یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ اتنے عجیب خواب کیوں آ رہے ہیں مجھے۔ اوہ راجو۔ تم مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔"

خواب دیکھنے کے بعد وردا بہت پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے دو بج رہے تھے۔ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا۔ وہ اٹھی اور جگ میں سے پانی نکال کر پیا۔

پانی پینے کے بعد وردا کھڑکی پر آئی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ اسے اپنے گھر کے باہر صرف راجو ہی دکھائی دیا۔ وہ جیپ کا سہارا لے کر کھڑا تھا۔ راجو نے بھی وردا کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ فوراً جیپ کا سہارا چھوڑ کر الرٹ کھڑا ہوگیا۔ جیسے وہ وردا سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

وردا کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس نے اپنی سوچوں کو کسی اور طرف موڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر اس کے دماغ میں راجو کے یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ "میں آپ سے محبت کرتا ہوں' کوئی مذاق نہیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

اچانک نشاء کی آنکھ کھل گئی اور اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ درندے نے اسے اب تک بے لباس ہی رکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ درندے نے اسے کچھ کھانے کو دیا تھا' جسے کھاتے ہی وہ گہری نیند میں ڈوب گئی تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک کی جانب نظر ڈالی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

"یہ دن کے دو بج رہے ہیں یا رات کے؟" نشاء نے سوچا۔ مگر اس کے پاس اس بات کی تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی جس سے جھانک کر وہ وقت کا صحیح اندازہ لگا پاتی۔ ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک طرف اسے واش روم دکھائی دیا۔ وہ اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے واش روم کی طرف بڑھی۔ اس واش روم کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ واش روم میں بھی کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔

"یہ کیسا کمرہ ہے۔ اس میں کوئی کھڑکی ہی نہیں ہے اور وہ قاتل کہاں ہے؟" نشاء واش روم سے باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ لیکن باہر صرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

"کہیں سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی۔ آخر میں کہاں ہوں۔ یہ کمرہ کراچی میں ہی ہے یا کہیں اور...... پاپا پلیز کچھ کیجیے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔" نشاء وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں لیے رونے لگی۔

پھر نشاء کو دروازے کے باہر کچھ آہٹ سنائی دی اور وہ فوراً بھاگ کر بستر پر لیٹ گئی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بالکل اس کبوتر کی طرح جو بلی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ بلی وہاں نہیں ہے۔ نشاء کا دل زور زور سے دھڑک رہا۔ اتنی زور سے کہ اسے لگتا تھا جیسے وہ پسلیاں کو توڑ کر باہر آ جائے گا۔

دروازہ کھلنے اور پھر دھڑام سے کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ نشاء نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

"شرفو بابا۔"

(باقی آئندہ)

عاشق زاد

شہنی ارشاد

جن و انس کا تعلق ان کی دوستی اور دشمنی تک نہیں بلکہ یہ صدیوں پر محیط ہے۔ بلکہ تخلیق آدم پر اعتراض کرنے والی پہلی مخلوق بھی جن (شیطان) ہی تھا۔ جس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت بدر کرا دیا آج بھی اس کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں انسانوں سے ہے' جو کبھی کبھار بلکہ عموماً ہماری غفلت سے ہم پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر کلام اللہ کی طاقت سے بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک لڑکی کی سچی روداد' ایک شرارتی جن اس پر عاشق ہو گیا تھا۔

"نہ بیٹا! یہ خوشبو مت لگانا......" اماں سکینہ نے مجھے موتیے کے عطر کی شیشی کھولتے ہوئے دیکھا تو جھٹ میرے نزدیک آ کر میرا ہاتھ پکڑ کر روک دیا' وہ کمرے کی صفائی کر رہی تھیں۔

آج جمعہ کا دن تھا اور میں غسل کر کے نماز ادا کرنے سے قبل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرنے کی نیت سے ہلکی سی خوشبو لگایا کرتی ہوں' خوشبو میں مجھے موتیے کا عطر ہمیشہ سے پسند ہے' اس کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر رکھتی ہے۔

"کیوں اماں سکینہ! آج جمعہ ہے ناں اور پھر میں گھر سے باہر جاتے ہوئے تھوڑی لگا رہی ہوں۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ارے بیٹا میں کیا تمہیں سناؤں' خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلو یا نہ نکلو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں تو کہتی ہوں کہ کنواری لڑکیوں کو تو خاص طور پر خوشبو لگانی نہیں چاہیے' اللہ بچائے بری گھڑی ہے۔" انہوں نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میری متجسس نگاہوں نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ اماں سکینہ کے پاس کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہے مجھے بتانے کے لیے۔

میں نے عطر کی شیشی واپس رکھ دی اور اماں سکینہ کا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اماں کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہوں......" انہوں نے آہستہ سے کہا اور سر ہلایا۔ "لیکن تمہیں کیا بتاؤں تم تو میری بچی ہو۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ مجھے سنا نہیں سکتیں۔" میرا تجسس مزید بڑھ گیا۔

"بڑی لمبی کہانی ہے بیٹا!" انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ "آج بہت کام ہے اور تمہیں بھی جانا ہے پھر کبھی فرصت میں سناؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اماں! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں کہانیاں لکھتی ہوں اور مجھے ایک پُراسرار کہانی لکھنا ہے وہ بھی سچی چلیے اس مرتبہ آپ کی کہانی لکھ دوں گی۔" میں نے کہا۔

"تم میری کہانی لکھو گی واقعی...... جب چھپ جائے تو مجھے ضرور بتانا۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا تو میں مسکرا دی۔

انہیں امی کا خیال رکھنے کی ہدایت کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ آج مجھے ادارے میں ایک ضروری کام سے جانا تھا ورنہ عموماً جمعہ کا دن میں گھر پر گزارنا پسند کرتی ہوں۔

میں تین بجے کے قریب واپس آ گئی' امی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا وہ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اماں سکینہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئی' وہ ہماری پرانی ملازمہ تھیں۔ کم از کم دس سال سے تو وہ ہمارے گھر میں تھیں' کبھی چھٹی لے کر اپنے بچوں سے ملنے کے لیے چلی جایا کرتی تھیں۔ شکل وصورت اس وقت بھی ان کی اچھی تھی' بال بھی لمبے تھے' سفید بالوں کی بہت لمبی چوٹی تھی جسے وہ جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر رکھا کرتی تھیں۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں' رنگ البتہ قدرے سانولا تھا۔ بقول ان کے جوانی میں وہ گوری ہوا کرتی تھیں لیکن اب حالات کی چکی میں پس کر ان کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''اماں کاموں سے فارغ ہو گئیں۔''

''ہاں' کوئی کام ہے کیا؟'' انہوں نے پوچھا تو امی نے میری جانب دیکھا۔

''آپ اب سنائیں مجھے وہ کہانی جس کے متعلق ہم صبح بات کر رہے تھے۔'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''ارے کیسی کہانی۔'' امی نے سوالیہ نگاہوں سے اماں سکینہ کو دیکھا۔

''امی ہے ایک پُراسرار کہانی! اماں سکینہ مجھے سنانے والی ہیں۔'' میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے بس رہنے دو' اب مزے سے سن لو گی پھر ڈرتی پھرو گی یاد ہے اس رات......''

''امی پلیز سنانے دیں مجھے لکھنا ہے' اچھا پکا وعدہ نہیں ڈروں گی۔'' میں نے کہا تو امی مسکرا دیں اور اماں سکینہ کی جانب دیکھنے لگیں گویا خاموش نگاہوں سے کہہ رہی ہوں' اچھا سناؤں میں بھی سنوں گی۔''

''بیٹا وہ کسی اور کی نہیں خود میری کہانی ہے' یہ خاصی پرانی بات ہے۔'' پھر انہوں نے اپنی جو کہانی مجھے سنائی وہ میں ان ہی الفاظ میں تحریر کر رہی ہوں۔

''اللہ نے میری اماں کو ڈھیر سارے بچے دیئے تھے' ایک تو غربت اوپر سے ڈھیر سارے بچے...... واہ اللہ تعالیٰ تیری رحمت۔

ہم چھ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی' ابا چوکیدارہ کرتے تھے اور اماں گھروں کے کام کرتی تھیں' مختلف گھروں کا بچا ہوا سالن روٹی واپسی میں لے آتیں اور ہم بہن بھائی لڑ جھگڑ کے کھا لیتے تھے۔

پتا نہیں کیا بات تھی میں روکھی سوکھی کھا کر بھی ککڑی کی بیل کی مانند تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ تعلیم یا اسکول کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے' میں نے چھوٹی عمر سے ہی بہن بھائیوں کو سنبھالا اماں جو گھر پر نہیں ہوتی تھیں۔

میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی' اللہ نے جوانی دی تو حسن ٹوٹ کر برسا' اماں کی سخت ہدایت تھی کہ دروازہ ہمیشہ اندر سے بند رکھنا اور میری غیر موجودگی میں کسی کے لیے بھی نہیں کھولنا' اماں شاید میری جوانی اور حسن سے خوف زدہ تھیں۔

ان دنوں شدید گرمیاں تھیں اور صرف ایک پرانا اور کھٹارا سا ٹیبل فین تھا جو جب چلتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے ریل کا انجن چل رہا ہو' اوپر سے سب کی یہ ضد کہ پنکھا ہمارے رخ پر ہو۔ اتنی گرمی اور حبس تھا کہ سانس لینا پھر مشکل ہو رہا تھا اوپر سے میرے بال...... اُف اللہ بہت گھنے اور بڑے تھے' جوڑے کی شکل میں باندھتی تھی تو ان کے بوجھ سے سر دکھنے لگتا تھا۔

چھوٹا سا صحن تھا اور ایک کمرہ تھا' ایک لکڑی کی سیڑھی اوپر چھت پر جانے کے لیے رکھی تھی۔ اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی' اماں کی سخت ہدایت تھی رات کو سوتے وقت اوپر چادر ضرور لیا کرو' سوتے میں انسان کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس حالت میں ہے۔

لو بھئی کر لو بات...... یہاں گرمی سے بُری حالت ہو رہی ہے اور اماں کی کھا جانے والی نگاہیں...... میں بے چینی اور بے قراری سے کروٹ پر کروٹ لے رہی تھی' باقی سب مزے سے سو رہے تھے۔ میں ہمیشہ سے نڈر تھی' مجھے رات کے اندھیرے میں بھی ڈر نہیں لگتا تھا' ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک پرانا قبرستان بھی تھا' چھت پر کھڑے ہوتے تھے تو سارا قبرستان نظر آتا تھا۔

ہاں تو میں اس رات کا واقعہ بتا رہی تھی جب بہت گرمی تھی اماں رات میں تنہا چھت پر جانے سے منع کیا کرتی تھیں' میں نے دیکھا کہ دن بھر کی تھکی ماندھی اماں بے خبر گرمی سے بے پروا سو رہی ہیں تو میں نے اپنا تکیہ اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی' ہر جانب سناٹا پھیلا ہوا تھا اندھیرا بھی تھا' بس چاند کی ہلکی ہلکی روشنی تھی' اتنی کہ انسان کا ہیولہ دکھائی دے جائے۔

میں نے چھت پر کھڑے ہو کر دو چار لمبے اور گہرے گہرے سانس لیے تاکہ اندر کی گھٹن دور ہو' یہاں نیچے کے مقابلے میں قدرے سکون تھا۔ یہ غریبوں کی بستی تھی یہاں اونچے مکانات نہیں تھے۔ میں نے فرش پر تکیہ رکھا اور پاؤں پھیلا کر سیدھی لیٹ گئی' بالوں کی چوٹھی کو کمر کے نیچے سے نکال کے تکیے کے پچھلی جانب پھیلا دیا۔

ذرا اوپر کو تو سکون کا احساس ہوا لیکن پھر وہی گرمی اور پسینہ...... کم بخت ہوا بھی بالکل بند تھی۔ میں نے یہ سوچ کر یہاں اس اندھیرے میں کون مجھے دیکھنے والا ہے' گرمی کی شدت سے گھبرا کر شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھائے' آستین چڑھائی اور قمیص کا دامن بھی اوپر کر لیا یعنی پیٹ اور کمر پر سے قمیص ہٹا دی تب کہیں جا کر مجھے سکون ملا اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ رات کا وہ نہ جانے کون سا پہر تھا تب اچانک کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی اور یہ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا' میں نے اپنے قریب کسی کو کھڑے دیکھا۔

وہ ایک لمبا تڑنگا مرد تھا' سیاہ رنگ...... اس کی بڑی بڑی سفید آنکھیں میرے اوپر گڑھی ہوئی تھیں اور وہ بڑے غور سے میرا معائنہ کر رہا تھا' مجھے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت نمایاں ہو گئے۔

میں یہ سوچ کر کہ مجھے تنہا پا کر کوئی میری چھت پر کود آیا ہے' میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن یہ دیکھ کر میرے چھکے چھوٹ گئے کہ وہ شخص ایک لمحہ میں ہی میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

پھر کیا تھا میں ڈر کے مارے تیزی سے نیچے بھاگی اور دوسری بہنوں کے ساتھ چپک کر لیٹ گئی اور پسینے پسینے ہونے کے باوجود سر سے پاؤں تک چادر تان کے لیٹ گئی۔

یا اللہ وہ کون تھا کہاں سے آیا اور کیسے غائب ہو گیا' میں بہت ڈر گئی تھی بقیہ رات مجھے نیند نہیں آئی' اذان کے بعد میری آنکھ لگی تو دن چڑھے اماں نے میری چادر کھینچ کر مجھے جگایا کہ میں نے چائے اور ناشتا بنا دیا ہے' میں کام پر جا رہی ہوں اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لو۔

پھر اس واقعے کے بعد میں کئی دنوں تک چھت پر نہیں گئی کیوں کہ میں زندگی میں پہلی بار ڈری تھی' کئی ہفتے گزر گئے دوبارہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا پھر برسات

شروع ہوگئی۔ مجھے بارش میں نہانا بہت اچھا لگتا تھا' شام کا وقت تھا ہر جانب اندھیرا چھایا ہوا تھا' میں نے جلدی جلدی گھر کے کام سمیٹے کہ بارش ہوگی اور زور کی ہوگی پھر میں بارش میں نہاؤں گی۔

ایسا ہی ہوا بارش برسی اور ٹوٹ کر برسی' میں اپنی چھوٹی بہنوں کے ہمراہ چھت پر آ گئی اور بارش میں نہانے لگے۔ بڑا مزہ آ رہا تھا ہم گول گول گھومتے تو کبھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے' اچانک وہ مجھے پھر دکھائی دے گیا' میں دونوں بازو پھیلا کر گول گول گھوم رہی تھی ساتھ ہی میری بڑی سی چوٹی بھی لہرا رہی تھی' وہ قریب آیا اور اس نے میری بالوں کی چوٹی تھام لی اور میں ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔

اُف اللہ کیا بتاؤں وہ کیا تھا' بے حد کالا' سفید آنکھیں اور سفید دانت۔ ہوش آیا تو میں نیچے کمرے میں تھی' اماں پاس پریشان بیٹھی تھیں اور مجھے بہت تیز بخار تھا۔ سر میں شدید درد اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اماں ابا کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ گھر آئیں تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں لیکن ابا بھی بارش میں پھنس گئے تھے وہ روز کے مقابلے میں اس روز دیر سے گھر آئے لیکن حیرت انگیز طور پر ابا کے آنے تک میں بالکل ٹھیک ہوگئی اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

اب آئے دن وہ مجھے دکھائی دیتا' عموماً رات کو سوتے ہوئے اچانک میری آنکھ کھل جاتی تو وہ میرے پاس کھڑا ہوتا' ایک روز میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''تو کون ہے؟''

''تو مجھے اچھی لگتی ہے' میرے ساتھ چل۔'' اس کی ممیائی ہوئی غیر انسانی آواز نکلی۔

''مجھے تجھ سے ڈر لگتا ہے اور تو بہت بدشکل ہے۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ پر اتنی زور کا تھپڑ پڑا کہ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے' وہ پھر غائب ہوگیا۔

اس دن کے بعد سے اس کی حرکتیں مزید بڑھ گئیں' وہ رات کو میرے ساتھ بہت شرمناک حرکتیں کرتا تھا' کوئی نادیدہ وجود تھا جس کے ہاتھ مجھے اپنے جسم پر رینگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ یہ ایسی بات تھی جو میں شرم کے مارے کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی' بس یہ ضد کرنے لگی کہ اماں مجھے تیرے ساتھ سونا ہے' مجھے ڈر لگتا ہے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ جب میں اماں کے ساتھ ہوتی تھی تب وہ نہیں آتا تھا اس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اماں کے ساتھ سونے لگی۔

پھر مجھے پتا بھی نہیں چلا ابا نے اپنے دوست کے بیٹے سے میرا رشتہ طے کر دیا نہ اماں ابا نے مجھ سے پوچھا' نہ میں نے کوئی اعتراض کیا بلکہ یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ چلو اچھا ہے میرا شوہر میرے پاس ہوگا تو وہ منحوس میرے پاس نہیں آئے گا۔

اور جس دن میری تاریخ رکھی گئی وہ بہت غضب ناک ہوگیا' اب ہر وقت مجھے گھر میں دکھائی دینے لگا' بس کھڑا مجھے غصے سے گھورتا رہتا تھا' میں اب اسے دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی اس سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔

مجھے موتیے کے پھول اور ان کی خوشبو بہت پسند تھی' اماں اپنی حیثیت کے مطابق میرا جہیز بنا رہی تھیں روزانہ کچھ نہ کچھ سامان لے آتی تھیں' اس روز گھر میں کوئی نہیں تھا تو میں اپنے کپڑے دیکھ رہی تھی' تب ان کپڑوں میں میں نے ایک موتیے کے عطر کی شیشی دیکھی میں نے جھٹ کھولی اور سونگھی۔ اس کی خوشبو مجھے سر تا پا سرشار کر گئی' میں نے تھوڑا سا عطر اپنے کپڑوں پر لگا لیا اور پھر مجھے اپنی اماں پر ڈھیروں

پیار آیا کہ اماں کو معلوم ہے کہ مجھے موتیے کی خوشبو اچھی لگتی ہے تو اماں میرے لیے اس کا عطر لے آئی ہیں' اس کی خوشبو مجھے مستقل آتی رہے گی۔

خوشبو کا لگانا غضب ہوگیا' میرا سر بھاری ہونے لگا اس طرح جمائیاں آنے لگیں جیسے بہت زور سے نیند آ رہی ہو' میں نے اس وقت نیند کو بھگانے کے لیے زور زور سے انگڑائیاں لیں لیکن وہ کیفیت بڑھتی گئی' میں فرش پر سیدھی لیٹ گئی اور میکانکی انداز میں نے وہی حرکتیں کیں جو اس روز چھت پر کی تھیں یعنی جسم سے کپڑوں کو سرکانا شروع کر دیا اور پھر وہ سیاہ اور مکروہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا' وہ پورے دانت نکالتا ہوا میرے اوپر چھاتا چلا گیا' وہ میرے شوہر کا کردار ادا کر رہا تھا' میں ہر بات محسوس کر رہی تھی لیکن اس کو روکنے سے قاصر تھی۔

جب وہ چلا گیا تو میں ہوش میں آ گئی' میری کیفیت بہت خراب تھی' مجھے جسمانی طور پر شدید تکلیف کا احساس ہو رہا تھا' سارے جسم میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں' پھر غسل خانے میں گھس گئی اور مگے بھر بھر کے اپنے اوپر پانی ڈالا' پتا نہیں کتنی بالٹیاں بہا ڈالیں تب کہیں جا کر میرے اندر کی تپش کچھ کم ہوئی۔

اس روز میں نے کھانا بھی نہیں کھایا' دوسرے روز وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا' وہ مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں کمرے میں جاؤں اور عطر اپنے جسم پر لگاؤں لیکن میں اندر جانے سے خوف زدہ ہو رہی تھی' حیرت انگیز طور پر جب وہ مجھے دکھائی دیتا میری چھوٹی بہنیں دروازہ کھول کر باہر کھیلنے کے لیے نکل جاتیں۔

میں اس وقت برتن دھو رہی تھی' وہ مسلسل کھڑا غصہ کر رہا تھا لیکن میں اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی اس وقت شدت سے احساس ہوا کہ کاش میں قرآن مجید پڑھی ہوتی تو کلام اللہ پڑھ کر اس خبیث کو بھگا دیتی لیکن نہ اماں نے کلام پاک پڑھا ہوا تھا اور نہ ہی اسے اپنے بچوں کو پڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی' مجھے غصہ آیا تو میں نے غصے میں کہا۔

''دفع ہو.....''

میرا یہ کہنا تھا کہ میرے منہ پر ایک زور کا تھپڑ پڑا' میں نے گھٹنوں میں اپنا منہ دے لیا' ہاتھ میں چائے کا مگا تھا میرا ہاتھ زور سے فرش پر لگا اور ٹوٹا ہوا کانچ کا ٹکڑا میرے ہاتھ پر لگا اور ڈھیر سارا خون بہنے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر گرنے والا خون نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگیا پھر مزید خون ٹپکا وہ بھی غائب ہوگیا۔ میں غور سے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی' تب میرے کانوں میں شڑاپ شڑاپ کی سی مدھم آواز آئی اور صرف ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں نے ایک سیاہ رنگ کا بلا دیکھا جو زمین پر گرنے والا خون اپنی لمبی سی زبان سے چاٹ رہا تھا' میرے حلق سے پھر ایک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہوگئی۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے خود ہی ہوش آ گیا' میں کچن میں نل کے پاس گری ہوئی تھی' میں نے اپنی کلائی پر دیکھا وہاں مجھے ہلکا سا کٹنے کا صرف نشان دکھائی دیا' میں لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر چلتی ہوئی باہر صحن میں چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

اماں گھر آئیں تو میرا زرد چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگئیں' میری شادی کے دن نزدیک آ رہے تھے وہ میری جانب سے بہت فکر مند تھیں۔

''کیا ہوا ہے تجھے' ایسے کیوں لیٹی ہے اور ذرا اپنا

رنگ دیکھ ہلدی جیسا ہو رہا ہے' کیا بات ہے میری بچی!'' اماں نے پیار سے کہا تو میں اماں کے گلے لگ کر رو پڑی اور کہا۔

''اماں مجھے بہت ڈر لگتا ہے' تو کسی مولوی سے مجھے ایسا تعویز لادے کہ مجھے ڈر نہ لگے۔''

''ہیں...... '' اماں نے حیرت سے کہا ''کیسا ڈر؟ کس بات کا ڈر؟''

''اماں مجھے ایک ڈراؤنا آدمی دکھائی دیتا ہے' مجھے اس سے ڈر لگتا ہے کیوں کہ وہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔'' میں نے اس کے علاوہ اماں کو اور کچھ نہیں بتایا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' اماں نے سینے پر ہاتھ مارا۔

''تُو نے پہلے کیوں نہیں بتایا اری کم بخت! اب تو تیری شادی بھی ہونے والی ہے پر تُو فکر نہ کر میں بات کرتی ہوں کسی سے۔'' اور پھر اماں نہ جانے کسی سے میرے لیے ایک تعویز لے آئیں اور اسے دھاگے میں سی کر مجھے پہنا دیا۔

اس کے پہننے سے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ مجھے چھوتا نہیں تھا لیکن اب وہ غصے میں گھر میں گھومتا دکھائی دیتا' کبھی زیادہ غصہ آتا تو مجھے چلتے ہوئے زور سے دھکا دے دیتا' کبھی میرے منہ پر تھپڑ مار دیتا' ایک دن بیٹھے بیٹھے میری چھوٹی بہن نے مجھے غصے میں گھورنا شروع کر دیا اور پھر مجھے گندی گندی گالیاں دینے لگی۔ میں حیران تھی کہ اچانک اس کو کیا ہو گیا ہے' میں نے اس کے قریب جا کر پیار سے پوچھا کہ ''تجھے کیا ہوا ہے؟'' تو اس نے زمین سے جوتی اٹھا کر زور سے میرے دے ماری اور بھاری آواز میں بولی۔

''اس تعویز کو اتار دے ورنہ میں تیرے سارے گھر والوں کو مار دوں گا۔''

میں سمجھ گئی کہ وہ خبیث میری بہن پر سوار ہے وہ بھاگ کر سامنے والے گھر میں چلی گئی۔

کبھی میں بیٹھی ہوتی تو مجھے اپنے اردگرد بہت بُری بدبو محسوس ہوتی' ایسا لگتا کہ میں انسانی غلاظت کے ڈھیر پر بیٹھی ہوں' بدبو سے میرا سر پھٹنے لگتا تھا۔

میری شادی کے دن بہت نزدیک آ گئے' مجھے مایوں بٹھا دیا گیا' تیل اُبٹن کی خوشبو ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی لیکن میری ناک بدبو محسوس کر رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے میری شادی کا دن آیا' میں رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آ گئی۔

میرا دل ہزار وسوسوں میں گھرا ہوا تھا میں کمرے میں بیٹھی گھبرا گھبرا کر گھونگھٹ اٹھا کر کمرے میں چاروں جانب دیکھتی کہ کہیں وہ یہاں موجود تو نہیں ہے لیکن شکر ادا کیا کہ وہ یہاں موجود نہیں ہے۔

میری سہیلیاں جب مجھے دلہن بنا رہی تھیں انہوں نے گلے کا ہار پہناتے ہوئے وہ تعویز میرے گلے سے اتار دیا تھا کہ کالا دھاگا بہت بُرا لگ رہا ہے اس کو بعد میں پہن لینا' کیوں کہ تعویز میرے گلے میں نہیں تھا' اس لیے مجھے ڈر لگ رہا تھا پھر دروازہ کھلا اور میرے شوہر اندر آئے' میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ میرے شوہر کا تعلق بھی میری طرح ایک غریب گھرانے سے تھا وہ ایک شریف اور سیدھا سادہ آدمی تھا اور ایک مل میں نوکری کرتا تھا۔

میرے شوہر نے جیسے ہی میرا گھونگھٹ اٹھایا اور میرا چہرہ دیکھا تو اس کے لبوں سے بے ساختہ ''ماشاء اللہ'' نکل گیا' وہ بولا۔

''سکینہ! تُو تو جنت سے آئی ہوئی حور لگتی ہے' میرے مالک میرا نصیب اتنا اچھا کہ آسمان کا چاند میری جھولی میں ڈال دیا۔''

میں اپنے شوہر کے منہ سے اپنی اتنی تعریف سن کر خوش بھی ہوئی اور شرمائی بھی۔ اس نے جیسے ہی میرے ہاتھوں کو تھاما کہ وہ رونمائی کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا سکے' کسی نے اسے اٹھا کر پوری قوت کے ساتھ دیوار پر دے مارا' اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا اور تب ہی وہ مجھے دکھائی دے گیا جو میرے شوہر کے پاس کھڑا اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا اور میری یہ حالت کہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کک...... کیا...... تت...... تم...... تم نے اسے ......'' میں بمشکل یہ جملہ ادا کیا۔

''اگر آئندہ اس نے تجھے ہاتھ لگایا تو مر بھی جائے گا۔'' اس نے ممیاتی ہوئی عجیب سی آواز میں کہا اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا پھر میری جانب بڑھا۔

اور اس رات میرا شوہر پوری رات فرش پر بے ہوش پڑا رہا اور وہ خبیث میرے ساتھ سہاگ رات منا رہا' میری یہ حالت ہو جاتی تھی کہ نہ منہ سے آواز نکل سکتی تھی اور نہ ہی ہاتھ پاؤں ہلا سکتی تھی۔

فجر کی اذان ہوئی تو وہ چلا گیا اور میں بے ہوش ہو گئی بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت میرے شوہر کو ہوش آیا اور وہ خوف زدہ ہو کر کمرے سے بھاگ گیا۔ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی' البتہ دن میں میرے پاس آ کر مجھ سے پوچھا کہ رات کو کیا ہوا تھا؟

''تمہیں نہیں معلوم؟'' میں نے الٹا سوال کر دیا۔

''ہاں مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر زور سے دیوار پر دے مارا پھر مجھے ہوش نہ رہا پھر تم نے کیا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی بھی ساری رات روتی رہی' کہیں تمہارے گھر میں بُری چیزوں کے اثرات تو نہیں ہیں۔'' میں نے اس لیے جھوٹ بولا کہ اگر اس کو معلوم ہوا کہ میرے ساتھ کوئی معاملہ ہے تو وہ مجھ سے بدظن ہو کر مجھے چھوڑ نہ دے۔

''نہیں تو ایسی کبھی کوئی بات محسوس تو نہیں ہوئی۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

''خوف زدہ مت ہو' تم آیۃ الکرسی پڑھ لو ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''آیۃ الکرسی...... وہ کیا ہوتی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''حیرت ہے تمہیں آیۃ الکرسی کا نہیں پتا' کیا تم نے کلام پاک نہیں پڑھا ہوا ہے؟'' اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

''نہیں۔'' میں نے شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اچھا چلو کوئی بات نہیں' نہیں پڑھا تو اب پڑھ لینا پھر تو تمہیں نماز بھی نہیں آتی ہوگی اور تمہیں دینی مسائل کا بھی پتا نہیں ہوگا۔''

میں نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی تو وہ منہ میں آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا پھر میرے چہرے پر پھونک ماری اور بولا۔

''اب نہیں ڈرو گی۔''

دوسری رات میرے شوہر نے کمرے میں آ کر پہلے کچھ پڑھ کر کمرے میں چاروں طرف پھونکا پھر اپنے اوپر اور میرے اوپر دم کیا۔ اس رات وہ خبیث میرے پاس نہیں آیا تب مجھے اللہ کے کلام کی طاقت کا احساس ہوا اور اس بات کا بھی کہ میں نے قرآن نہ پڑھ کر کتنا بُرا کیا ہے۔

میرا شوہر ایک دین دار نمازی تھا' وہ تبلیغی دوروں پر جایا کرتا تھا' گھر میں میری ساس اور سسر تھے' دونوں بہت اچھے تھے۔ شوہر دس روز چلے پر گئے تو میں اماں

کے ہاں ملنے کے لیے آ گئی۔
شادی کی پہلی رات کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس نہیں آیا تھا' اب میری شادی کو ایک ماہ ہو گیا تھا' میں خوش تھی کہ مجھے اس سے چھٹکارہ مل گیا ہے لیکن اماں کے ہاں آتے ہی وہ مکروہ شکل مجھے پھر دکھائی دینے لگی لیکن اب میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لیے بہت پیار ہے اور وہ پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے' رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹی تو یکایک میرا دل گھبرانے لگا اور میرا شدت سے جی چاہا کہ میں اوپر چھت پر چلی جاؤں۔
سب کے سونے کے بعد میں چھت پر چلی گئی اور......
اب یہ بات میری برداشت سے باہر ہو گئی' میں شدید جسمانی تکلیف میں مبتلا تھی' فوراً اپنے سسرال آ گئی' میری ساس نماز پڑھتی تھیں میں نے ان سے کہا کہ میرے اوپر دم کر دیں' ساس نے دم کر دیا۔
لیکن رات ہوتے ہی وہ مردود پھر آن دھمکتا' میں دن بہ دن کمزور اور لاغر ہوتی جا رہی تھی' میرے شوہر واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے تب میں نے رو رو کر اپنے ساتھ ہونے والا ہر واقعہ انہیں بتا دیا انہوں نے بہت توجہ سے میری بات سنی اور بولے۔
''مسلمان ہونے کے باوجود جب ہم اللہ اور اس کے احکامات کو بھول جاتے ہیں صرف دنیا میں مشغول رہتے ہیں' حد یہ کہ اللہ کی کتاب کو بناء سمجھے پڑھنے (یعنی تلاوت) کے قابل بھی نہیں سمجھتے تو کمزور انسانوں پر شیاطین اس طرح قابض ہو جاتے ہیں تم چوں کہ خوب صورت اور جوان تھیں' اسی لیے کوئی شیطان جن تم پر مسلط ہو گیا۔''
میں اتنی شدید جسمانی تکلیف میں مبتلا تھی کہ میں نے اپنے شوہر کو بھی اپنے قریب نہیں آنے دیا ... بہت نیک اور صابر انسان تھے' پہلی رات میری ... دیکھتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو خوش نصیب ... لیکن میں کہتی ہوں کہ خوش نصیب تو میں تھی کہ ... ان جیسا جیون ساتھی ملا۔
اس موقع پر انہوں نے میرا بہت ساتھ ... میرے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھا اور اسے حل کرنے ... کوشش کی اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اب ... مجھے طلاق دے کر چھوڑ چکا ہوتا لیکن میرے ... شوہر کا کہنا تھا کہ میں نے اللہ کے نام پر اسے ... بنا کر تمہیں اپنی زوجہ بنایا ہے اب زندگی کے آخری سانس تک ہر ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گا۔ ہمارے دکھ مشترک اور ہماری خوشیاں سانجھی ہیں۔
اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ... کچھ اپنی زندگی میں انہوں نے مجھے عطا کیا ہے ... بدلہ تو انہیں رب کریم ہی دے گا' مجھے اتنی استطاعت نہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔
''دیکھو سکینہ! یہ بات ماں باپ کے فرائض ... شامل ہے کہ وہ اپنی اولاد کو رزق حلال سے پر ... کریں' انہیں دین و دنیا کا علم دلوائیں اور دین کا ... عطا کریں۔ وہ دل ایک اندھیرے قبرستان کی ... ہے جس میں اللہ کا نام یا اس کے کلام کا کوئی حصہ ... ہوگا۔ میں سب سے پہلے اس شیطانی طاقت ... تمہیں نجات دلانے کی کوشش کروں گا پھر تمہیں ... قرآن کی تعلیم بھی دلواؤں گا' نماز سکھاؤں گا۔''
اب میرے شوہر عبدالمجید نے ایک ... چھٹی لے لی اور ہر وقت میرے ساتھ رہنے ... کے لیے یا کسی کام سے باہر جانا ہوتا تو مجھے ... کے پاس بٹھاتے وہ بھی مجھے ایک لمحے کے لیے ... نہ چھوڑتیں اور قرآن پاک کی تلاوت یا ...

رہتی تھیں بلکہ مجھے بھی انہوں نے ہی وضو کرنا سکھایا' مجھے وضو کرنا تک نہیں آتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وضو ہوتا کیا ہے' آج جب میں اپنی اس زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا کہ میری اس وقت کی زندگی میں اور جانوروں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جانور بھی اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتا ہے' کھانا پینا' سونا' آرام کرنا یا جنسی خواہش کی تکمیل...... یہی حال ہم لوگوں کا تھا' میں وضو کر کے بچوں کی طرح سبحان اللہ' الحمدللہ اور اللہ اکبر پڑھتی رہتی تھی۔
پھر ایک دن عبدالحمید نے یہ خوش خبری سنائی کہ ایک ایسے عالم انہیں مل گئے ہیں جو مجھے اس شیطان سے نجات دلا سکتے ہیں' انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے ذکر کیا اور انہوں نے ان عالم صاحب کا پتا بتایا۔
وہ ایسے عالم اور عامل تھے کہ عام لوگ انہیں اس حیثیت سے نہیں پہچانتے تھے لیکن ان کے پاس علم تھا وہ جمعرات کی رات تھی جب بعد نماز عشاء وہ ہمارے گھر آئے۔ کمرے میں میرے ساس سسر اور عبدالحمید موجود تھے' انہوں نے جائے نماز بچھائی اور کچھ پڑھنے لگے۔ کمرے میں صرف چراغ کی روشنی تھی' لائٹ بجھا دی تھی' عامل صاحب نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا' میں عبدالحمید کے کہنے پر اپنی چادر کا پلو اپنے چہرے پر لٹکائے ہوئے تھی۔ عامل صاحب نے میری چھوٹی انگلی سرے پر سے مضبوطی سے پکڑی اور کچھ پڑھنے لگے' اچانک ہی میرا سر بہت بھاری ہونے لگا پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا' یہ سب باتیں مجھے بعد میں عبدالحمید نے بتائیں۔
عامل صاحب نے جب کچھ قرآنی آیات تلاوت کیں تو وہ میرے اوپر ظاہر ہو گیا اور اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ جنات میں سے ہے اور ہندو ہے۔ وہ انسانوں کی بستی میں گھومتا پھرتا ہے' اسے حسین اور جوان مسلمان عورتیں بہت مرغوب ہیں' اس نے کہا ہر وہ عورت جو کھلا جسم' کھلے بال' برہنہ بدن' برہنہ لباس' نماز و تسبیح اور قرآن سے دور ہو میں اس پر ضرور عاشق ہوتا ہوں بلکہ میرے جیسے اور جنات بھی ہیں جو عاشق ہوتے ہیں پھر ہم ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کر لیتے ہیں۔ یہ عورت ایک رات مجھے تنہا کھلی چھت پر اس حالت میں سوتی ہوئی ملی تھی کہ اس کا جسم نیم برہنہ تھا' اس کے خوب صورت اور لمبے بال بکھرے ہوئے تھے' میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔
عامل صاحب نے کہا کہ اس کا پیچھا چھوڑ دو تو اس نے انکار کر دیا تب عامل صاحب نے کہا۔ اگر تم سیدھی طرح نہیں پیچھا چھوڑو گے تو نتیجے کے ذمہ دار خود ہو گے۔ اس پر وہ خاموش رہا' عامل صاحب نے تین مرتبہ نرمی سے اس سے جانے کے لیے لیکن وہ خاموش رہا' تب انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا تو میں گر کر بری طرح تڑپنے لگی لیکن عامل صاحب نے پڑھنا موقوف نہیں کیا پھر سب نے ایک انتہائی حیرت انگیز منظر دیکھا' میرے جسم سے ایک آگ کا شعلہ سا نکلا اور سیدھا چھت کی جانب چلا گیا اور میں گر پڑی۔
عامل صاحب نے اشارہ کیا تو عبدالحمید نے میرے اوپر چادر ڈال دی' انہوں نے پانی پر دم کر کے میرے اوپر چھینٹے مارے تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی تب عامل صاحب نے مجھ سے کہا۔
''بیٹی میری چند باتیں غور سے سنو اور انہیں ہمیشہ کے لیے اپنے پلو سے باندھ لو' سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم جوان ہو اور مسلمان ہو تو سب سے پہلے پردے کا احترام کرو یعنی کسی بھی نامحرم کے سامنے بناء اپنا

آپ چھپائے مت جاؤ‘ دوسری بات یہ کہ قرآن پاک پڑھنا سیکھو‘ نماز سیکھو اور دین کا علم سیکھو یہ جاننے کی کوشش کرو کہ دین اسلام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسی زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے‘ اس کے علاوہ میں تمہیں اللہ کا ایک اسم مبارک ”یا قہار“ پڑھنے کے لیے دے رہا ہوں‘ ہر وقت وضو بے وضو چلتے پھرتے اس اسم مبارک کا ورد جاری رکھو‘ کوشش یہ کرو کہ ہمہ وقت باوضو رہو۔ اب وہ خبیث ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے لیکن آئندہ کے لیے تمہیں دوسرے شیاطین سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔“

اور پھر وہ عامل صاحب چلے گئے‘ اس دن میں بہت روئی‘ بار بار اپنی جہالت اور کم علمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے ساس سسر اور عبدالحمید نے بہت تسلیاں دیں‘ ان لوگوں کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان سب باتوں کے بارے میں انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا حد یہ کہ میرے والدین کو بھی نہیں بتایا۔

پھر عبدالحمید کے ایک دوست تھے ان کی اہلیہ میرے پاس گھر پر قرآن پاک پڑھانے کے لیے آنے لگیں‘ ساتھ ساتھ وہ مجھے نماز بھی سکھا رہی تھیں۔ دین کے بارے میں بھی بتاتی تھیں‘ میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ قرآن پڑھنا شروع کیا اور ایک سال کے عرصہ میں کلام پاک ختم کرلیا۔ عبدالحمید روزانہ رات کو قرآن پاک کا ترجمہ سنایا کرتے تھے‘ کیوں کہ میں تو اردو بھی پڑھنا نہیں جانتی تھی‘ انہوں نے مجھے اردو پڑھنا بھی سکھائی۔

پھر میں نے امی پر زور دینا شروع کیا کہ چھوٹی بہنوں اور بھائی کو بھی کلام پاک پڑھوائیں۔ عبدالحمید نے بھی انہیں سمجھایا اور اس کی اہمیت کا احساس دلایا تو امی نے انہیں بھی قرآن پڑھنے بٹھادیا۔ میری زندگی کی مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں‘ اس خبیث جن سے تو میرا پیچھا چھوٹ گیا تھا لیکن اس کے بداثرات میرے جسم میں رہ گئے تھے۔

اللہ کے حکم سے میرے ہاں بچے کی خوش خبری ملتی لیکن دو تین ماہ میں سب کچھ ختم ہوجاتا پھر ڈاکٹری علاج سے اتنا ہوا کہ دو بچے میرے پورے نو ماہ میں ہوئے لیکن مردہ پیدا ہوئے اور ان کے جسم پر جلنے کے سے نشان تھے۔

پھر آٹھ سال کے بعد اللہ نے مجھے زندہ سلامت بیٹی عطا کی‘ وہ بالکل صحت مند تھی۔ عبدالحمید بہت خوش تھے‘ اس کو پیار سے گود میں لے کر کہتے ”میں اپنی بیٹی کو عالمہ بناؤں گا“ وقت گزرتا گیا بہت کچھ زندگی میں تبدیل ہوگیا‘ اس بیٹی کے بعد میری کوئی اور اولاد نہیں ہوئی‘ اگلے چار سالوں میں میرے ساس سسر کا انتقال ہوگیا۔

میری بیٹی رابعہ سلطانہ سولہ برس کی تھی کہ عبدالحمید اللہ کو پیارا ہوگیا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق اسے عالمہ کا کورس کروایا پھر اس کی شادی کردی۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے اس کا شوہر بھی غریب ہے لیکن نیک اور صابر شاکر ہے‘ مجھے کسی نے آپ کے گھر کے بارے میں بتایا تھا تو میں یہاں آگئی۔ اللہ کا کرم ہے‘ عزت کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے۔

”بیٹا میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں اس لیے تمہیں ایک بزرگ کی حیثیت سے سمجھا رہی تھی کہ خوشبو مت لگاؤ اور خاص طور پر موتیے کا عطر۔“

انہوں نے اپنی روداد ختم کی تو میں ایک جھرجھری لے کر ہوش میں آگئی‘ امی نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے جھٹ کان پکڑ لیے۔

جذبۂ جنون

حنیف قادری

خیر اور شر کی قوتیں ازل سے ابد تک نبرد آزما رہیں گی‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔ بس یہ بندے ہی ہیں‘ جو ناشکری کا اظہار کرکے اس کی رحمتوں اور نعمتوں سے خود کو دور کرلیتے ہیں۔
۱۹٦٥ء کی پاک بھارت جنگ کا ایک ناقابل یقین قصہ‘ ایسے واقعات ایمان والوں کے ساتھ ہی پیش آتے ہیں۔

انڈین آرمی نے چاروں طرف سے مجھے گھیر رکھا تھا۔ آرمی کے جوانوں کے بوٹوں کی دھمک میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اس وقت انکل شیام کی کٹیا کی دو چھتی کے درمیان بنے ایک چھوٹے سے خلا میں چھپا کر ساری کارروائی کو محسوس کر رہا تھا۔ انڈین فوجی بے خوفی سے گھر کی چیزیں ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ انکل شیام بے چارے ان کے پاؤں پڑ رہے تھے مگر وہ جوں جوں ان کی منت کر رہے تھے وہ لوگ انہیں اور بھی ذلیل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ لاجونتی جسے میں پیار سے لاجو کہا کرتا تھا وہ میرے ساتھ ہی موجود تھی۔ اس جگہ انکل شیام اکیلے ہی اپنی بیٹی لاجونتی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کا بیٹی کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی پتنی عرصہ ہوا سورگ باش ہوچکی تھی۔ میں یہاں کافی عرصہ کے بعد آج دوپہر کو وارد ہوا تھا۔ لاجو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ ایک سال پہلے میری اس سے منگنی ہوچکی تھی گو کہ اس منگنی میں میرے اور اس کے باپ کے علاوہ کوئی شامل نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی لاجو کی ضد پر یہ منگنی ہوچکی تھی۔ یہ کٹیا گاؤں سے کافی ہٹ کر ویرانے میں بنی ہوئی تھی۔ شیام انکل کی یہاں دس بیگھہ زمین تھی اور پتنی کی وفات کے بعد وہ کچھ تنہائی پسند ہوگئے تھے۔ ویسے بھی گاؤں سے کافی دور ہونے کی وجہ سے انہیں کھیتوں میں روز آنے جانے میں مسئلہ ہوتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے گاؤں کی رہائش کو خیرباد کہہ کر کھیتوں میں ہی مٹی اور گارے سے ایک چھوٹا سا گھر بنالیا تھا اور اس میں وہ دونوں باپ بیٹی سکون سے رہ رہے تھے۔ بنیادی طور پر وہ ایک تنہائی پسند اور شریف آدمی تھے۔

گارے اور مٹی سے بنے اس چھوٹے سے گھر کے سامنے تھوڑی سی دوری پر انکل شیام اور میں نے ایک چھوٹی سی کٹیا بنا رکھی تھی۔ جسے وہ گرمیوں کے دنوں میں کھلی ہوا کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کٹیا کی چھت پر انہوں نے درمیان میں مضبوطی کے لیے دو شہتیر رکھے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی کے کافی بڑے اور موٹے شہتیر تھے۔ ان دو شہتیروں کے درمیانی حصے کے خلا کو میں نے مضبوط لیکن باریک نائیلون کی ڈوری سے کس کر باندھ دیا تھا اور اس کے نیچے اور اوپر ساری کٹیا کی چھت کو پولی تھین شیٹ سے بند کردیا تھا۔ دو شہتیروں کے درمیان ایک اچھا بھلا خلا موجود تھا اور اسی خلا میں‘ میں اس وقت موجود تھا۔ مجھے امید تھی کہ نیچے سے کوئی بھی چیک کرتا تو وہ اس راز سے واقف نہیں ہوسکتا تھا اور یہی میں نے اس کٹیا کو بناتے وقت سوچا تھا۔

انڈین آرمی کے لوگ کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ سارے گھر کی تلاشی لے چکے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کٹیا کو انہوں نے سرسری سی نظر

سے دیکھا اور اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ حالانکہ اگر وہ تھوڑا سا غور کرتے تو اس راز تک پہنچ سکتے تھے مگر یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ سامنے پڑی چیز کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ آج جب وہ لوگ اس طرف آرہے تھے تو میں اس وقت چھت پر بیٹھا سورج کی آخری کرنوں کا خوب صورت منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نیچے اتر کر انکل شیام کو اچھی طرح ہر چیز سمجھادی تھی۔ گو کہ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم دونوں کہاں چھپیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ میں انتہائی مجبوری کے علاوہ انہیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لاجو کو میں نے اس لیے اپنے ساتھ رکھا تھا کہ انڈین آرمی کے لوگ کسی لاچار اور مجبور لڑکی کو دیکھ کر اندھے ہوجاتے تھے اور پھر یہاں اس ویرانے میں تو ان باپ بیٹی کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

ان لوگوں کی انکل شیام سے پوچھ گچھ جاری تھی اور مجھے لگتا تھا کہ وہ تشدد پر اتر آئیں گے اور یہی ہوا انکل شیام سے مطلب کی معلومات نہ ملنے کی وجہ سے ان لوگوں نے انکل کی خوب پٹائی کی۔ مگر انتہائی حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ میرے بارے میں تو پوچھ ہی نہیں رہے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ وہ انکل شیام سے ان کے دوستوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انکل شیام کے تعلقات کمیونسٹ تنظیم سے تھے اور اس سلسلے کو خفیہ رکھنے کے لیے ہی وہ اس جگہ رہ رہے تھے اور اسی لیے انہوں نے کچے مکان کے نیچے ایک پختہ تہہ خانہ بھی بنوا رکھا تھا۔ شاید کسی نے ان کے بارے میں مخبری کردی تھی اور انڈین آرمی کے لوگ شاید اسی لیے یہاں موجود تھے۔ اب یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں بھی یہاں موجود تھا۔ مجھے تو انکل شیام نے خود بلایا تھا اور کہا تھا کہ میں اپنی امانت یعنی لاجو کو آکر لے جاؤں جس سے کچھ عرصہ پہلے میری خفیہ طور پر منگنی ہوچکی تھی۔ لاجونتی کے بارے میں بھی وہ لوگ انتہائی غلیظ زبان میں بات کررہے تھے اور وہ بار بار یہ پوچھ رہے تھے کہ اس نے لاجونتی کو کہاں چھپایا ہے۔ انکل نے کہا کہ لاجو آج صبح ہی سے قریبی گاؤں میں اپنی سہیلی کانتا کی شادی میں گئی ہوئی ہے اور وہ ابھی تک نہیں لوٹی۔ شاید وہ اب صبح ہی آئے گی۔ ایک فوجی انہیں اپنی بیلٹ کے ذریعے بے دردی سے مار رہا تھا اور انکل شیام بے چارے منت سماجت کرکے ان لوگوں سے جان چھڑوانے کی کوشش میں تھے۔ آخر کار شاید ان لوگوں کو اس بوڑھے پر ترس آگیا اور انہوں نے انکل کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

”جونہی تمہاری چھوری واپس آئے اسے لے کر بڑے صاحب کے بنگلے پر پہنچ جانا۔ ورنہ تو جانتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کرسکتے ہیں۔ تیری اس چھمک چھلو کو اٹھا کے لے جائیں گے۔“ اس نے انکل شیام کو گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔

”جی سر جی! میں سمجھ گیا جی۔ میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا سر جی۔ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کی بات کو بھلا دیویں۔“ انکل شیام نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں ان لوگوں کے نام اور پتے یاد کرلو جو کہ وقتاً فوقتاً تمہارے مہمان بنتے رہتے ہیں۔ ہم جلد ہی تم سے پھر رابطہ کریں گے۔“

ان لوگوں کے جاتے ہی انکل شیام گھر چلے گئے۔ مگر میں اور لاجو اس کے کم از کم ایک گھنٹہ بعد وہاں سے نکلے۔ ہمارے چہرے اور ہاتھوں پر کئی جگہ چھت کے سرکنڈے لگ جانے کی وجہ سے چہرے سے آچکے تھے اور ان سے ہلکا ہلکا خون رس کر خود ہی بند ہوگیا تھا۔ میں اب بھی محتاط تھا۔ کیونکہ مجھے شک تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے کچھ بندے اب بھی کہیں چھپ کر نگرانی کررہے

ہوں اور موقع ملتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر یہ رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔ میں آخر کب تک یہاں چھپ کر پڑا رہتا۔ مجھے ہر حال میں یہاں سے نکلنا تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا انکل شیام خون میں لت پت صحن میں پڑے تھے۔ مگر یہ سب کیسے ہوگیا؟ انکل شیام کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے صحیح سلامت گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟ پھر یہ ان کی حالت کون کر گیا؟ میرے مالک چند لمحوں میں یہ کیسے ہوگیا؟ انکل شیام زندہ بھی تھے یا نہیں؟ انڈین آرمی تو واپس چلی گئی تھی تو پھر انکل شیام کے ساتھ یہ سب کون کر گیا؟ اتنے میں لاجو کی نظر اپنے پتا پر پڑی تو بے اختیاری میں اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس سے پہلے کہ میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ایک عجب واقعہ رونما ہوا۔ جانے کہاں سے انڈین آرمی کے سپاہی نکلے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اب وقت ہاتھ سے گزر چکا تھا۔ یہ پانچ سپاہی تھے۔ میں ان کے ٹریپ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ دو سپاہیوں نے لاجو کو اپنے قابو میں کرلیا تھا اور بقیہ تین مجھ سے چمٹ گئے تھے۔ وہ مجھے قابو کرکے ہتھکڑی لگانا چاہتے تھے مگر میں ان کے نرغے میں پھنسنے کا مطلب بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ خطرہ بھانپتے ہی میں نے پنڈلی سے اپنا خنجر اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ایک سپاہی مجھے پیچھے سے پکڑ کر میرے ہاتھ میری پشت پر لے جانے کی بھرپور سعی کررہا تھا۔ دوسرا سپاہی مجھے گردن سے دبوچ کر بے بس کرنے کی کوشش کررہا تھا جبکہ تیسرا سپاہی نیچے بیٹھا میرے پاؤں میں نائیلون کی ڈوری ڈال کر مجھے باندھنا چاہتا تھا۔ شاید وہ لوگ مجھے زندہ گرفتار کرنے کے چکر میں تھے۔ مگر اس چکر میں وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا واسطہ کس شخص سے پڑا ہے۔ وہ شخص جو میرے ہاتھ پیچھے لے جانے کی کوشش کررہا تھا وہ میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ میرے ایک ہاتھ میں خنجر دبا ہوا ہے۔ میں نے برقی سرعت سے پاؤں نیچے بیٹھے شخص کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار کک جڑ دی وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا نیچے گرا۔ اسی لمحے میرے ہاتھ میں موجود خنجر میری پشت پر موجود شخص کے پیٹ میں گھستا چلا گیا۔ وہ سپاہی چیخ مارتا ہوا پیچھے کی طرف گرا۔ اسی اثنا میں جس شخص نے میری گردن پکڑ رکھی تھی اس نے میرے منہ پر ایک زبردست مکا جڑ دیا۔ میں قدرتی طور پر پیچھے کی طرف ہوا مگر میں نے ایک زبردست قلابازی لگائی اور پیچھے کھڑے ان دو بندوں پر جا پڑا جنہوں نے لاجو کو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے انتہائی برق رفتاری سے خنجر کو بلند کیا اور یکے بعد دیگرے دونوں بندوں کے حلقوم پر پھیر دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسی جنون میں میں پیچھے کی طرف مڑا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے کھڑا شخص گن کو دستے کی طرف سے پکڑے میرے سر پر مارنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے بچنے کی کوشش کی مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ پھر بھی میں نے تیزی سے جست لگائی، اس سے یہ ہوا کہ اس کی گن کا دستہ میرے کندھوں سے ٹکرایا۔ ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے کندھوں کو کسی نے جڑ سے ہی اکھاڑ دیا ہے۔ مگر اس وقت یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بندہ دوبارہ مجھے ہٹ کرنے کی کوشش کرتا میں نے نیچے لیٹے لیٹے ہی اس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگا کر اسے اپنی طرف ایک زبردست دھکا دیا وہ جونہی نیچے میری طرف آیا تو میں نے خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ اس نے ایک زبردست چیخ ماری اور میرے اوپر گرا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے نیچے گرتے ہوئے وجود کو اپنے اوپر گرنے سے روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے سے خنجر نکالا۔ میدان میں صرف ایک بندہ ہی زندہ رہ

گیا تھا۔مگر وہ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ چکا تھا۔میں جو نہی جست بھرتے ہوئے اوپر اٹھا تو میں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا۔میں حیران تھا کہ اس کے ہاتھ میں رائفل بھی موجود تھی مگر پھر بھی وہ بھاگ گیا تھا وہ اگر رائفل سے مجھے ہٹ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے پاس بہترین موقع تھا۔بہرحال اس کا بھاگ جانا میرے لیے انتہائی نقصان دہ تھا۔میں اسی جنون کی حالت میں اس کے پیچھے بھاگا۔وہ مشکل سے ابھی دروازے تک پہنچا تھا۔وہ مخبوط الحواس ہو کر چیخیں مارتا ہو بھاگا جا رہا تھا۔میں نے اس کی پسلیوں کا نشانہ لیتے ہوئے خنجر اس کی طرف پھینکا۔پسلیوں میں خنجر کے لگتے ہی وہ شخص نیچے گر کے تڑپنے لگا۔لگتا تھا کہ اس شخص کو بھی انڈین فوجیوں کے لہو کے پیاسے خنجر نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔میں اس کے قریب پہنچا تو اس کی چیخیں ایک عجیب سے ہراس میں تبدیل ہو چکی تھیں۔میں نے احتیاط سے خنجر اس کی پسلیوں سے نکالا اور اس کے شور سے بچنے کے لیے اس کے حلق پر پھیر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

انڈین فوجیوں کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔میں واپس مڑا تو دیکھا، لاجو سکتے کی سی کیفیت میں اپنے پتا کی لاش کے پاس بیٹھی عجب سی نظروں سے ارد گرد پڑی لاشوں کو تک رہی تھی۔میں اس کے پاس پہنچا تو میں نے اسے سکتے سے نکالنے کی خاطر جھنجوڑا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔میری تھوڑی سی تگ ودو سے اسے کچھ تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔اگر لاجو کو یہاں کوئی خطرہ نہ ہوتا تو میں کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔مگر میں جانتا تھا کہ وحشی بھیڑیوں کا بدمست غول کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے اور اگر اس وقت انہیں لاجو یہاں ملتی تو اس کی خیر نہیں تھی۔چند منٹوں کے بعد لاجو کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے باپو کی طرف دیکھا۔وہ شاید آخری سانسیں لے رہے تھے۔لاجو نے ان کا سر اپنی گود میں لے لیا اور روتے ہوئے ان سے کہا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے باپو! دیکھو ناں سرحد پار سے خرم تمہارے کہنے پر یہاں آیا ہے اور آج تو تم مجھے اپنی پیاری بیٹی کو الوداع کرنا چاہتے تھے۔آج تو خوشی کا دن تھا۔کتنے پلان بنائے تھے آپ نے میرے لیے۔" وہ اپنے باپو سے باتیں کر رہی تھی کہ میں بھاگ کر نلکے سے پانی لے آیا۔مگر شیام انکل اس وقت اٹک اٹک کر سانسیں لے رہے تھے۔انہوں نے بڑی مشکل سے میرا ہاتھ تھاما اور لاجو کے ہاتھوں میں دے دیا اور اٹکتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میری لاج اب تمہارے حوالے ہے۔اس کا خیال رکھنا......"

اور اس کے بعد ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔انتہائی صدمے اور غم نے لاجو کو نڈھال کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

میں نے جلدی سے ایک ایک کر کے تمام لاشوں کو کندھوں پر لادا اور گھر سے باہر بنے بارشی پانی کے بڑے تالاب میں پھینک دیا۔ادھر سے فارغ ہوتے ہی میں نے انکل شیام کی لاش لکڑیوں کے درمیان رکھی، کیونکہ اس وقت تک لاجو اندر کمرے سے لکڑیاں لا کر صحن میں رکھ چکی تھی۔میں نے جلدی سے لکڑیوں کو آگ دی۔میں نے دیکھا اس وقت لاجو پاس ہی کھڑی رونے کے ساتھ ساتھ کوئی اشلوک بھی پڑھ رہی تھی۔اسی دوران مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی گھر کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر آیا ہو۔میں نے جلدی سے مرنے والے انڈین فوجیوں کے اسلحے سے ایک گن اٹھائی اور اس طرف بڑھا جس طرف سے آواز آئی تھی، مگر میں ابھی ادھر جا ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا قریبی گاؤں سے لاجو کے باپو کے بہترین دوست وکرم چند چلے آرہے تھے۔ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی

تھیں۔وہ کافی گھبرائے ہوئے تھے۔مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"راجو! تم کب آئے؟ اور اگر تم آ ہی گئے ہو تو جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔فوجی یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے اور اگر انہوں نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ایک نئی انکوائری شروع ہو جائے گی۔وہ لوگ گاؤں سے گاڑیوں پر ادھر نکلے ہیں۔مجھے جونہی یہ پتہ چلا کہ وہ لاجو کو تلاش کر رہے ہیں تو میں گاؤں سے پیدل ہی ادھر بھاگ کر آیا ہوں۔" اتنے میں اس نے میرے عقب میں آگ کے لمبو کو دیکھا تو کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے راجو؟ یہ اتنی آگ کیوں روشن ہے؟ اور وہ تو سامنے شاید لاجو بٹیا ہے جو رو رہی ہے۔اس کا باپو کہاں ہے؟ وہ تو میری اطلاع کے مطابق یہیں موجود تھا اور اس نے فوجیوں سے بات بھی کی تھی۔"

میں خاموش رہا۔وکرم چند حیرانی کے عالم میں آگے بڑھا۔اس سے تھوڑی دیر بعد وہ ساری صورت حال سمجھ چکا تھا۔اتنے میں ہمارے کانوں میں فوجی گاڑیوں کے شور کی آواز آئی تو اس نے میرے اور لاجو کی طرف دیکھا اور ایک بار اپنے دوست کی جلتی ہوئی چتا کی طرف نظر ڈالی۔کوئی اور موقع ہوتا تو وہ جانے کیا کرتا۔مگر وہ بھی فوجی گاڑیوں کے لمحہ بہ لمحہ قریب آتے شور کو سن رہا تھا۔اسے یہ بھی علم تھا کہ میری اور لاجونتی کی منگنی ہو چکی تھی اور شاید وہ واحد شخص تھا، جسے اس بات کا علم تھا۔اس نے ایک ہاتھ میں لاجو کا ہاتھ پکڑا اور میرے ہاتھ میں تھما کر بولا۔

"راجو بیٹے! بحث کا وقت نہیں۔لاجونتی تمہاری امانت ہے۔اپنی امانت لے کر اس جگہ سے کہیں دور چلے جاؤ۔زندگی رہی تو دوبارہ پھر ملیں گے۔"

اس کے بعد میں نے لاجونتی کے ساتھ ان سے آشیرواد لیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ضرورت کا تھوڑا بہت سامان لاجو پہلے ہی ایک شاپر میں ڈال چکی تھی اور میں تو پہلے ہی اپنے کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ہمارے پیچھے ہی وکرم چند انکل بھی نکلے۔ہمارے وہاں سے نکلتے ہی فوجی گاڑیوں کے ٹائروں کے تیزی سے چرچرانے کی آوازیں آئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

میں اور لاجو بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے۔اس مقام سے تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر امرودوں کا ایک بہت بڑا باغ تھا۔ہم اس میں داخل ہوئے اور اس سے آگے نکلتے چلے گئے۔یہاں سے پکی سڑک کافی دور تھی اور ہمیں اس تک پہنچنے کے لیے ابھی کافی تگ ودو کرنا تھی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک انڈین آرمی کے لوگ وہاں پہلے سے موجود ہوتے۔یہ دسمبر کی یخ بستہ رات تھی۔چاند کی بھی آخری راتیں تھیں۔ہم نے سردی سے بچاؤ کے لیے گرم چادریں لے رکھی تھیں۔گیتا دیوی کی جاگیر شروع ہو چکی تھی۔کماد کی فصل شروع ہوئی تو ہم دونوں ایک کھال میں داخل ہوئے۔یہ پکا کھال تھا اور اس میں چلتے ہوئے ہمیں کوئی زیادہ مسئلہ نہیں ہو رہا تھا۔کماد کی فصل کی کٹائی ہو رہی تھی اور بڑے زمیندار ٹرالیوں پر کماد کا گنا لاد کر ملوں میں لے جاتے تھے۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب انڈیا اور پاکستان میں شوگر ملز اتنی زیادہ نہ تھیں۔اس لیے زمیندار لوگ دور دراز کا سفر کر کے بھی گنا شوگر ملز کو بیچتے تھے۔اس وقت گنے کا ریٹ بھی مناسب تھا اور یہ گڑ بنا کر بیچنے سے زیادہ آمدنی دے جاتا تھا۔زمیندار گڑ بنانے کے طویل اور تھکا دینے والے عمل سے بھی بچ جاتے تھے اور گڑ کی نسبت منافع بھی زیادہ کما لیتے تھے۔مگر یہ صرف ان زمینداروں کو سوٹ کرتا تھا جن کا ٹریکٹر ٹرالی اپنا تھا اور ظاہر ہے یہ سہولت صرف بڑے زمینداروں کے پاس ہی تھی۔چھوٹے زمیندار بے چارے اب بھی گڑ بنا کر بیچنے پر مجبور تھے۔

کماد کے دوسرے سرے پر گیتا دیوی نے ایک سنگل لنک روڈ بنوا رکھا تھا جو کہ اس سلسلے میں اس کے

کام آتا تھا۔ ہم اس لنک روڈ سے ابھی تھوڑا سا پیچھے ہی تھے کہ ہمیں سنگل روڈ سے کسی ٹرالی ٹریکٹر کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ جی ٹی روڈ ابھی کافی دور تھا اور اس تک پیدل جانا تو ویسے بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس ٹرالی میں ایک طریقے سے ہم اگر سفر کر سکتے تو میرے خیال میں ہم نہ صرف جلد جی ٹی روڈ تک پہنچ جاتے بلکہ یہ طریقہ ہمیں ملٹری والوں سے بھی محفوظ رکھتا۔ میں نے لاجونتی کو سمجھایا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس نے میری بات سنتے ہی کہا۔

”اگر ایسے ہو سکتا ہے تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

اس کے بعد ہم نے حتی المقدور اپنی رفتار تیز کر دی اور خدا کا شکر ہے کہ ہم نے جلد ہی ٹرالی تک کا فاصلہ طے کر لیا۔ یہ کام کافی خطرناک اور رسکی بھی تھا۔ مگر ان حالات میں جب ہماری زندگی ہی داؤ پر لگی تھی یہ رسک لیے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں چلتی ٹرالی کے نیچے گھس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں میرا مطلوبہ سامان موجود تھا۔ ان لوگوں نے لوہے کی چارپائی مضبوط لوہے کی زنجیر سے باندھ رکھی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس کی میں اللہ پاک سے دعا کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹرالی کے نیچے سے نکل کر لاجونتی کو چارپائی کی موجودگی کے بارے میں بتایا۔ جلد ہی ہم دونوں اس چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ لنک روڈ نیا نیا بنا تھا اور ابھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچا ہوا تھا۔ اگر یہ کہیں سے ٹوٹا ہوا ہوتا تو یہ ہمارے لیے انتہائی نقصان دہ تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم جلد ہی جی ٹی روڈ تک بخیریت پہنچ گئے۔

اب کچھ سویرا ہو چلا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا اور اس کے ساتھ ہی ہم بھی خطرے کے مقام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے جانے لاجونتی کے گھر میں کیا پیش آیا تھا۔ بہرحال اب ہماری وہاں واپسی ناممکن تھی۔ انڈین انٹیلی جنس یقیناً ہماری تلاش میں متحرک ہو چکی تھی اور اب تک تو وہ کئی جگہوں پر ناکے بھی لگا چکے ہوں گے۔ ان کے پانچ بندے مر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی فورسز کو میری خطرناکی سے بھی آگاہ کر دیا ہو گا۔ اب دن نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہلکی سی دھند کے بعد سورج کی سنہری کرنیں ہر سو پھیلتی جا رہی تھیں۔ موسم یقیناً بہت اچھا تھا۔ سردیوں کے موسم میں صبح کی دھوپ انسان کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے مگر میں اس موسم کا مزہ نہیں لے سکتا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی کے نیچے لٹکی اس چارپائی پر لیٹ کر سفر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ہر لمحے ہمارے جسموں کے تمام اعضاء ہل کر رہ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے تھوڑی ہی دیر میں ہمارے جسم کے تمام پارٹس ہچکولوں سے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ لاجو اور میں ایک دوسرے سے زبردستی سے ٹکرانے پر مجبور تھے۔ لاجو اب بھی اس سانحے میں گم تھی جو رات پیش آیا تھا اور جس نے اس کے پیارے باپو کی جان لے لی تھی۔ ویسے اس کا پیار بھی تو مجھ سے مثالی تھا۔ جب میں نے پہلی بار اسے اپنی حقیقت بتائی تھی تو وہ مغموم تو ضرور ہو گئی تھی مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی مجھ سے اس کے پیار میں کمی آئی تھی بلکہ وہ مجھ پر کچھ اور بھی بھروسا کرنے لگی تھی۔

یہ وہی تھی جس نے ضد کر کے مجھے اپنے باپو سے ملوایا تھا، ورنہ میں کب اس کے باپو سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ دشمنوں کا دیس تھا اور میں جانے کیوں لاجو کے پاس اپنا دل کھول بیٹھا تھا اور یہ یونہی بے وجہ تو نہیں تھا۔ اس دن جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن کیا صورت حال تھی۔ اس دن اگر وہ میری مدد نہ کرتی تو میں بروقت اپنے ملک تک وہ معلومات نہ بھیج پاتا جن کی اس وقت میرے ملک کے جیالوں کو سخت ضرورت تھی۔ وہ وقت گزر جاتا اور ہم جانے کتنے نقصان کے بعد بھی وہ سب کچھ حاصل نہ کر پاتے جو کہ میرے ملک کے جانبازوں نے میری معلومات کو دیکھتے ہوئے چند شہیدوں کے لہو سے حل کر لیا تھا۔ یہ سن انیس سو پینسٹھ کی جنگ کا زمانہ تھا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں واہگہ بارڈر پر ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔ میرے پاس انڈین آرمی کے اسلحہ کے ذخیرے سے متعلق کچھ مصدقہ خبریں تھیں جو کہ میں پاکستان آرمی تک پہنچانا چاہتا تھا مگر اس دن میرے پیچھے انڈین انٹیلی جنس لگی ہوئی تھی۔ میری ایک ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور میں انتہائی زخمی حالت میں تھا، گو کہ میں نے اپنی اس زخمی ٹانگ کو ایک رومال سے کس کر باندھ لیا تھا اور خون کا اخراج بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر اس سے پہلے جب میری ٹانگ میں یہ گولی گھسی تھی تو اس کے بعد کافی دیر تک خون بہتا رہا تھا۔ خون کی کمی نے مجھے نقاہت کا شکار کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ جب مجھے گولی لگی تو اس کے فوراً بعد مجھے انڈین آرمی کی فوجی جیپ میں فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ لوگ بھی میرے پیچھے جیپ پر ضرور آئے مگر اسی وقت ان کے اسلحہ خانے میں دھماکے شروع ہو گئے۔ ان دھماکوں کا سبب بھی میری ذات ہی تھی۔ جب گولی لگنے کے بعد میں ان کی جیپ میں وہاں سے فرار ہو رہا تھا تو آتشیں بموں کے دھماکے شروع ہوئے تو ایک بم کا ٹکڑا ان فوجیوں کے درمیان ٹکرا جو میرے پیچھے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندے کے لیے امداد غیبی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بہرحال میں ان کے دفاعی امور سے متعلق کچھ سیکرٹ راز چرا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہاں سے نکلتے ہوئے میری ایک ٹانگ میں دشمن کی گولی آن گھسی تھی۔ اس طرح کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ لوگ میرے پیچھے نکلے ضرور، مگر اتنی دیر میں میں ان سے کافی دور نکل چکا تھا۔ مناسب فاصلے پر پہنچتے ہی میں نے جیپ درختوں کے ایک بڑے جھنڈ میں کھڑی کی اور پیدل ہی پاکستانی سرحد کی طرف بڑھا۔ ان دنوں سرحد کے قریب قریب ہر جگہ فوجی پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سارا ہی ریڈ زون تھا۔ خطرہ ہر جگہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں اس وقت انڈین فوج کی وردی میں ملبوس تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اگلے مورچوں تک میرے بارے میں خبر پہنچ چکی ہو گی۔ مگر یہ خطرے میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ آج میرے اندر اتنا جنون بھرا ہوا تھا کہ جو بھی میرے آگے آتا جل کر خاک ہو جاتا۔ مجھے ہر قیمت پر پاکستان میں موجود دشمن کے خلاف مورچہ زن اپنے دوستوں تک پہنچنا تھا۔ مگر پاکستانی سرحد ابھی کافی دور تھی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری توانائیاں جواب دیتی جا رہی تھیں۔ یہ میرا جذبہ ہی تھا جو کہ مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا ورنہ میری حالت انتہائی نازک تھی۔

میں جانے کب تک اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ میرے اندر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے مگر مجھے ایک بار پاکستان آرمی کے غیور جوانوں تک ضرور پہنچنا ہے۔ میرا وجود ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں لٹکا ہوا تھا۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی لمحے گر جاؤں گا مگر مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس کے سہارے میرا وجود اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی طاقت ہے جو ہمیشہ سے حق پرستوں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کھیتوں کے درمیان ایک لڑکی چارہ کاٹ رہی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے میں محو تھی۔ پھر جانے کیسے میرے وجود کو ایک ٹھوکر لگی اور میں جس کھال پر چل رہا تھا اس کی منڈیر پر بیٹھتا چلا گیا۔ آخری احساس جو مجھے ہوا وہ یہ تھا کہ وہ پیاری سی مٹیار میرے اوپر جھکی ہوئی کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ مجھے ہوش آیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کال

کوٹھری میں بند ہوں۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے لگا کہ جیسے یہ کسی گھر کا کچن ہے۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میری ٹانگ سوج چکی تھی۔ لگتا تھا کہ اس میں گولی کا زہر پھیل گیا ہے۔ مگر مجھے تو ہر حال میں پاکستان پہنچنا تھا۔ اتنے میں مجھے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد کچن کا دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا ہاتھ میں لالٹین لیے وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے جونہی ہوش میں دیکھا تو کہنے لگی۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔" یہ کہہ کر اس نے لالٹین کی لو نیچے کر کے ایک جگہ پر رکھی اور ایک بار پھر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے میرے قریب ہی رکھ دی۔

بہر حال اس نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد مجھے نیم گرم دودھ میں دیسی گھی ملا کر پلایا۔ میرے وجود میں کچھ جان آئی تو میں نے اس سے چھری لانے کو کہا۔ چھری آگ پر گرم کرنے کے بعد میں نے اپنی ٹانگ کا آپریشن کر کے گولی نکالی۔ یہ ایک انتہائی تکلیف دہ عمل تھا۔ مگر اس کے کیے بنا بھی کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ ٹانگ میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے میرے جسم کے تمام پٹھے اکڑ گئے تھے۔ ٹانگ میں سے گولی نکل جانے کی وجہ سے مجھے کافی سکون ملا۔ لاجونتی نے ایک بار پھر مجھے دودھ اور دیسی گھی پلایا۔ خون کا اخراج بند کرنے کے لیے میں نے ایک بار پھر ٹانگ کے متاثرہ حصے پر کس کے پٹی باندھ دی۔ اس تمام کارروائی کے دوران لاجونتی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ کافی سمجھدار اور بہادر لڑکی تھی۔ ظاہر ہے وہ اس ویرانے میں اپنے باپو کے ساتھ بچپن سے رہتی آرہی تھی تو اس میں یہ خصوصیات تو پیدا ہونی ہی تھیں۔ اس نے مجھے مزید بتایا کہ اس کے باپو کو انڈین فوجی زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ دراصل ان کے کمانڈر کی مجھ پر نظر پڑ گئی تھی اور وہ مجھے غلط نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے اٹھوا چکا ہوتا مگر پچھلے دو دنوں بارڈر پر زبردست لڑائی شروع تھی اور انہیں اپنی جان پڑی ہوئی تھی۔ وہ جونہی اس جنگ سے فارغ میری خیر نہیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ان کے مویشی ان کے دوست وکرم چند کے گھر میں بند ہوئے تھے اور وہ خود بھی ان کے گھر میں پناہ گزیں تھی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک دو بار انڈین فوجی اسے تلاش کرتے ہوئے گاؤں تک آئے تھے وہ گاؤں میں سے دس بارہ لڑکیاں لے گئے جبکہ لاجونتی اس وقت ویسے ہی گاؤں سے باہر نکلی کھیتوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جنگ شروع ہونے بعد جب اس کے باپو کو بھی فوجی اٹھا کر لے گئے تو ایک دفعہ غصے میں بارڈر پر چلی تو گئی تھی اور کمانڈر صاحب سے ملی بھی تھی مگر اس وقت کمانڈر خود بھی پریشان تھا۔ اس نے اسے رکنے کا حکم دیا اور کہا کہ ایک رات یہاں رہے تو صبح اسے اس کے باپو کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے گا مگر لاجونتی کمانڈر کی نگاہوں میں چھپی ہوس کو پڑھ چکی تھی۔ وہ چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔ آتے ہوئے بھی اس پر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ توپوں کی گھن گرج جاری تھی اور اس سارے علاقے میں بارود کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جہاں بھی ہندو فوجیوں کو دیکھا ان کے چہرے خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ وہی لاجونتی جس کے لیے یہ لوگ پاگل ہو رہے تھے ان کے پاس سے گزری کسی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ شاید موت کے خوف نے انہیں شیر سے گیدڑ بنا دیا تھا۔ یا پھر ہو سکتا فوجیوں نے اس پر اس لیے بھی توجہ نہ دی ہو کیونکہ کمانڈر کا شکار تھی۔

آج وہ ادھر گاؤں سے اپنے مویشیوں کے لیے چارہ لینے آئی تھی کیونکہ پچھلے دو دنوں سے باپو کا دوست وکرم بیمار تھا۔ جب اس نے مجھے انتہائی بری حالت میں

پڑتے دیکھا تو وہ صورت حال جاننے کے لیے بڑھی اور پھر میرے منہ سے پاکستان کے الفاظ سن کر وہ مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گھر لے آئی۔ مجھے کچن میں بند کر کے وہ گاؤں میں مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈال کر اور دودھ لے کر رات کو چوری چھپے گاؤں سے واپس آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت بہادر اور باہمت لڑکی تھی۔

میرا آپریشن کامیاب ہو چکا تھا اور اب میں انڈین بارڈر کراس کر کے وہ فائل اپنے دوستوں تک پہنچانا چاہتا تھا جس کی میرے وطن کے غیور فوجی جوانوں کو اشد ضرورت تھی۔ یہ وہ خفیہ فائل تھی جس میں اس جنگ کے حوالے سے ایسی باتیں لکھی تھیں کہ اگر ان کا پاکستانی فوج کو پتہ چل جاتا تو وہ ان کی نہ صرف کمر توڑ سکتے تھے بلکہ ان کو ایسی شکست سے دوچار کر سکتے تھے جو ہندوستانی قوم نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچی ہو۔ بارڈر یہاں سے ابھی پندرہ کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور میری جسمانی حالت تو یہ تھی کہ میں لنگڑا کر چلنے سے بھی قاصر تھا۔ بخار اور درد کی اذیت نے مجھے ادھ موا کر رکھا تھا۔ مگر اس وقت دنیا کی کوئی بھی طاقت میرے جذبے کے آگے پل نہیں باندھ سکتی تھی۔ لاجونتی میرے چہرے کو دیکھ کر میرے خیالات پڑھ چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"باہر میرا گھوڑا تیار کھڑا ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو۔ مگر مجھے معلوم ہے تم کہاں جاؤ گے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج تم کسی کے کہنے پر یہاں رکو گے بھی نہیں۔ تمہاری آنکھوں کی لالی بتاتی ہے کہ تم آگ اور خون سے کھیلنے والے کھلاڑی ہو۔ مگر آج کی حالات میں آپ کو آپ کے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ میری ایک بات مان لو۔"

"کون سی بات لاجونتی! آج مجھے یہاں سے جانے سے مت روکنا۔ باقی یہ فرض ادا ہوتے ہی اگر زندہ رہا تو میں تم پر جان بھی نچھاور کر دوں گا۔ ذرا جلدی سے بولو کیا کہتی ہو؟"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گی کیونکہ میں یہاں پچھلے کئی سالوں سے رہ رہی ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں اور پھر دو دن پہلے میں ان کے مورچوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہی ہوں میں ان کی موجودہ دفاعی پوزیشنوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہیں بارڈر کراس کراتے ہی میں واپس لوٹ آؤں گی۔"

"لاجونتی! تم ایک بہادر اور باہمت لڑکی ہو۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عصمت پر کوئی داغ آئے۔ انڈین فوج بھیڑیوں کا غول ہے اور میں نہیں جانتا کہ آنے والا وقت اپنے ساتھ کیا کیا رنگ لے کر آئے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم گاؤں واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔ میرے اللہ نے چاہا تو اس جنگ کے بعد تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" اس نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

"ہاں کہو لاجونتی!"

"کیا یہ پاگل پن نہیں جو تم کر رہے ہو۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم اس وقت سانس بھی بڑی مشکل سے لے پا رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم راستے میں ہی کہیں گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی بے ہوش ہو جاؤ گے اور تمہاری ساری محنت ایک ضد کی نذر ہو جائے گی۔ کیا بے وقوفی ہے؟ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں؟ اور پھر مجھے اپنے باپو کو بھی ان کے چنگل سے چھڑوانا ہے۔ وہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ مجھے ایک نہ ایک دن یہ رسک تو لینا ہی ہے تو کیوں نہ میں ابھی سے اس کی پریکٹس شروع کر دوں۔ ویسے بھی میں تمہاری پابند نہیں ہوں۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور ہاں اگر تمہیں خودکشی کا شوق ہے تو الگ بات ہے۔ چلو اٹھو! اچھے بچوں کی

طرح میرے ساتھ چلو ورنہ ...“

اور پھر مجھے چاروناچار اس کی بات ماننا پڑی۔

یہ سفید رنگ کا بہترین گھوڑا اپنے مالک کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ لاجو میری کمر میں بانہیں ڈالے میرے پیچھے موجود تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ بارڈر سے توپوں کی گھن گرج جاری تھی۔ کبھی کبھی مشین گن کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ ہمارا گھوڑا برق رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہم کافی دور نکل آئے تھے کہ اچانک گھوڑے کے آگے میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ میں آج بھی اس وقت کو سوچتا ہوں تو میری کیفیت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیا دیکھا، مگر یہ وہ سچ ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سچائی کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔

ہم ابھی محاذ جنگ سے دو کلومیٹر کی دوری پر تھے اور اس وقت مسلمانوں کے قبرستان سے گزر رہے تھے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ محاذ جنگ پر آخر شب کا سکوت طاری تھا۔ شاید رات کی وجہ سے دونوں طرف سے جنگ کچھ دیر پہلے عارضی طور پر بند ہو گئی تھی۔ فوجیوں کے باتیں کرنے اوران کے وسل کی تیز آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی کسی کسی وقت سنائی دے رہی تھی۔ مجموعی طور پر ماحول پر ہول اور کسی قدر ڈراؤنا سا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کیا وجہ تھی کہ میں جو زندگی میں آج تک نہ تو کبھی گھبرایا تھا اور نہ ہی کبھی کسی خطرے کو خاطر میں لایا تھا۔ آج جانے کیوں میرا دل کانپ سا رہا تھا۔ یہ شاید ماحول کی سنسنی کا اثر تھا یا پھر کوئی اور بات تھی۔ یا پھر خون کی کمی کی وجہ سے میرے اعصاب کوئی گل کھلا رہے تھے۔ مجھے اپنے اردگرد کچھ نادیدہ آہٹیں سی سنائی دے رہی تھیں، جبکہ ظاہری طور پر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے اپنے آس پاس کا ماحول کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں کئی بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھ چکا تھا، مگر بہ کچھ ہوتو نظر آئے۔ اس بات کو شاید لاجونتی بھی محسوس کر رہی تھی اور جب اس نے میری کیفیات کو محسوس کیا تو اس نے میرے کان میں کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اچانک گھوڑے کو جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے ہنہنانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اگلی ٹانگیں کھڑی کیں اور ہمیں زبردستی نیچے گرانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ پاگل ہوتا چلا گیا۔ کبھی وہ اگلی ٹانگیں کھڑی کرتا اور کبھی پچھلی اور کبھی وہ تیزی سے آگے دوڑتا اور اچانک یوں رک جاتا کہ جیسے کسی چیز نے اسے باندھ کر رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اگلی ٹانگیں کھڑی کرتا اور زور زور سے ہنہنانے لگتا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف دوڑ لگا کر اور وہی انداز دوبارہ دہراتا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کئی قبروں کو اپنے پاؤں تلے روند چکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی باگیں تھام رکھی تھیں۔ لاجونتی نے مجھے کمر سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کئی دفعہ گھوڑے کو پچکار کر رام کرنے کی ناکام کوششیں کر چکی تھی مگر گھوڑا تھا کہ قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

گھوڑے کی اس بھاگ دوڑ اور تیزی سے ہنہنانے کی وجہ سے ہمیں ایک اور انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا تھا۔ محاذ جنگ کی طرف سے سیٹیوں کی تیز آواز کے ساتھ ساتھ فوجیوں کے للکارے بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ لوگ شاید ادھر ہی آرہے تھے۔ کیونکہ مجھے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی فوجی جیپوں کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ کسی بھی لمحے وہاں پہنچنے والے تھے۔ میری ساری محنت یوں اکارت چلی جائے گی یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مزید مصیبت یہ ہوئی کہ میری ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی جانے کیسے ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی اور اس میں سے دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ میں اور لاجونتی گھوڑے کی پیٹھ سے اترنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے، مگر ہماری اس سلسلے میں ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت ہمیں نہ تو گھوڑے سے گرنے دے رہی تھی اور نہ ہی گھوڑے پر آرام سے ٹکنے دے رہی تھی اور یہی صورت حال گھوڑے کے ساتھ تھی۔ وہ بے چارہ نہ تو آگے بڑھ پا رہا تھا اور نہ ہی پیچھے۔ ایک عجیب سا چکر تھا جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے تھے۔ مجھے پاکستان انٹیلی جنس میں کام کرتے ہوئے بارہا خطرناک سے خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر آج تک میں نے خود کو اتنا مجبور اور بے بس نہیں پایا تھا جتنا کہ اس رات۔ یاالٰہی میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا۔

اچانک فضا میں روشنی کا راؤنڈ فائر ہوا اور ایک دفعہ سارا ماحول روشنی میں نہا گیا۔ انڈین فوجیوں کی جیپوں کا کان پھاڑ دینے والا سائرن انتہائی قریب آتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پوری فوج ہی ادھر چڑھ دوڑی تھی۔ شاید کچھ فوجی پیدل بھی ادھر بھاگے آرہے تھے کیونکہ اس طرف سے ان کے للکاروں اور اونچی اونچی باتیں کرنے کی قریب ہوتی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر گھوڑے سے اترنے کی ناکام کوشش کی مگر اترنا تو دور کی بات ہے گھوڑے نے اب مکمل طور پر پاگل پن کا اظہار کرتے ہوئے تیزی سے اوپر نیچے بے ڈھنگے طریقے سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس وقت گھوڑا درخت کی شاخوں سے بے ترتیبی سے ٹکرا بھی رہا تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے گھوڑا درخت سے جا ٹکرائے گا اور ساتھ میں ہمارا بھی کباڑا کر دے گا۔ میں نے تیزی سے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اور اسے درخت سے تھوڑا سا دور لانے میں کامیاب رہا۔ مگر اس سے صورت حال کی خطرناکی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس وقت مجھے اپنی جان کی تو ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ سب معلومات جو کہ اس جنگ کی صورت حال کو یکسر تبدیل کر دیتیں، میری تحویل میں تھیں۔ میں نے بہت محنت اور جانفشانی سے یہ سب حاصل کیا تھا اور جب میں کامیابی کے انتہائی قریب تھا تو یہ سب یوں ہی اپنے ہاتھوں سے جاتا ہوا دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ ہو رہا تھا اور یہ دکھ مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔ میں مضبوط جال میں پھنسی اس مچھلی کی مانند تڑپ رہا تھا جو کہ جال سے نکلنے کو بے تاب تھی مگر اس جال کی مضبوط دیواروں سے سوائے سر ٹکرانے کے اور کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

فوجی جیپیں قبرستان کے کنارے پہنچ کر رکیں اور ان میں سے انڈین فوج کے جوان نکل کر ہماری طرف بھاگے۔ اس کے ساتھ ہی پیدل فوجی جوانوں کا دستہ بھی پہنچ چکا تھا وہ بھی چیختے چلاتے ہوئے قبرستان میں انتہائی جوش اور ولولے کے ساتھ داخل ہوئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ آخر کیا غلطی کر بیٹھا تھا میں جس کی مجھے یہ سزا مل رہی تھی؟ میں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے حصول کے لیے اس میدان میں اترا تھا، مگر شاید یہ میرے مالک کو منظور ہی نہیں تھا۔ روشنی کا راؤنڈ فائر ہوا۔ فضا میں ایک بار پھر روشنی پھیلتی چلی گئی اور ہم تو پہلے ہی ہوشیار ہو چکے تھے۔ ایک آخری کوشش کے طور پر میں نے جیب سے پستول نکالنا چاہا مگر وہ تو جانے کب کا گھوڑے کے پاگل پن سے لگنے والے بے ترتیب ہچکولوں سے کہیں گر چکا تھا۔ گھوڑے کا بے ڈھنگا ناچ اپنے عروج پر تھا۔ انڈین فوجی مجھے چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر شاید وہ ابھی کچھ دور تھے کہ ایک ایسا محیر العقول اور ماورق الفطرت واقعہ رونما ہوا جسے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔

میں نے دیکھا گھوڑا اچانک پرسکون ہوتا چلا گیا۔ فضا میں چھائے اندھیرے اک عجب سی روشنی میں ڈھلتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ میرے دل پر جو ایک بے نام سا خوف طاری ہو چکا تھا وہ ایک پرسکون صبر نما دلیری میں تبدیل ہو گیا۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ

انڈین فوجی مجھے گردن سے دبوچ لیتے۔ جانے وہ لاجونتی کا کیا حشر کرتے، جو بیچاری پہلے ہی ان کے مظالم کا شکار تھی۔ اب اس کے باپو کا کیا بنتا جسے وہ رات کے اندھیرے میں انڈین فوجیوں کے چنگل سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔ اچانک میرے کانوں میں کسی انڈین فوجی کی آواز آئی۔

”دیکھو بھاگنے نہ پائے سالا۔ اس کے گھوڑے کو آگے سے روکو۔ جلدی کرو۔ دیکھو وہ نکل رہا ہے۔“ اتنے میں مجھے کئی آدمیوں کے تیز تیز دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ میں جو گھوڑے کی گردن کے بالوں کو اپنی مٹھی میں اب بھی مضبوطی سے پکڑے آنکھیں بند کیے پشت سے چپکا بیٹھا تھا۔ ان آوازوں کو سن کر چونک اٹھا۔ ہائیں! یہ کیا کہا اس نے؟ بھاگو، پکڑو وہ نکل رہا ہے۔ کون نکل رہا ہے؟ کیا کوئی اور بھی یہاں موجود تھا جو بھاگ رہا ہے اور انڈین فوجی اس کے پیچھے لپک رہے ہیں اور پھر ابھی تک انہوں نے مجھے پکڑا کیوں نہیں؟ یہ کیا بات ہے؟ کیا میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ میں نے اپنے جسم پر ایک زوردار چٹکی لی مگر درد سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ تو پھر انڈین فوجی اندھے ہو گئے کیا؟ میں نے صحیح صورت حال جاننے کے لیے آنکھیں کھولیں تو میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف سفید دودھیا قسم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں میرا اپنا وجود بھی نہایا ہوا لگتا تھا۔ میں نے گردن ذرا سی پیچھے موڑ کر دیکھا۔ لاجونتی بھی میرے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے نیچے گھوڑے کی طرف نظر دوڑائی تو وہ بھی ہم دونوں سے ہم رنگ تھا۔ مگر ایک اور حیرت انگیز بات جو مجھے انتہائی ناقابل یقین لگی وہ یہ تھی کہ انڈین فوجی اس سفید دودھیا قسم کی دھند میں داخل ہوتے اور بھاگتے ہوئے گزر جاتے۔ تو کیا میرا اور لاجونتی کا وجود سفید دودھیا قسم کی دھند بن گیا تھا۔ میں نے آنکھوں کو زور زور سے ملا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی مگر منظر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا تھا؟ میں گھوڑے کی پشت سے کھڑا ہوا اور میں نے ایک دفعہ پھر غور سے اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر یہاں ایک اور حیران کن نظارہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ اچانک ایک انڈین فوجی بھاگتا ہوا آیا اور میرے وجود کی دھند سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں نے سامنے دیکھا، ایک نورانی صورت بزرگ ہاتھ میں عصا لیے سر پر سبز عمامہ پہنے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی یہ کوئی خواب تھا۔ میں نے اپنے نیچے دیکھا تو گھوڑا بھی سفید دودھیا رنگ میں تبدیل تھا مگر اس کی اگلی دونوں ٹانگیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کا سر نورانی صورت بزرگ کے قدموں میں دھرا تھا۔ یہ سب کیا چکر تھا؟ میرا، لاجونتی اور گھوڑے کے وجود کا ہلکا سا نشان تو نظر آ رہا تھا مگر یہ ہلکا سا نشان بھی یوں تھا کہ جیسے تصویری خاکہ ہو اور اس تصویری خاکے میں سے انڈین فوجی بھاگتے ہوئے گزرتے جا رہے تھے۔ یہ سب کیا تھا میرے مولا؟ انتہائی حیران کن صورت حال تھی یہ۔ میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے سوچا کہ شاید ہم مر چکے ہیں اور یہ بعد از موت کے حقائق ہیں جو کہ اب سامنے آ رہے ہیں تو کیا ہم مر چکے تھے؟ اور یہ نورانی صورت بزرگ کہیں موت کا فرشتہ تو نہیں؟ مگر یہ سبز عمامہ اور ہاتھ میں عصا کیا معنی؟ یہ گیٹ اپ تو مسلمان اولیائ کا ہے تو پھر کیا میں کسی اللہ کے ولی کے سامنے ہوں؟ اور ان کی کرامت سے یہ سب ہو رہا ہے؟ میری طرح لاجونتی بھی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں کھڑی سوچ رہی تھی اور اس کی سوچ اس حوالے سے جانے کیا تھی۔

میں کھڑا ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے گھوڑے کے سفید ہیولے کے سامنے کھڑے بزرگ کو دیکھا۔ وہ نیچے بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے گھوڑے کے سر پر انتہائی پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس کی باگیں پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ جانور شاید ہم سے زیادہ عقل مند تھا۔ جس حقیقت کو ہم کھوج نہیں پائے تھے وہ اس جانور نے کھوج لی تھی۔ وہ بڑے آرام سے اٹھا اور بالکل پرسکون ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس نورانی صورت بزرگ سے کچھ کہنا چاہا مگر میری زبان میرا ساتھ نہیں دے پائی۔ انہوں نے گھوڑے کی باگیں تھام کر مجھے پکڑائیں اور میری ٹانگ کے زخم پر ہاتھ پھیرا۔ ناقابل بیان سکون کی لہریں میرے وجود میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اس کے بعد وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے اور مجھ پر اور لاجونتی پر پھونکا۔ اس دوران انڈین فوجی جانے کس کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے۔ ان کے للکاروں اور اونچی آوازوں کی صدائیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ نورانی صورت بزرگ نے انتہائی شفقت کی نظر سے مجھے دیکھا اور فرمانے لگے۔

”بیٹا! زیادہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے، میرے ساتھ آؤ۔“

میں گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھامے ان کے پیچھے چلنے لگا۔ لاجونتی بھی میرے پیچھے ہی تھی۔ مگر یہاں ایک نیا تجربہ میرے سامنے تھا۔ کہنے کو تو یہ چلنا ہی تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اسے چلنا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میرا وجود ہلکا پھلکا ہو چکا تھا اور میرے پاؤں زمین سے صرف مس ہو رہے تھے۔ نہ تو اس میں میری کوئی توانائی صرف ہو رہی تھی اور نہ ہی کوئی تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے میرے محسوسات کے مطابق اگر تیرنا کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ بہرحال ہم چلتے ہوئے یا تیرتے ہوئے پاکستانی سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ہمیں انڈین فوجی محاذ جنگ پر چلتے پھرتے اور پہرہ دیتے ہوئے نظر آئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بہرحال ہم بڑی آسانی سے ان کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ نہ تو کسی انڈین فوجی نے ہمیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو شک ہوا کہ یہاں سے کوئی گزر رہا ہے۔ یہ سب کیا تھا؟ ابھی تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہم جلد ہی بڑی آسانی سے سرحد پار کر چکے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ پاکستانی فوجیوں میں انتہائی جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ پاکستانی فوج کے مورچوں سے ہم ابھی تھوڑا پیچھے ہی تھے کہ نورانی صورت بزرگ، مورچوں کی طرف جانے کے بجائے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ یہاں کچھ نئی حیرتیں میرے سامنے تھیں۔

آج کی رات تو شاید میرے حیران ہونے کی رات تھی۔ میں نے درختوں کے جھنڈ میں دیکھا۔ چند خوفناک اور ڈراؤنی قسم کی شکلیں ایک باریک سے سفید قسم کے جالی نما کپڑے میں بند تھیں اور وہ باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہی تھیں، دوسری طرف ایک کالا بھجنگ بدصورت شخص۔ جس کے چہرے پر ہی پھٹکار برس رہی تھی وہ بھی ویسے ہی جالی نما کپڑے میں بند پڑا واویلا کر رہا تھا۔ اچانک بزرگ نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور عربی زبان میں کچھ کہا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہر چیز خاموش ہوتی چلی گئی۔ رات کا سکوت ہر طرف طاری ہوتا چلا گیا۔ پاکستانی فوجیوں کے مورچوں سے جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں وہ بھی اب یہاں تک نہیں پہنچ رہی

حکمت

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک وفد میں چند بوڑھوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ نوجوان اپنے وفد کی نمائندگی میں کچھ کہنے لگا عمر بن عبدالعزیز نے نوجوان کو ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا اور کہا نوجوان تم خاش ہو جاؤ کسی بزرگ کو بولنے کو موقع دو۔ نوجوان نے جواب دیا امیر المومنین عقل و دانش کا تعلق سن و سال سے نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو آج مسند خلافت پر آپ کی جگہ کوئی بوڑھا شخص بیٹھا ہوتا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا نوجوان تم صحیح کہتے ہو مجھے اپنے غلطی کا احساس ہے ہاں اب تم اپنے وفد کی نمائندگی میں جو کچھ کہنا چاہتے ہو آزادانہ کہو میں سنوں گا۔

(مرسلہ: **محمد سلطان**......چنیوٹ)

ہیں۔ لگتا تھا کہ کسی کے ذریعے ہر قسم کی آواز کا اس ایریے میں داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اچانک سکوت شب کے اس سناٹے میں نورانی صورت بزرگ کی آواز گونجی۔ وہ شاید ان بلاؤں سے مخاطب تھے۔

”جب ہمارا تم لوگوں سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ یہ جنگ دونوں ملکوں کے سپاہیوں کے درمیان ہو گی اور ہم اس میں کوئی دخل اندازی نہیں کریں گے تو پھر تم نے عہد شکنی کیوں کی؟“

سفید قسم کے باریک جالی نما کپڑے میں مقید کالا بھجنگ ریچھ نما انسان گڑگڑایا۔

”حجور! ہم نے تو بہت کوسس کی۔ ان نانہجاروں کو روکنے کی، مگر یہ سالی کسی کی سنتی ہی کب ہیں۔ یہ کہوت ہیں کہ انہیں اوپر سے کوئی حکم نامہ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سب مجبور ہیں۔ آپ خود انہیں سے پوچھ لیں۔ سایدیہ آپ کو سچ سچ بتا دیویں۔ پرنتو ہمارا اس میں ایک رتی برو بر بھی دوس ناہیں۔ (ہمارا اس میں رتی بھر بھی گناہ نہیں۔“)

اتنے میں بلائیں چلانے لگیں۔

”حجور یہ جھوٹ بولت ہے۔ سارا کیا دھرا اسی جوگی وشرم ناتھ کا ہے۔ اسی نے ہم سے کہا تھا کہ گھوڑے کو بھٹکا کر اس قبرستان میں لانا ہے اور اس قبرستان میں ہی یہ منحوس بیٹھا کالے علم کی مالا جپ رہا تھا۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کے حکم کی وجہ سے کیا۔ اب یہ سارا الزام ہمی پر دھر رہا ہے۔“

اتنے میں وشرم ناتھ چلایا۔ ”میں نے تم سے کب یہ کہا تھا۔ کیا کرایا سب کچھ تمہی نے ہے اور الجام میرے سر دھر دیا ہے۔“

”خاموش! تم سبھی لوگ شروع سے ہی بد عہد ہو۔ بہرحال اس عہد کو خود تم لوگوں نے توڑا ہے۔ لہٰذا اسے اب ختم ہی سمجھو۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں قید ہی رکھوں اور وہ سزا دوں کہ تمہاری نسلیں بھی یاد رکھیں۔ مگر ہماری نظر میں تم جیسی چیزوں کی نہ تو کوئی اوقات ہے اور نہ ہی کوئی اہمیت۔ ہم تمہیں آزاد کر رہے ہیں۔ اب تم کھل کر کھیلو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا اب اگر تم یہاں مجھے نظر آئے اور تم نے پھر سے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ ان دونوں ملکوں کے سپاہیوں کی جنگ ہے اور انہیں ہی لڑنی چاہیے۔ ہمیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اب کے اگر تم نہ رکے تو تم جانتے ہو کہ ہم نے اگر ایک بھی وار کیا تو تمہارے پاس اس کا نہ تو کوئی توڑ ہے اور نہ کوئی حل اور ہاں اس بے وقوف چرن داس کالی ماتا کے پجاری سے کہنا کہ وہ یہ نہ سوچے کہ ہم سے بچ کر نکل گیا تو ہم اس کو پکڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم اگر چاہیں تو اسے ایک سیکنڈ کے چالیس ہزارویں حصے سے بھی پہلے پکڑ کر اس کی تمام صلاحیتیں ختم کر سکتے ہیں مگر ہم اللہ پاک کی رضا میں دخل نہیں دینا چاہتے۔ ہم تم سبھی لوگوں کو ایک مشورہ دیتے ہیں کہ اس جنگ میں اب دخل نہ دینا ورنہ تمہیں یہ بہت مہنگا پڑے گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔“

ان کے یہ کہتے ہی سفید رنگ کا باریک سا جال ختم ہو گیا اور وہ آزاد ہو گئے۔ آزاد ہوتے ہی وہ بلائیں اور وشرم ناتھ یوں بھاگے جیسے کہ انہیں دوبارہ پکڑے جانے کا خطرہ ہو۔ ہم نورانی صورت بزرگ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ اب صورت حال کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اتنے میں وہ بزرگ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

”بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں موجودہ صورت حال کے حوالے سے کئی سوال موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں اس حوالے سے کوئی پریشانی ہو۔ مختصراً بتائے دیتا ہوں۔ میری ذات کے بارے میں نہ تو کچھ سوچنا اور نہ ہی کبھی مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا، کیونکہ میں اس کے در کا ایک ادنیٰ سا غلام ہوں دنیا جس کی دیوانی ہے۔ اور میرے خیال میں اس سے بڑا تعارف کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے اور اوپر آسمانوں کی طرف نظر کر کے فرمانے لگے۔

”بیٹا! یہ جو دنیا ہے ناں اس میں دو قسم کی طاقتیں کار فرما ہیں۔ ایک اچھائی اور دوسری برائی کی طاقت اور میرا تعلق پہلی اور ابدی قوت سے ہے۔ جہاں تک آج کے واقعے کا تعلق ہے تو اس حوالے سے میں آپ کو بتا دوں کہ یہ سب برائی کی طاقتوں کی کارستانی ہے۔ تمہارا جذبہ اس مقام پر تھا کہ کچھ بھی ہو جاتا تم اپنے مقصد کو حاصل کر ہی لیتے۔ مگر میری یہاں پر ایسی طاقتوں کے خلاف ڈیوٹی ہے جو کہ گندے اور سفلی علوم کے ذریعے تم جیسے محب وطن لوگوں کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہیں اور اسی سلسلے میں میں ان لوگوں کو کافی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ یہ آپ کا ہر حال میں راستہ بند کرنا چاہتی ہیں اور در پردہ ہندوستانی فوج کی مدد کر رہی ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے مجھے حکم ملا کہ میں آپ کی مدد کروں اور پھر میں نے آپ کی مدد کی اور آپ کو سرحد پار کرا دیا۔“

اس کے بعد بھی وہ نورانی صورت بزرگ کافی باتیں کرتے رہے جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ لاجونتی اس بزرگ سے کافی متاثر تھی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ نورانی صورت بزرگ نہیں مانے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ضرور ہو گا مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ یہ کہہ کر نورانی صورت بزرگ نے لاجونتی کو گھوڑے پر بٹھایا اور مناسب ہدایات کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا اب کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا اور وہ خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائے گی۔ بہرحال جاتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے کچھ انوکھے پیغام تھے۔

اس کے بعد مجھے بھی کچھ انعامات سے نوازا گیا اور پاکستانی فوج کے مورچوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اب میں اپنی اصلی حالت میں واپس آ چکا تھا۔ میں تمام راز سینے میں دفن کیے اپنے دوستوں تک پہنچا تو ان لوگوں نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ میرے انکشافات اور انڈین آرمی کی اس جنگ کے حوالے سے حکمت عملی سے واقفیت کے بعد انہوں نے ذمہ دار افسران کی ایک میٹنگ کال کی۔ جس میں اس جنگ کے حوالے سے تمام ضروری فیصلے کیے گئے۔ اس دوران مجھے دو دن کے لیے زبردستی انہوں نے اسپتال پہنچا دیا۔ جہاں مجھے بلڈ لگایا گیا۔ ڈاکٹرز کے مطابق تو ابھی مجھے کم از کم پندرہ دن اور مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی مگر میرے لیے یہ سب ناممکن تھا۔ اگلے مورچوں سے مجھے اپنے کچھ دوستوں کے ایک پیغام کا شدت سے انتظار تھا۔ دوسرے دن ہی مجھے خوش خبری سنائی گئی کہ سرحد پار وہ ظالم کمانڈر ایک خفیہ آپریشن میں مارا گیا جس نے لاجونتی کے باپو کو وہیں ایک ویران مندر کے تہہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔ لاجونتی کے باپو کو پاکستانی خفیہ مشن کے سپاہیوں نے آزاد کروا کے اس کے گھر واپس بھیج دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہی کہیں روپوش ہو گئے تھے۔

آخر کار وہ جنگ جو کہ ہم پر زبردستی مسلط کی گئی تھی، جلد ہی ختم ہو گئی اور ہم نے وہ سب کچھ جو کہ کئی شہیدوں کے لہو سے حاصل کیا تھا وہ ہمارے کچھ نااہل سیاست دانوں نے مذاکرات کی ٹیبل پر ہار دیا۔ اچانک ٹرالی ایک دھچکے سے رکی تو میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ بالکل ویران علاقہ تھا۔ ٹریفک بھی ابھی کم ہی تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ ہم گرم چادروں میں لپٹے ٹرالی کے نیچے بندھی لوہے کی مضبوط چارپائی پر بڑی مشکل سے لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرالی رکی تو میں نے نیچے سے دیکھا ایک آدمی قریبی کھیتوں میں شاید رفع حاجت کے لیے جا رہا تھا۔ یہ یقیناً اس ٹرالی کا ڈرائیور تھا۔ اچانک اس نے ٹریکٹر پر موجود اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مل قریب ہی ہے ذرا نیچے اتر کر ٹریکٹر ٹرالی کے ٹائر وغیرہ چیک کر لو۔ وہاں جانے کتنی دیر رکنا پڑے۔ جلدی کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

ٹریکٹر پر موجود لڑکے نے کہا۔

”ابھی چیک کر لیتا ہوں استاد۔“ یہ کہتے ہی وہ ٹرالی سے نیچے اترا اور ٹرالی کی طرف بڑھا۔

یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ لازمی بات ہے وہ ٹائر چیک کرتا تو نیچے بھی دیکھتا اور جب ہم اسے نظر آجاتے تو جانے کیا ہوتا، ہمیں چاہیے تھا کہ ہم پہلے ہی چلتی ٹرالی سے نیچے اتر جاتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا مگر خیریت گزری کہ اس نے ٹائر چیک کرتے وقت نیچے زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور بھی کھیتوں سے نکل آیا۔ اس نے جلدی سے ٹریکٹر اسٹارٹ کیا اور اسی دوران ہم جلدی سے ٹرالی کے نیچے سے نکلے اور روڈ پر مخالف سمت چلنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت روڈ سنسان تھا اور کسی نے ہمیں ٹرالی کے نیچے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ٹریکٹر ٹرالی وہاں سے کافی دور نکل گئی تو ہم دونوں کھیتوں میں داخل ہو گئے اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر روڈ کے نزدیک آ گئے۔ اب ہمیں شہر جانے والی کسی گاڑی کا انتظار تھا کیونکہ اب سرحد پر سیکیورٹی کی صورت حال تو کافی خطرناک ہوتی۔ اس لیے میں نے چلتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد کسی اور ذریعے سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

ہماری منزل یہاں سے ممبئی تھی۔ اگر ایک بار ہم وہاں پہنچ جاتے تو وہاں سے کسی لانچ کے ذریعے نکلا جا سکتا تھا۔ مگر ابھی فوری مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ میں روڈ پر کھڑا کسی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ سردیوں کی وجہ سے میں نے چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ لاجونتی مجھ سے تھوڑی دور روڈ کے ساتھ اگے درختوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ صرف اس لیے کیا تھا کہ اگر انڈین فوجی آ بھی جائیں تو انہیں فوری طور پر شک نہ ہو۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ روڈ پر شہر جانے والی سمت میں ایک ٹرک جا رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ شاید یہ قبولیت کا وقت تھا۔ اس نے مجھے لفٹ دے دی۔ ڈرائیور اکیلا ہی تھا۔ ٹرک میں سبزیاں لدی ہوئی تھیں۔ میرے ساتھ لاجونتی کو دیکھ کر ٹرک ڈرائیور ایک دفعہ گھبرایا مگر میں نے اسے ایک دکھ بھری کہانی سنائی اور ایک تگڑی رقم کا لالچ بھی دیا اور آخر کار وہ مان ہی گیا۔ اس نے مطمئن ہوتے ہی لاجونتی سے کہا۔

”میری بہن! اب آپ کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کے دشمنوں کو ایسا چکر دے گا کہ وہ آپ کی گرد کو بھی نہ پا سکے گا۔“

راستے میں کئی دفعہ چیکنگ ہوئی مگر سکھ ڈرائیور نے ہمیں سبزیوں کے درمیان یوں چھپا دیا تھا کہ ہمیں سانس لینے میں بھی کوئی دشواری نہ تھی اور ہم کسی کو نظر بھی نہیں آ سکتے تھے۔ سکھ ڈرائیور نے ہم سے ممبئی پہنچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ وہاں پہنچ کر لاجونتی نے بھی ایک بھاری رقم اس کے حوالے کرنا چاہی۔ مگر اس نے اپنا طے شدہ کرایہ ہی لیا۔ یہاں سے ہم اپنے مطلوبہ بندے کے پاس پہنچ گئے۔ یہ سب اتنا آسان ہرگز نہ تھا مگر یہ سب اس کی دین ہے۔ جب وہ ذات کسی پہ کرم کرتی ہے تو بند دروازے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار ہم ایک ماہ کے بعد ممبئی کے راستے لانچ کے ذریعے پاکستان پہنچ ہی گئے۔ لاجونتی نے یہاں آتے ہی اسلام قبول کر لیا اور مجھ سے نکاح کے بعد تو وہ اتنا خوش ہوئی کہ جیسے صدیوں کے بعد کوئی بچھڑا ہوا اپنوں سے ملے اور خوشی سے پھولا نہ سمائے۔

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

”میں بھاگوں گا نہیں ڈی ایس پی صاحب! اور نہ میں یہ پوچھوں گا کہ مجھے کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ چلیں، میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ......“ میں نے تحمل سے کہا تو وہ غصے اور رعب زدہ لہجے میں بولا۔

”تم بھاگ سکتے بھی نہیں ہو۔ اگر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دکھا دو۔“

اس کا انداز مجھے چیلنج کرنے والا تھا۔ مگر میں نے خود کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سوچ چکا تھا کہ میں نے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کرنی۔

”کہا نا...... گرفتار کر لیں مجھے۔“ میں نے کہا تو اسی غصے بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں کس جرم میں پکڑ کر لے جا رہا ہوں؟“

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور کوئی چاہے تو بکری چوری کا الزام بھی لگا سکتا ہے۔ آپ گرفتار کرنے آئے ہیں تو کر لیں مگر میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میں نے یہ قتل نہیں کیا، محض مجھے پھنسایا جا رہا ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے دھیرے سے اپنا بازو چھڑوایا اور پولیس وین کی جانب بڑھ گیا جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”ہتھکڑی لگاؤ اسے......“ اس نے اونچی آواز میں اپنے کسی ماتحت سے کہا۔ اگلے ہی لمحے ایک کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس نے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ میں اس کے ساتھ پولیس وین میں جا بیٹھا۔ میں نے دیکھا سوہنی گیٹ کی درز سے مجھے دیکھ رہی تھی' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اطمینان رکھنے کو کہا' تب تک وین چل دی' اس کے آگے پیچھے گاڑیوں کا قافلہ یوں چل پڑا جیسے کسی اشتہاری مجرم یا پھر کسی دہشت گرد کو پکڑا جاتا ہے۔

جلد یا بدیر ایسا ہونا ہی تھا۔ میں چاہے لاکھ محتاط رہتا' کوئی ثبوت بھی نہ ہوتا لیکن شاہ زیب نے پھر بھی مجھے گرفتار ضرور کروانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ قتل میرے سوا کوئی اور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ مجھ پر یہ جرم ثابت کر سکتا تھا یا نہیں۔ مجھے اس کے سیاسی اثر و رسوخ اور تعلقات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ چاہے جرم ثابت کر سکتا یا نہیں لیکن قانونی شکنجے میں جکڑ کر مجھے انتہائی کمزور کرنے کی بھرپور کوشش ضرور

کر سکتا تھا۔ لاشعوری طور پر میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر الزام لگائے اور میں اس میں بری ہو جاؤں' پھر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سردار شاہ دین کو میں نے مارا ہے۔ اب یہ شاہ زیب سے اک نئی طرح سے جنگ تھی۔ اس نے مجھے پھانسی گھاٹ لے جانا تھا اور میں نے اسے بچ کر دکھانا تھا۔ اب یہ کیسے ممکن ہو پاتا' اس بارے میں قطعاً نہیں جانتا تھا' ہاں مگر اس جنگ کی شروعات ہو چکی تھی۔ میں اس سے کسی اور طرح کی جنگ لڑنا چاہتا تھا' لیکن اس نے پہل کر دی تھی۔

پولیس گاڑیوں کا قافلہ تیزی سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میں بالکل بھی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اب آگے کیا ہوگا' لیکن لاشعوری طور پر مجھے پریشانی تو لاحق ہو گئی تھی۔ مقدمہ بازی میں نجانے کتنا وقت لگے' فی الحال تو ضمانت کروانے پر ہی سارا زور لگ جانا تھا۔ میں نے تمام تر سوچوں کو جھٹک دیا۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہنا تھا۔

قصبے کے تھانے میں یہ گاڑیوں کا قافلہ آ کر رک گیا۔ میرے اترنے سے پہلے ہی پولیس نفری نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ تاثر یہی تھا کہ جیسے کسی بہت بڑے مجرم کو گھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ مجھ پر نفسیاتی دباؤ ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس میرے بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے۔ اب یہ مجبوری میں تھا یا فرض شناسی کے باعث' میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے اس گھیرے میں ڈی ایس پی کے کمرے میں لے جایا گیا' جو ذرا ہٹ کر تھا۔ وہی ڈی ایس پی جو رات تک ہمارے اور سردار کے درمیان سمجھوتہ کروا رہا تھا اب وہی آفیسر بنا مجھے گھور رہا تھا۔

"دیکھو جمال! کسی بھی قسم کی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کا مطلب اپنی موت کو آپ دعوت دینا ہوگا۔ تم پر سردار شاہ دین کے قتل کا ہی الزام نہیں بلکہ اس کے ڈیرے پر حملہ کرنے' وہاں چھ قتل کرنے کا بھی تم پر الزام ہے' کوشش کریں گے کہ ہم آج ہی تمہیں عدالت میں پیش کریں اور تمہارا ریمانڈ لے لیں۔ مجھے امید ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔"

"ڈی ایس پی صاحب! آپ مجھ پر جتنے چاہے الزام لگا لو' یہ آپ کا اختیار ہے یا پھر آپ کی مجبوری' کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ مجھ پر الزام لگانے والا کون ہے؟ کس نے کہا ہے کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟"

"سردار شاہ زیب نے تمہارے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔ نامزد پرچہ ہے تمہارے خلاف۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب! اب قتل مجھ پر ڈال دیا گیا ہے' پرچہ بھی ہو گیا ہے تو میں بھگتوں گا۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

"بس تمہیں یہی بتانا تھا کہ تم پر کیا الزامات ہیں' تعاون کرو گے تو میں تمہارے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکتا ہوں ورنہ......" یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ورنہ کہنے کے بعد بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔ اس کا مقصد میں سمجھ گیا تھا' وہ محض مجھے نفسیاتی دباؤ اور خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے لے جانے کا اشارہ کیا تو انسپکٹر نے میرا بازو پکڑا اور باہر کی جانب لے جانے لگا۔ انہی لمحات میں پیرزادہ وقاص دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی ماحول کا جائزہ لیا' پھر سیدھا ڈی ایس پی کے پاس جا کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آپ جمال کو گرفتار کر کے لے تو آئے ہیں لیکن جب تک میں اس کی ضمانت نہ کروالوں آپ نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا' یہ نہ ہو کہ آپ اس پر تشدد کریں۔"

"آپ بیٹھیں تو سہی۔" ڈی ایس پی نے انسپکٹر کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے پیرزادہ وقاص سے کہا مگر وہ بیٹھا نہیں' کھڑے کھڑے بولا۔

"نہیں' میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا' بس جمال کا پتہ کرنے آیا تھا' اور یہ تصدیق کرنے آیا تھا کہ اس کی گرفتاری ڈال دی ہے یا نہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا......" ڈی ایس پی نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"مطلب یہ کہ گرفتاری ڈالیں گے تو میں ضمانت کراؤں گا' اگر آپ اس کی گرفتاری ہی نہیں ڈالتے اور رات کو...... یا کسی وقت بھی......" یہ کہتے ہوئے اس نے اشارے سے ختم کرنے کی بات کی۔

"مطلب آپ کا یہ کہنا ہے کہ ہم اسے ماورائے عدالت قتل کر سکتے ہیں؟" اس نے غصے میں کہا۔

"ظاہر ہے ایسا ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ زیب نے ہمدردی کی آڑ میں کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ محض الزام پر آپ نے اسے گرفتار کر لیا' ایسا کیسے ہو گیا؟" پیرزادہ وقاص نے کافی حد تک غصے میں کہا تو ڈی ایس پی نے تحمل سے کہا۔

"اگر آپ یہ ساری باتیں سمجھتے ہیں تو پھر اپنی رسائی بتائیں اور دکھائیں' یہ تو اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں کوئی آپ سے ہمدردی کی بھیک نہیں مانگنے آیا' بس یہی بتانے آیا ہوں کہ ضمانت ہو جانے تک آپ اس پر نہ تشدد کریں اور نہ ہی ذہنی اذیت دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور سیدھا میرے پاس آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "سن جمال! میں ساری بات سمجھ سکتا ہوں' میں نے اپنی کوشش شروع کر دی ہے' انہوں نے ابھی تک تمہاری گرفتاری نہیں ڈالی' اس کا مطلب ہے کہ کہیں نیت میں فتور ہے' شام ہونے تک انہوں نے اگر گرفتاری نہ ڈالی تو پھر جو مجھ سے ہو سکا میں کروں گا' تم حوصلہ رکھنا اور آنکھیں کھلی رکھنا' باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف چل دیا۔ انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی جانب دیکھا اور پھر مجھے لے کر آفس سے نکلتا چلا گیا۔

جس وقت انہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا' اس وقت میرے ذہن میں اتنا کچھ نہیں تھا۔ پیرزادہ وقاص کے آنے تک میرے ذہن میں کہیں کہیں کچھ خدشات تھے' مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ آ کر ڈی ایس پی کے سامنے بات کھول گیا تھا اور مجھے ان کی نیت کا اندازہ ہو گیا۔ تب مجھے اپنی فکر ہی نہیں لاحق ہوئی' بلکہ گاؤں میں موجود اماں اور سوہنی کے بارے میں بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ شاہ زیب جیسا بندہ انتقام میں آ کر کچھ غنڈے میرے گھر پر بھیج دے تو...... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا' میرے اندر غصے کی لہر دوڑنے لگی۔ میں اس معاملے کو جس قدر آسان سمجھ رہا تھا' ویسا نہیں تھا' مجھے پولیس کے شکنجے میں کس کر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا' میں ایک دم سے مضطرب ہو گیا۔

***

اوگی پنڈ میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ جسپال نے حویلی سے فون کر کے جوتی کو بتا دیا تھا کہ وہ بستر وغیرہ کا بندوبست نہ کرے' وہ کافی دیر تک پریال سنگھ کے ساتھ حویلی میں رہا پھر واپس کوٹھی آ گیا۔ وہ مسلسل ہرپریت کو سوچے چلا جا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے بغیر اس گھر میں تھا۔ اب تک اس نے کئی بار انوجیت کو فون کر کے ہرپریت کے بارے

میں پوچھ لیا تھا۔ ہر بار اس نے تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تھا' جو ہنوز پہلے ہی کی طرح تھی۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ بنتا سنگھ اندر آگیا۔

''ہاں کیا بات ہے بنتا سنگھ......؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ جی' باہر پنڈ سے کچھ بندے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کون ہیں؟''

''اوگی پنڈ ہی سے ہیں۔ کوئی دس بارہ بندے ہیں۔'' بنتا سنگھ نے دس بارہ پر زور دیتے ہوئے کہا تو جسپال نے اس کی طرف دیکھا پھر سوچتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو انہیں لان میں بٹھاؤ' میں آتا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ تبھی اس نے انوجیت کو تازہ ترین صورت حال کے بارے میں بتایا کہ پہلے تو کبھی یوں لوگ ملنے کے لیے نہیں آئے تھے۔

''ان سے ملو' دیکھو کون ہیں' اور بات کیا کرتے ہیں۔ پھر مجھے تفصیل سے بتانا' تبھی بات سمجھ میں آئے گی' ممکن ہے یہ بھی بلجیت سنگھ کی کوئی چال ہو۔''

''ٹھیک ہے' میں ان کی بات سن کر ہی تم سے بات کرتا ہوں۔'' جسپال نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ بنتا سنگھ نے پہلے لان میں کرسیاں رکھیں' پھر ان لوگوں کو بلا لایا' جسپال انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مختلف عمر کے لوگ تھے۔ جیسے ہی وہ بیٹھے تو اس نے جوتی کو بلا کر کہا۔

''وہ باہر جو بندے آئے ہیں ان کے لیے کوئی مشروب وغیرہ بھیج دو۔''

''میں سوڈا بھجوا دیتی ہوں۔'' جوتی نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی اور وہ باہر ان لوگوں کے پاس آگیا۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سب کو فتح بلائی اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی ان میں سے ایک ادھیڑ عمر بندے نے اپنا تعارف کرایا۔

''جسپال سنگھ جی' میں اوگی پنڈ میں رہتا ہوں' میں نے آپ کے باپو کو بھی دیکھا ہے' اور میرا اس سے بہت اچھا تعلق رہا ہے۔ میرا نام رام داس ہے اور میں ہندو ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ساتھ آئے لوگوں کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ سکھ تھے' کچھ ہندو' ایک بندہ مسلمان تھا اور دو ان میں شودر تھے جو اب عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور انہوں نے باقاعدہ اپنا چرچ وہاں بنایا ہوا تھا۔ سب لوگوں کا تعارف کرا دینے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہم لوگ آپ سے کیوں ملنے آئے ہیں' یہ سوال آپ کے ذہن میں تو ہوگا؟''

''جی' بالکل۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''جب آپ اوگی میں آئے تو میں سمجھ گیا تھا کہ اب کلوندر سنگھ کی نسل آگے بڑھے گی' اسے بالکل مار نہیں دیا گیا ہے۔ ہم اگر زبان سے کچھ نہ بھی کہیں' پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ آپ کے خاندان کے ساتھ کیا ہوا تھا اور اس کا ذمے دار کون تھا' آج سے نہیں اور نہ سا کا چور اسی کے بعد سے' ہم بہت پہلے ہی سے بلجیت سنگھ اور اس کے خاندان کے مخالف چلے آرہے ہیں۔ وہ کونسا ظلم ہے جو انہوں نے ہم پر نہیں ڈھایا' ہم غریب پہلے اس کے باپ رویندر سنگھ کے ظلم کا شکار ہوتے رہے اب وہ ہم پر مسلط ہے۔ میں سوچتا رہا کہ آپ سے ملوں' آپ کو کچھ اور نہیں تو کم از کم اخلاقی مدد ہی دوں...... لیکن ایسا نہ کر سکا۔''

''اب اتنے دنوں بعد آپ آئے......؟'' جسپال نے پوچھا۔

''پہلے تو ہم نے یہی سوچا کہ آپ کے پاؤں یہ بلجیت لوگ لگنے نہیں دیں گے لیکن آج جب کہ حویلی دوبارہ سے آباد ہو گئی ہے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ ادھر رہیں گے۔ چاہے یہ کچھ مرضی کر لیں۔ اس لیے میں آپ سے ملنے کے لیے آگیا۔'' رام داس نے کسی حد تک جذباتی انداز میں کہا۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ آگئے' میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' جسپال نے جواباً کہا۔

''اس پنڈ کی سیاست بھی کچھ عجیب سی ہے۔ جو کچھ تھوڑا بہت امیر ہے یا اس کے تعلقات ہیں' وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔ میں نے کئی بار پنچائیت کا الیکشن لڑا مگر ہار گیا۔ غریب کی تو یہاں شنوائی ہی نہیں ہے۔ کوئی پرچہ ہو' کوئی الزام ہو' ہم غریبوں پر ہی لگتا ہے۔'' وہ کہتا چلا گیا۔

''کیا کرتے ہیں یہ......؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنی حاکمیت جتانے اور ان پر جبر رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کرتے ہیں۔ کوئی بندہ ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ آپ دیکھیں آپ آئے اور آپ کے آتے ہی انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''یہ تو ہوتا ہے رام داس۔ اگر ظلم سہنے والے نہ ہوں تو ظالم بھی نہ ہوں اور یہ بھی فطری بات ہے کہ آدمی ہمیشہ طاقت کی طرف اپنا جھکاؤ رکھتا ہے۔ پولیس ان کے ساتھ ہے تو کیا ہوا۔ اگر عوامی طاقت متحد ہو جائے تو کوئی ظالم نہ رہے۔'' جسپال نے کہا تو اتنے میں بنتا سنگھ اندر سے سوڈے کی بوتلیں ٹرے میں رکھ کر لے آیا۔ پھر اس نے فرداً فرداً سب کو دیں۔

''بات یہ ہے جسپال جی' لوگ ان کے خلاف متحد تو ہو جائیں' لیکن ان کی پہنچ دہلی تک ہے' پولیس جس کو چاہے اور جب چاہے ذلیل کر دے' اور وہ جو مرضی کر لیں' انہیں کھلی چھوٹ ہے' آپ ہی کے ساتھ جو ہوا' صاف ظاہر ہے کہ اس رات بلجیت کے غنڈوں نے آپ پر حملہ کیا' وہ اسی گاؤں کے یا ساتھ والے گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے تو پولیس کو کیسے نہیں پتہ' مگر انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔''

''اب نہیں کر پائیں گے رام داس' میں اب یہیں حویلی میں ہوں۔ بلجیت سنگھ یا اس کا کوئی غنڈہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی کرتا ہے تو مجھے بتاؤ' ہم دیکھ لیں گے انہیں۔'' جسپال نے انہیں حوصلہ دیا۔

''بس جی' ہمیں کوئی حوصلہ دینے والا ہو' ہمارے سر پر تو ہم بھی اپنی عزت بچا لیں۔'' رام داس نے یوں کہا جیسے وہ جسپال سے یہی بات کہلوانا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا جیسے یہ بھی کوئی بلجیت ہی کی سازش ہو گی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے سوچا' چلو سازش ہی سہی' کچھ ہلچل تو ہے۔ پھر وہاں آئے مختلف لوگ اپنی اپنی کہتے رہے۔ بلجیت سنگھ نے کس طرح وہاں جبر اور خوف کی فضا طاری کی ہوئی ہے۔ اس بارے میں مختلف واقعات سناتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اس نے انوجیت کو ان بندوں کے بارے میں اور ان کی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔ جس پر اس کا یہی تبصرہ تھا کہ وہ واقعتاً سچ کہہ رہے ہیں۔ ہندو کمیونٹی کی وجہ سے بلجیت سنگھ اس رام داس پر کم ہی ہاتھ ڈالتا ہے۔ رام داس فطری طور پر وہاں کی چودھراہٹ چاہتا تھا کیونکہ اوگی پنڈ میں سکھ اور ہندو کمیونٹی تقریباً برابر ہی تھی۔ بلجیت سنگھ اس لیے ان پر حاکم تھا کہ ایک تو ان کا سیاسی طور پر اکالی دل سے تعلق تھا' دوسرا پنجاب میں وہ ویسے ہی ہندوؤں کو دبا کر رکھتے تھے۔ رام داس کی سیاسی وابستگی گھوم پھر کر بی جے پی سے بنتی تھی۔ اگر کانگریس سے ہوتی تو

شاید اس طرح کی صورت حال نہ بنتی۔ انو جیت اور اس کی تنظیم نے کبھی اس لیے انہیں منہ نہیں لگایا تھا کہ وہ ان کی تنظیم کے خلاف تھے۔ اس نے انو جیت سے صورت حال سمجھ لی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

رات کے کھانے پر وہ اکیلا ہی تھا۔ اس نے بھوک مٹانے کے لیے تھوڑا بہت کھایا اور پھر اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی اسے ہرپریت یاد آ گئی۔ آج اگر وہ ساتھ ہوتی تو حویلی میں جشن کا سماں ہوتا۔ اس دن حویلی پھر سے آباد ہو گئی تھی۔ ایک بار اس نے مذاق میں کہا تھا کہ جس دن حویلی دوبارہ آباد ہوئی تو ساری رات وہاں دھما چوکڑی مچائے گی۔ گاؤں کے لوگوں کو مدعو کرے گی' لڑکیاں ناچیں گی' خوب کھانا پینا چلے گا اور یہ ایک یادگار جشن ہوگا لیکن ایسا نہیں ہو پایا تھا' یادگار جشن بنانے والی' اس وقت اپنے حواسوں ہی میں نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ہنستی مسکراتی جوانی سے بھرپور ہرپریت کا ساتھ لمحوں میں چھوٹ گیا تھا۔ اب نجانے وہ کب تک تندرست ہو کر اس کے شانہ بشانہ چل سکے گی۔ اس کے ذہن میں وہ ماضی کے منظر گردش کرنے لگے جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہرپریت کو سوچتا رہا۔ تبھی اچانک اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کیشیو مہرہ کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو اس نے تمہید باندھے بغیر کہا۔

''جسپال! تم اپنے گھر کے پچھواڑے سے یوں نکلو کہ کسی کو پتہ نہ چلے' کیونکہ سامنے کے گیٹ پر اور پھر آگے راستے پر رن ویر سنگھ کے بندے تعینات ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بچتے ہوئے تم فصلوں کے درمیان سے سڑک تک پہنچو۔''

''ٹھیک ہے' اس کے بعد......؟''

''وہاں سڑک پر تمہیں فور وہیل جیپ ملے گی' اس میں صرف ایک ہی بندہ ہوگا' تمہارا نمبر اس کے پاس ہے' وہ تم سے رابطہ کر لے گا۔ آگے کی ساری تفصیلات وہ تمہیں بتا دے گا' فوراً نکلو۔''

''او کے......''

جسپال نے کہا اور فون بند کرتے ہی اس نے تیاری میں پانچ سے سات منٹ لگائے۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا' اس وقت جولی کچن میں تھی اور دوسرے ملازمین میں سے فقط بنتا سنگھ گیٹ پر دکھائی دے رہا تھا۔ جسپال ٹہلنے والے انداز میں کوٹھی کی پچھلی جانب گیا' ٹینس کورٹ اور سوئمنگ پول کے درمیان سے نکلتا ہوا' وہ باؤنڈری وال تک جا پہنچا۔ وہ اس کے قد سے دو فٹ اونچی تھی' اس نے ادھر ادھر دیکھا' ذرا سے فاصلے پر اسے پلاسٹک کا ڈرم دکھائی دیا' اس نے وہ اٹھایا' دیوار کے ساتھ سیدھا کر کے رکھا' پھر اس پر چڑھ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اب دیوار اس کے سینے تک تھی۔ اس نے باہر کا جائزہ لیا تو دوسری طرف خاصی گہرائی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر ایک دم سے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نجانے کچھ دیر بعد صورت حال کیا ہو۔ اگر واپسی بھی اسی طرف سے ہوئی تو یہاں سے چڑھنا مشکل ہوگا اور فوری طور پر کوٹھی کے اندر نہیں آ سکے گا۔ اسے واپسی کا راستہ بنا کر رکھنا چاہیے۔ وہ ڈرم سے نیچے اتر آیا اور پھر اسی تلاش میں اس نے اسٹور کا رخ کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں سے سیڑھی مل جائے گی۔ ذرا سی تلاش کے بعد اسے دیوار کے ساتھ رکھی سیڑھی دکھائی دی' اس نے فوراً ہی وہ

اٹھائی اور دیوار کے ساتھ لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ اسی طرح اس نے دوسری طرف سیڑھی رکھی اور نیچے اتر آیا۔ اس کے آگے فصلیں تھیں۔ اس نے سیڑھی کو دیوار سے ہٹایا اور فصلوں کے درمیان چھپا کر رکھ دیا۔ وہ چند لمحے کھڑے ہو کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا پھر فصلوں کے درمیان بنے کھال میں سے سیدھا چل پڑا۔ اس کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ اس نے اپنا سیل فون ہاتھ میں کر لیا تھا تاکہ جونہی کال آئے تو وہ فون ریسیو کر لے۔ سڑک تک پہنچتے ہوئے اسے تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ وہاں پر جا کر رک گیا۔ اسی لمحے جالندھر سے آنے والے راستے کی طرف سے ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور تیزی سے قریب آتی چلی گئیں۔ ایک فور وہیل جیپ زن سے اس کے پاس سے گزر گئی پھر آگے جا کر اینٹوں والے راستے پر رک گئی۔ وہاں سے اس نے ٹرن لیا اور واپسی کے لیے آہستہ آہستہ چل پڑی' اگلے ہی لمحے اس کا سیل بج اٹھا۔

''ہاں بولو......!'' جسپال نے محتاط انداز میں کہا۔

''میں سڑک پر ہوں آپ کہاں ہیں سر......''

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میں تمہیں دیکھ رہا ہوں' آ جاؤ' میں بھی سڑک پر ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور آگے بڑھ کر سڑک کنارے آ گیا۔ تب تک جیپ بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔ رکتے ہی دروازہ کھلا اور وہ اس میں بیٹھ گیا۔ وہ موٹا سا نوجوان سکھ تھا' جس نے نیلی جینز' ہلکی زرد شرٹ اور سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ جیپ چل پڑی تو اس نے کہا۔

''مجھے آپ سنی کہہ لیں جی' ہم نے یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے' مادھو پور اس کے درمیان میں رہنا ہے' رن ویر سنگھ اس وقت اس گاؤں میں سے نکلا ہے' کہیں بھی اس سے آمنا سامنا ہو سکتا ہے۔''

اس نے کہا تو جسپال کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ جس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی وحشت عود کر آئی۔

''یہ پکا ہے کہ وہ وہاں سے نکل چکا ہے؟''

''جی' وہ نکل چکا ہے' اس نے پی ہوئی ہے' وہ یونیفارم میں نہیں ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے' وہ بھی پولیس والا ہی ہے۔ وہاں وہ ایک شادی پر گیا ہوا تھا۔'' سنی نے تفصیل سے بتایا اور پھر اپنا سارا دھیان سڑک پر لگا دیا۔ اکادکا گاڑیاں اس کے قریب سے گزر کر جا رہی تھیں۔ پھر اس نے جالندھر جانے والا روڈ چھوڑ دیا اور ایک موڑ کے قریب جیپ روک لی۔ پھر اس نے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر سنتا رہا پھر فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک بلاک کر دی۔ اس کے ساتھ ہی بولتا گیا۔

''سر جی......! اب جو سفید رنگ کی ماروتی آ رہی ہے وہ اسی میں ہے' اس کے پیچھے ہمارے بندے ہیں۔''

سنی نے گاڑی کچھ اس طرح روکی تھی جیسے اس میں کچھ خرابی آ گئی ہو' اس نے بونٹ اٹھا دیا تھا۔ جسپال نیچے اتر آیا۔ اس کی نگاہیں مادھو پور کی طرف سے آنے والی ماروتی پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ کب دکھائی دیتی ہے۔ اگلے ہی لمحے کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی۔ سنی نے اونچی آواز میں کہا۔

''وہ آ گیا سر جی' الرٹ......''

یہ سنتے ہی جسپال سڑک کی دوسری جانب چلا گیا۔ اگلے ہی چند لمحوں میں سفید ماروتی تیزی سے آتی ہوئی ایک دم سے آہستہ ہو گئی اور پھر ایک

لمحے میں رک گئی۔ یہ ہونا ہی تھا' سنی نے جیپ کھڑی ہی اس انداز سے کی تھی' اس اثناء میں پیچھے آنے والی کار بھی وہیں آن رکی۔ اس نے رکتے ہی زور زور سے ہارن دینا شروع کردیا۔ بلاشبہ یہ رن ویر پر نفسیاتی وار تھا۔ اچانک رن ویر نے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا اور بھنا کر کہا۔

''بند کرو ہارن...... دیکھتے نہیں ہو روڈ بلاک ہے۔''

اس پر پیچھے والی کار نے پھر ہارن دے دیا۔ وہ شدید غصے میں سنی کے پاس آیا اور چلا کر بولا۔

''تمہیں گاڑی کھڑی کرنے کی تمیز نہیں' یہ کیسے روڈ بلاک کیا ہوا ہے۔''

اتنی دیر میں پچھلی گاڑی سے تین لوگ نکلے اور اس کی طرف آگئے' تبھی جسپال چلتا ہوا رن ویر کے سامنے آگیا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

''جسپال سنگھ آپ یہاں......؟''

''ہاں' میں یہاں۔'' جسپال نے سکون سے جواب دیا۔

''کیسے......؟'' رن ویر نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے۔'' جسپال نے کہا اور پسٹل کا رخ ماروتی میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کی طرف کرکے فائر کردیا۔ یکے بعد دیگرے چار فائر کرنے کے بعد اس نے رن ویر کے چہرے پر دیکھا' جہاں رنگ اڑ گیا تھا۔

''یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو......'' اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور تم نے ہرپریت پر فائر کرکے اچھا کیا تھا۔'' وہ ایک دم غصے میں بولا۔

''اوہ...... تو آخر بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔'' یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ڈیپارٹمنٹ میں معصوم سانپ کے نام سے جانے جاتے ہو۔ اس لیے میں نے چاہا کہ...... تیرے جیسے گھٹیا سانپ کا شکار کروں...... اور پتہ ہے سانپ کو کیسے مارا جاتا ہے' اس پر فائر نہیں کرتے...... اس کا سر کچلتے ہیں۔'' جسپال نے دانت پیستے ہوئے کہا تو وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''جسپال' میں تمہیں صرف ایک موقع دیتا ہوں' آج رات یہاں سے نکل جاؤ' بلکہ کل تک یہ ملک بھی چھوڑ دو' پھر نہ کہنا کہ میں نے تجھے خبردار نہیں کیا...... تم......'' لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جسپال نے پوری قوت سے پسٹل کا دستہ اس کے جبڑے پر دے مارا' ایک لمحے کے لیے رن ویر سنگھ کی آنکھوں میں سے حیرت جھلکی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ لڑنے کے لیے تیار ہوگیا۔ رن ویر نے دائیں ہاتھ سے جسپال کا گلا پکڑنا چاہا مگر اس نے کلائی پکڑلی۔ پھر پسٹل سنی کی جانب اچھالتے ہوئے وہی ہاتھ رن ویر کی گردن پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ اسے دھکیلتا ہوا پیچھے کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا' تبھی جسپال نے دونوں ہاتھوں کا مکا بنایا اور پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ رن ویر چکر اتے ہوئے کولہوں کے بل زمین پر گر گیا۔ جسپال نے زوردار ٹھوکر اس کے منہ پر ماری' اس کے بعد جسپال نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ رن ویر کا چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔ وہ گھگھیانے لگا مگر جسپال نے اسے نہیں چھوڑا' یہاں تک کہ اس پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ ہرپریت کا انتقام اُس کے اندر سے وحشت بن کر ابھرا تھا۔ رن ویر سنگھ ساکت ہوا سڑک پر یوں پڑا تھا کہ ٹانگیں کھلی ہوئی اور بازو پھیلے ہوئے تھے۔

''جلدی کریں سر جی' کوئی بھی گاڑی آسکتی ہے۔'' سنی نے اونچی آواز میں کہا تو جسپال چونک گیا۔ اس نے پسٹل کے لیے ہاتھ بڑھایا' سنی نے دے دیا۔ جسپال نے رن ویر کے کاندھے پر رکھ کر ایک گولی چلائی' رن ویر تڑپ اٹھا۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکل گئی۔

''ہرپریت کے یہیں گولیاں لگی ہیں۔ پتہ چلا...... کتنا درد محسوس ہوتا ہے۔''

''جسپال...... مجھ...... مجھے...... چھو...... چھو...... چھوڑ دو......'' رن ویر نے انتہائی مشکل سے کہا۔

''نہیں رن ویر...... میں اپنے دشمن کو تو معاف کرسکتا ہوں' کسی منافق کو نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پسٹل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی پھر اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں میں تجھے گولی نہیں ماروں گا۔'' یہ کہتے وہ تیزی سے اٹھا' اس کے پیروں کی طرف سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سڑک کے ایک طرف لے گیا پھر اس کو ایک درخت کے پاس لے جاکر اس کا سر جنونی انداز میں درخت کے تنے سے ٹکرانے لگا۔ خون کے چھینٹے اڑنے لگے' اور پھر تڑخ کی آواز کے ساتھ اس کا سر پھٹ گیا۔ جسپال نے زوردار ٹھوکر اس کی گردن پر ماری تو ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ رن ویر کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ تبھی جسپال واپس پلٹا' سنی جیپ واپس موڑ چکا تھا۔ بعد میں آنے والے تماشہ دیکھتے رہے تھے۔ وہ بھی اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ جیسے ہی جسپال جیپ میں بیٹھا' سنی نے جیپ چلادی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے انتہائی رفتار کردی۔ جسپال خود پر قابو پا رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ جیپ کس قدر تیزی سے جارہی ہے۔ وہ جالندھر اور نکودر روڈ پر چڑھ چکے تھے۔

جس وقت سنی نے فون پر کام ہوجانے کے بارے میں بتایا' تبھی جسپال نے پوچھا۔

''سنی...... اب تم نے کدھر جانا ہے؟''

''میں واپس جالندھر جاؤں گا۔ میں بھی اسی شادی میں آیا ہوا تھا۔''

''اوکے......!'' اس نے کہا اور خاموش ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہی مقام آگیا' جہاں سے جسپال جیپ میں بیٹھا تھا' وہ وہاں اتر گیا۔ سنی نے جیپ موڑی اور جالندھر کی جانب چل دیا۔ جسپال کو دور کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ کوٹھی کی پچھلی دیوار کے ساتھ جا پہنچا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر سیڑھی تلاش کرکے دیوار کے ساتھ لگائی اور اسی طرح اندر چلا گیا۔ اس نے سیڑھی اٹھا کر اسٹور میں رکھی' اب گھر کے اندر جانے کا مسئلہ تھا۔ ممکن ہے جوتی نے اندر سے دروازے بند کرلیے ہوں' وہ گھوم کر صدر دروازے کی طرف گیا۔ وہ کھلا تھا' وہ اندر داخل ہوگیا۔ کچن میں روشنی تھی' وہ نگاہیں بچا کر اوپری منزل کی جانب بڑھ گیا۔

وہ نہا کر اور کپڑے تبدیل کرکے باہر آگیا۔ خون آلود کپڑے اس نے پانی میں بھگو دیئے تھے۔ وہ پرسکون سے انداز میں اپنے بیڈ پر آکر لیٹا تو اسے لگا جیسے ہرپریت کا اُدھار چکانے کے بعد وہ ایک انجانے بوجھ سے آزاد ہوگیا ہے۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کردیا۔ جسمیندر سنگھ توقع کے مطابق آن لائن تھا۔ اس نے خود ہی مبارک باد کا پیغام بھیج دیا۔ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جو

اشاروں کنائیوں میں ہی تھیں۔ پھر اس کے بعد وہ آف لائن ہوگیا۔ اس نے بھی لیپ ٹاپ بند کیا' لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

....

سہ پہر ہی سے میں حوالات میں بند تھا۔ میرے ساتھ چند دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے وقت کٹ جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اس وقت رات گہری ہوگئی تھی لیکن ابھی تک انہوں نے کھانا نہیں دیا تھا۔ میں بھوک سے نڈھال ہوچکا تھا' حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ سوائے پیرزادہ وقاص کے ابھی تک نورنگر سے کوئی بندہ نہیں آیا تھا۔ کسی نے بھی خیر خبر نہیں لی تھی۔ نجانے کیوں میرے دماغ میں الجھن بڑھنے لگی تھی۔ کوئی دوسرا میرے پیچھے آتا یا نہ آتا' چھاکے نے ضرور آنا تھا۔ اس سے کچھ ہوسکتا یا نہیں مگر اس نے مجھ سے آکر یہ ضرور پوچھنا تھا کہ وہ کیا کرسکتا ہے۔ مگر وہ بھی نہیں آیا تھا۔

سچا انسان کبھی بھی سامنے سے مار نہیں کھاتا اور نہ ہی اسے سازشی اور منافق شکست دے سکتے ہیں۔ سچا انسان اس وقت شکست سے دوچار ہوکر مار کھاتا ہے جب اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا جائے۔ ظاہر ہے پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر سچا انسان اعتماد کرچکا ہوتا ہے۔ وہ بڑا زہریلا' گھناؤنا اور پرلے درجے کا گھٹیا انسان ہوتا ہے جو یہ ثابت نہ ہونے دے وہ کوئی سازش کررہا ہے یا اعتماد جیتنے کے لیے منافقت کی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ اصل میں وہ منافقت ہی کیا جس کے بارے میں پتہ چل جائے۔ بہرحال کچھ بھی ہے منافق...... راندہ درگاہ ہے۔

گہری رات کے سناٹے میں پورا تھانہ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سبھی سورہے ہیں۔ ہر طرف سناٹا تھا' میرے ساتھ حوالات میں بند لوگ سو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کوئی اپنا سر کھجاتا' یا پنڈلی کھجالیتا' اس کے بعد خراٹے تھے جو کم از کم وہاں زندگی کا احساس دے رہے تھے۔ میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں سلاخوں کے ساتھ بیٹھا باہر کا منظر دیکھتے ہوئے اُکتا چکا تھا۔ مجھے ایک طرف جہاں یہ الجھن تھی کہ چھاکا میرے پیچھے نہیں آیا تھا' دوسری جانب مجھے یہ پریشانی بھی تھی کہ تھانے میں لاکر مجھے اب تک پوچھا ہی نہیں گیا تھا۔ بقول پیرزادہ وقاص انہوں نے میری گرفتاری نہیں ڈالی تھی۔ وہ اپنی طرف سے کوشش کرکے گرفتاری ڈلوا کر ضمانت کے لیے کوشش کررہا تھا۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ صورت حال وہ نہیں تھی جو مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس خاموشی کے اندر کوئی طوفان آنے والا ہے۔

قصبے کی مسجد میں لگے گھڑیال سے بارہ بجنے کا احساس ہوا تو میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں وہاں سے اٹھ کر لیٹنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کررہا تھا کہ مجھے باہر سے سرگوشی سنائی دی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو وہ سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل تھا' جو کئی بار مجھے مل چکا تھا۔ میں تیزی سے سلاخوں کے پاس آیا تو کچھ فاصلے پر دکھائی دینے والا سنتری اپنی ڈیوٹی پر نہیں تھا۔

"تم......؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وقت بہت کم ہے...... سنتری واش روم گیا ہے۔ میں اندر سے اپنا کام ختم کرکے اپنے کوارٹر کی طرف جارہا ہوں' میں نے دیر اس لیے کی ہے کہ تمہیں پیغام دے دوں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"پیغام...... کس کا پیغام...... اور کیا؟" میں نے پوچھا۔

"رندھاوا صاحب کا پیغام ہے' انہوں نے یہ ساری کارروائی دیکھنے کو میری ذمہ داری لگائی ہے۔ خیر چھوڑ' پیرزادہ وقاص تیرے ساتھ منافقت کررہا ہے۔ وہ ڈی ایس پی صاحب کے سامنے خواہ مخواہ شور مچا کے چلا گیا ہے' نرا ڈرامہ کررہا ہے وہ...... اب تک کاغذات میں نہ تمہاری گرفتاری ڈالی ہے اور نہ ہی شاہ دین قتل کیس میں جو ایف آئی آر درج ہوئی ہے اس میں کہیں بھی تمہارا نام نہیں ہے' نامعلوم افراد کے بارے میں ہے وہ......" اس نے آہستگی سے مجھے معلومات دیں۔

"تو پھر...... کیا کرنا چاہ رہے ہیں یہ......" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ایسا اسی وقت ہوتا ہے میری جان' جب ماورائے عدالت ہی بندے کو پار کرنا ہو۔ میں نے رندھاوا صاحب کا پیغام تم تک پہنچا دیا' اب تم اپنا دھیان کرلو۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"مطلب پیرزادہ اور شاہ زیب آپس میں مل گئے ہیں۔" میں نے اپنے طور پر کہا تو کاندھے اچکا کر بولا۔

"مجھے تھانے سے باہر کا علم نہیں کہ وہاں کیا ہورہا ہے' میں تو شام سے تھانے کے اندر ہوں' صرف یہی دیکھنے کے لیے کہ تمہاری گرفتاری ڈالی گئی ہے یا نہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام' میں جارہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ یوں بن گیا جیسے میرے لیے اجنبی ہو۔ پھر بڑے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم بھی سوجاؤ' اب تمہارے لیے تھانے میں کوئی بستر تو لاکر نہیں دے گا' نہیں سوئے گا تو خود بخود دو چار راتوں کے بعد عادت پڑ جائے گی۔"

اس کے عقب میں سنتری آ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بات کیوں بدل دی ہے۔

"تم لوگ اتنے وحشی ہو' کھانے تک کا نہیں پوچھتے' پیسے میں دیتا ہوں' باہر سے کچھ منگوا دو۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"باہر اس وقت تیرا باپ بیٹھا ہے ہوٹل کھول کے۔ شام کے وقت کہتا کسی کو تو وہ لا دیتا۔ اب صبح ہونے کا انتظار کر...... سوجا وہاں ایک کونے میں لگ کے۔"

تبھی سنتری نے کہا۔

"او باؤ جی' آپ جاؤ' آرام کرو جاکر' ان حوالاتیوں سے بات کرلو تو پھر ان کی بک بک ہی بند نہیں ہوتی۔"

اس نے مجھے دیکھا اور پھر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ مجھے بھوک کا احساس کچھ زیادہ ہی ستانے لگا تھا۔ لیکن جیسے ہی مجھے پیرزادے کی منافقت کا خیال آیا تو میں سب کچھ بھول کر اس بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یہ یقین تو تھا کہ جلد یا بدیر ان دونوں کی آپس میں صلح ہوجانے والی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوئی ہی نہ تھی۔ صرف ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے یہ سارا ڈرامہ کررہے ہوں۔ بہرحال کچھ بھی تھا' یہ معلومات مل جانا کہ میری گرفتاری نہیں ڈالی گئی ہے' میرے لیے انتہائی تشویش کی بات تھی۔ وہ مجھے کسی بھی وقت یہاں حوالات سے نکال کر مار سکتے تھے۔ میری وہ رات اس ادھیڑبن میں گزر گئی۔ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اگر انہوں نے مجھے قتل ہی کرنا تھا تو یہاں حوالات میں بند کرنے کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی' وہ مجھے وہیں راستے میں آسانی کے ساتھ مار سکتے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا' آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ یہ تو مجھے احساس ہوگیا تھا کہ انہوں نے اپنے تعلقات استعمال کرکے

مجھے یہاں حوالات میں بند کروادیا تھا۔ بات اب نچلی سطح تک محدود نہیں رہی تھی۔ سردار شاہ دین کے جہاں سیاسی تعلقات لامحدود تھے وہاں وہ ایم این اے بھی تھا۔ اس قتل کی تفتیش تو بڑے پیمانے پر ہونا تھی۔

صبح کی روشنی جب پھیلنے لگی تو میں اپنے طور پر رائے قائم کرچکا تھا کہ ان کی قاتل تک رسائی ہو یا نہ ہو' قاتل کون ہوسکتا ہے' اس بارے میں انہیں یقین ہو یا نہ ہو لیکن وہ یہ طے کرچکے تھے کہ مجھے ہر حال میں ختم کرنا ہے' اب اس کا طریقہ واردات کیا ہوگا' یہ وہی جانتے تھے۔

تھانے میں تھوڑی بہت ہلچل ہوچکی تھی۔ رات والا سنتری تبدیل ہوچکا تھا۔ میرے ساتھی حوالاتیوں کے کچھ ملنے والے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے کچھ نہیں کھایا' ایک نوجوان حوالاتی نے مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیا۔ میں نے اس کے تعلق دار کو چند نوٹ دیئے کہ وہ باہر سے چائے لے آئے۔ وہ چلا گیا مگر ابھی واپس نہیں پلٹا تھا کہ تھانے میں حوالاتیوں کی گاڑی آگئی۔ تھانے کے دروازے بند کردیئے گئے۔ سنتری نے حوالات کا دروازہ کھولا اور ہم سب کو باہر نکلنے کے لیے کہا۔ صرف دو لوگوں کو وہیں رہنے دیا' باقی سب کو ہانک کر گاڑی میں بٹھادیا گیا۔ ہمیں قصبے سے شہر کی عدالت میں لے کر جانا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی چل دی۔ میرے ذہن میں یہ الجھن بڑھنے لگی کہ جب میری گرفتاری نہیں ڈالی گئی تو مجھے جج کے سامنے پیش کیسے کیا جائے گا' اگر وہ گرفتاری ڈال چکے ہیں تو پھر رندھاوے کا پیغام کیا تھا؟ یہ سب کیا ہے مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوتی چلی جارہی تھی۔ تبھی میں نے ایک دم سے الجھن اپنے ذہن سے جھٹک دی۔ اب جو ہوکر ہی رہنا تھا۔

قیدیوں کی گاڑی قصبے سے باہر نکل آئی تھی... حوالاتی تھے جنہیں جج کے سامنے پیش کرنے کے لیے عدالت میں لے جایا جارہا تھا۔ وہ سب سوچوں میں گم تھے۔ میں اپنے ذہن سے جھٹک چکا تھا' گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی آگے چلی جارہی تھی۔ اچانک ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ تیزی سے پچھلا دروازہ کھولا گیا اور ایک سپاہی آتے ہی میری طرف دیکھ کر بولا۔

"چل باہر آ......"

"اگر نہ آؤں تو......" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا' تبھی انسپکٹر کا چہرہ نمودار ہوا' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ہم تجھے نیچے اتار لیں گے...... شرافت اسی میں ہے کہ تم خود اپنے پیروں پر چل کر آجاؤ۔"

میں نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر نیچے آگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے مار کر کہیں پھینک دیں گے۔ تو پھر کیوں نہ لڑ کر مرا جائے۔ تبھی میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو' صاف بتاؤ۔"

"ادھر دیکھو" اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر فصلوں کے درمیان کچا راستہ جارہا تھا' وہاں ایک فور وہیل جیپ کھڑی تھی جس کے باہر پیرزادہ وقاص دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ تھا۔ "جاؤ' چلے جاؤ... جانے اور تم۔"

میرے سامنے ایک مزید سوالیہ نشان لگ گیا... کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے مجھ میں......؟ اس وقت عافیت اسی میں تھی کہ پولیس کے نرغے سے نکل کر پیرزادہ وقاص کے ساتھ چل دوں۔ وہ کیوں دلچسپی رکھتا ہے' یہ تھوڑی دیر بعد کھل جانے والا تھا۔ میں اس کی طرف چل پڑا تو پولیس والے قیدیوں کی گاڑی سمیت چل دیئے۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بڑی گرمجوشی سے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔

"جمال! ایک نئی زندگی مبارک ہو۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نئی زندگی' میں سمجھا نہیں۔"

"آؤ' میرے ساتھ' سکون سے چل کر بیٹھتے ہیں' پھر بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر آیا تو اس نے جیپ بڑھادی۔ اس کا رخ قصبے کی طرف تھا۔ پہلی بار میں نے پیرزادہ وقاص کو اکیلے دیکھا تھا' ورنہ ہمیشہ اس کے ساتھ گارڈ ہوتے تھے۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تو آسانی سے بھاگ سکتا تھا' لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ قصبے کی طرف چل پڑا تھا۔ میں خاموش رہا اور اس کے بات کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی توجہ سڑک پر تھی اور وہ بڑی تیز رفتاری سے جیپ بڑھائے چلا جارہا تھا۔ وہ قصبے سے پہلے ہی دائیں جانب ایک کچی سڑک پر مڑ گیا۔ جبکہ ہمارا گاؤں نورنگر قصبہ پار کرکے تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ نہ تو اپنے گاؤں میران شاہ جانا چاہتا ہے اور نہ ہی نورنگر' وہ کوئی تیسری اور نئی جگہ تھی۔ تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جنگل شروع ہوگیا۔ میں پہلے وہ علاقہ دیکھ چکا تھا' مگر یہ بات برسوں پہلے کی تھی۔ جب ہم شکار کے شوق میں ادھر آتے تھے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ جنگل کے پار دریائی علاقہ شروع ہوجاتا ہے' جنگل تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تھا' مگر جنگل کے سامنے سے آدھا کلومیٹر پکی سڑک جاتی تھی' جہاں گاؤں اور بستیاں آباد تھیں۔ ہم جنگل کے سامنے سے گزر گئے' وہ پھر بھی خاموش رہا۔ یہاں تک کہ پھر دائیں جانب ایک تنگ سی کچی سڑک پر آگیا جو ایک ڈیرے پر جاکر ختم ہوئی۔ وہ حویلی نما ڈیرہ کچی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ گاڑی لیے حویلی نما ڈیرے کے اندر ہی چلا گیا۔ جیپ رکتے ہی کئی سارے لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے تپاک اور عاجزانہ انداز میں پیرزادہ کو سلام کیا۔ اس طرح وہ مجھ سے ملے کچھ دیر بعد انہوں نے ہمارے لیے ایک کمرہ کھول دیا' جس میں جدید طرز کے بیڈ اور دیگر سامان تھا۔ ہلکی ہلکی گرمی ہورہی تھی' ایک ملازم نے اے سی چلادیا' تبھی پیرزادہ جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

"جمال......! نہالو اور فریش ہوجاؤ' اتنے میں کھانا آجاتا ہے' وہ کھا کر باتیں کرتے ہیں۔" پھر ملازم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "جمال کے لیے کپڑے لے آؤ۔"

یہ سنتے ہی وہ واپس مڑ گیا۔ پیرزادہ وقاص بیڈ پر لیٹ گیا' میں باتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم کھانے سے فراغت کے بعد چائے پی رہے تھے۔ تب اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"جمال! تجھے پولیس کے ہاتھوں مروانے کا پلان شاہ زیب ہی کا ہے۔ اس نے ڈی ایس پی کو مجبور کردیا کہ وہ تجھے ماورائے عدالت ہی قتل کرے۔ ڈی ایس پی نے واقعتاً تمہاری گرفتاری نہیں ڈالی' جس وقت وہ تجھے گرفتار کرنے گیا تھا' اس نے تبھی میرے

ساتھ بات کر لی تھی۔ میں جو وہاں پہنچا‘ چیخا‘ چلایا‘ وہ سب ڈرامہ تھا۔ شام تک ڈی ایس پی نے شاہ زیب کو باور کرا دیا کہ وہ مجبور ہو گیا ہے‘ اب کیا کرے؟“

”کیا کہا پھر شاہ زیب نے......؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”اس نے تمہیں رات ہی کو مار دینے کے لیے حکم دے دیا تھا۔ اور شاید ڈی ایس پی رات ہی تجھے حوالات سے نکال کر مار دیتا‘ اگر شاہ زیب ایک دوسری طرح کی خباثت نہ دکھاتا۔“

”وہ کیا......؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اس نے پلان یہ دیا کہ جمال کو راستے ہی میں کہیں مار کر واپس گھر لایا جائے‘ یعنی نور نگر اور وہیں پولیس مقابلے کا ڈرامہ کیا جائے‘ مطلب پولیس جمال کو گرفتار کرنے آئی مزاحمت میں وہ مارا گیا۔ اور......“

”اور...... تمہارے گھر کو آگ لگ گئی۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”میرے گھر کو آگ لگ گئی؟“ میں نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں جمال! وہ تیرے گھر کو آگ لگا کر تیری ماں اور سوہنی کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا۔ مگر شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔“

”یار وقاص......! تم صاف لفظوں میں بتاؤ۔“ میں نے اکتائے ہوئے کہا۔

”صاف لفظوں میں بات یہ ہے جمال! اس نے تمہارے قتل کا انتظار ہی نہیں کیا اور رات تمہارے گھر کو آگ لگوا دی ہے۔“

”کیا......؟“ میں تڑپ اٹھا۔ میری نگاہوں میں میری ماں گھوم گئی۔

”لیکن...... لیکن...... پوری بات سنو...... مجھے جب ڈی ایس پی نے بتایا کہ شاہ زیب کیا چا[ہتا ہے] تو میں نے فوراً تمہارے دوست چھاکے کو [اطلاع] کروا دی۔ جس وقت شاہ زیب کے بندے [آگ] جلانے کے لیے پہنچے‘ اس وقت تک وہ وہاں [سے جا] چکے تھے۔ کہاں گئے‘ اس کا مجھے نہیں علم [......] نے ڈی ایس پی کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ [......] کہے...... بلکہ جس طرح تمہیں لے کر آیا [اسی] طرح اسے واپسی کا کہہ دیا...... اس نے اپنا [......] کیا اور تجھے میرے حوالے کر دیا۔“

”اماں اور سوہنی کے بارے میں کچھ [پتا] چلا‘ چھاکا کدھر ہے۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”باوجود کوشش کے میران سے رابطہ نہیں [ہو سکا] تمہیں ملنے سے پہلے تک میں نے ان کے بار[ے] میں کسی بھی اطلاع کا انتظار کیا‘ ادھر تمہاری طرف آنا تھا۔ اس سے زیادہ میران شاہ نہیں رک سکا [...] ہے آج کل میں پتہ چل جائے۔“ پیرزادہ وقاص [نے] معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو میں بے چین ہو گیا۔

”وہ سب کیسے ہو گیا...... میرے دوست [......] وہاں...... چھاکا جان دے دیتا‘ پر...... ہو سکتا [ہے] بھی...... پیرزادہ وقاص‘ یار مجھے ایک بار نور نگر [لے] چل۔ پھر میں دیکھ لیتا ہوں سب کو......“

”میں تجھے لے جانے کو ابھی لے جاتا ہوں [......] نہیں جانتا‘ انہوں نے بلوائیوں کی طرح تیرے [گھر] پر حملہ کیا ہے‘ اب کچھ نہیں وہاں پر...... اس نے [......] کی طرح اپنے بندے تیرے پیچھے چھوڑ دیئے [ہیں] اسے شاید تم نہیں‘ سوہنی درکار ہے‘ جو اس کی جائیداد [میں] حصہ دار بن گئی ہے۔“

”تو کیا تم جانتے ہو......“ میں نے حیرت [سے] پوچھا۔

”یہ جو ڈی ایس پی ہے نا‘ یہ اپنا بندہ ہے‘ نجانے کتنی کوشش سے یہاں لگوایا ہے اسے‘ اس نے جب مجھے بتایا تو مجھے تیری اور شاہ زیب کی دشمنی کے بارے میں اندازہ ہوا۔ خیر...... اگر مجھے سوہنی کے بارے میں معلوم ہو جاتا تو میں پوری جان سے اس کا تحفظ کرتا۔“

”میں تلاش کر لوں گا اسے...... میری ماں...... چھاکا......“ میں روہانسا ہو گیا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے جمال‘ یہ لوگ کسی محفوظ جگہ ہوں گے‘ کیونکہ اس حملے سے کچھ دیر پہلے چھاکے تک اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اب اگر قسمت نے ساتھ نہ دیا ہو تو الگ بات ہے۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

”وہی تو میں کہہ رہا ہوں‘ میں نور نگر جاتا ہوں‘ وہاں جا کر ساری بات معلوم ہو جائے گی۔ اور پھر شاہ زیب نے اتنا بڑا ادھار میرے سر چڑھا دیا ہے‘ اسے بھی تو اتارنا ہے۔“

”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا جمال کہ تم نے سردار شاہ دین کو قتل کیا ہے یا نہیں‘ لیکن اب تیری ان کے ساتھ لڑائی بن چکی ہے‘ کیا اب تو ان کے خلاف میرا ساتھ نہیں دے گا۔“ پیرزادہ وقاص نے وہ بات کہہ دی‘ جس کے لیے اس نے میری مدد کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تک اس نے اپنے مطلب کی بات کیوں نہیں کی ہے‘ میں نے ایک لمحہ تاخیر کیے بنا کہا۔

”پیرزادہ...... اگر تم یہ کہو کہ میں اب پھنس گیا ہوں اور تم مجھے اس مشکل سے نکال رہے ہو‘ اس کے عوض تمہارا ساتھ دوں تو میرا انکار ہے‘ لیکن اگر دشمن کا دشمن سمجھ کر میرا ساتھ مانگو تو میں تیار ہوں۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ تم جاگیرداروں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کب ایک دوسرے سے صلح کر کے درمیان کے لوگوں کو مسل دو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔

”جمال......! سیدھی سی بات ہے‘ اگر اس علاقے پر میری حکمرانی ہو جاتی ہے تو مجھے اور کیا چاہیے‘ میں سردار شاہ دین کی سوچ اور سیاست کو نہیں پا سکتا تھا۔ مگر شاہ زیب کو تو نیچا دکھا سکتا ہوں‘ صاف اور سچی بات یہ ہے کہ تم اپنا انتقام لینا‘ میں پوری مدد دوں گا۔ میں اب شاہ زیب کو اپنا ہم پلہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں‘ میری سیاست کچھ بھی رہے‘ لیکن تمہارے آڑے کبھی نہیں آؤں گا۔“

”مطلب‘ تم میرے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے نہیں ہو گے۔ میرے حلیف کے طور پر سامنے بھی نہیں آؤ گے۔“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔

”یونہی سمجھ لو‘ اس کی ایک وجہ ہے‘ جسے تم بخوبی جان سکتے ہو‘ کچھ جگہیں‘ کچھ تعلقات کے دائرے اور کچھ مفادات کے مرکز ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ مجبور ہو جاتا ہے‘ وہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ میں جمال کو نہیں روک سکتا کہ میرا اس پر کوئی حق نہیں‘ تم سمجھ سکتے ہو نا میری بات......“

”ٹھیک ہے‘ میں نے مان لی تیری بات‘ اب چل نور نگر۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہم ابھی چلتے ہیں لیکن یہ ذہن میں رکھنا‘ اس نے اپنے باپ کے قتل میں تیری گرفتاری ضرور ڈلوانی ہے۔ وہ چاہے گا کہ تو پولیس ہی کے ساتھ ٹکرا کر ختم ہو جائے۔“ پیرزادہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ ساری بعد کی باتیں ہیں‘ تو پہلے مجھے نور نگر پہنچا‘ پھر سب دیکھ لوں گا۔“ میں نے کہا اور جوتے

پہن کر اٹھ گیا۔

ہمارے درمیان جو طے پانا تھا' وہ پا گیا تھا۔ دوپہر سر پر تھی۔ وہ باہر سے کچا ڈیرہ، اندر سے جدید طرز پر سجا ہوا' مجھے اچھا لگا تھا۔ میں اس علاقے میں بہت پہلے پھرتا رہا تھا' لیکن یہ حویلی نما ڈیرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' صحن میں آ کر میں نے پوچھا۔

''یہ ڈیرہ کس کا ہے؟''

''چوہدری شاہ نواز کا۔'' اس نے بتایا تو وہ گرانڈیل قد کا شخص میرے ذہن میں آ گیا۔

''یار وہ تو قصبے میں......''

''یہ اس کا وہ ڈیرہ ہے جہاں خاص لوگ ہی آ کر ٹھہرتے ہیں۔ باقی تم سمجھ دار ہو۔'' اس نے گول مول سی بات کی تو میں نے بھی زیادہ تجسس دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ویسے بھی اس وقت میرے دماغ میں صرف اور صرف نور نگر چھایا ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں جلد از جلد وہاں پہنچ جاؤں۔

جس وقت ہم جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے چلے تو میرے اندر بے شمار وسوسے ابھرنے لگے۔ میری اماں کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ وہی ایک گھر جس میں میری ماں نے جوانی بیوگی کی حالت میں گزار دی تھی۔ جسے کبھی وہاں خطرہ نہیں رہا تھا اور نہ کبھی اس نے مجھ پر خوف مسلط ہونے دیا تھا' وہی گھر جلا دیا گیا تھا۔ میرے اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی' وہی آگ جس نے میرے گھر کو جلایا تھا' سوہنی کا ساتھ اگرچہ چند دنوں کا تھا' لیکن انہی چند دنوں میں اس نے میرے انتظار کی طوالت کو ختم کر کے میری فتح کو قریب کر دیا تھا۔ میں جو ایک طویل سفر طے کرنے کی سوچ رہا تھا' وہ اس نے مختصر کر دیا' اور چھاکا...... میرے بچپن کا دوست ہی نہیں' میرے بھائیوں جیسا مخلص ساتھی تھا' جس کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا' میری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر ہٹتی تو دوسری آ جاتی' جیپ جس طرح تیز رفتاری سے بڑھتی چلی جا رہی تھی' اس سے کئی گنا رفتار سے میرا خون کھول رہا تھا۔ صورت حال کیا تھی' میں اس سے ناواقف تھا' دل نہیں مان رہا تھا کہ انہیں کچھ ہوگا' لیکن ذہن شاہ زیب کی خباثت سے انکار نہیں کر رہا تھا۔ اس نے جو اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا' اب اس کا خمیازہ بھگتنا تھا' شاہ زیب نے۔ میں نے خود کو پرسکون کرنے کے لئے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔

...... ❁ ......

جسپال کی آنکھ کھلی تو دوپہر ہونے والی تھی۔ کسی نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا' وہ بند تھا' اس نے سیل فون آن کر دیا' اور پھر فریش ہو کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ سیل فون اور لیپ ٹاپ بھی اٹھا لایا تھا۔ جوتی اس کے لیے لسی لے آئی جسے پیتے ہی اس نے کہا۔

''جوتی......! میرے لیے چاہے کھانا لگا دو یا ناشتہ میں نے جالندھر جانا ہے ہرپریت کا پتہ کرنے۔''

''وہ تو ٹھیک لیکن انوجیت بائی جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ نہ آ جائیں' آپ کو کہیں نہ جانے دیا جائے۔ انہوں نے دو تین گھنٹے پہلے فون کیا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے' میں بات کر لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور لیپ ٹاپ کھول لیا' تاکہ رن ویر کے بارے میں کوئی خبر دیکھ سکے۔ پنجابی گرومکھی تو اسے پڑھنی نہیں آتی تھی' اس لیے انگلش اخبار ہی دیکھتا رہا' آخر ایک اخبار میں اسے دو کالمی خبر مل گئی۔ جس کی تفصیلات میں یہی درج تھا کہ دہشت گردوں نے پولیس انسپکٹر رن ویر سنگھ کو قتل کر دیا۔ وہ کئی دنوں سے

دھمکیاں دے رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ وہ گول مول سی خبر تھی' جس سے کسی کے بارے میں اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ خبر پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر سوچتا رہا' ممکن ہے اس سے گیشیو مہرہ نے رابطہ کیا ہو اور اس کا فون بند ملا ہو' وہ خود اس سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا' وہ حد درجہ محتاط ہو گیا تھا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ خفیہ والے اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعید نہیں تھا کہ فون بھی کہیں ٹریس ہو رہا ہو' اگرچہ سیل فون کے معاملے میں ذرا مشکل تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضہ یہی تھا۔ شاید انوجیت اسی مقصد کے لیے جالندھر سے آ رہا ہو' اس نے انوجیت کے نمبر ملا دیئے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے بتایا۔

''یار میں راستے میں ہوں' بیس منٹ تک پہنچ جاؤں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے آ جاؤ تو پھر اکٹھے حویلی چلیں گے۔'' جسپال نے کہا۔

''نہیں' میرے پاس حویلی جانے کے لیے وقت نہیں ہوگا' بس میں آ رہا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ جسپال کے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ سو وہ ناشتہ کر چکا تھا جب گھر کے سامنے گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی بنتا سنگھ نے گیٹ کھول دیا۔ پہلے انوجیت کی گاڑی اندر آئی اور پھر ایمبولینس اس کے پیچھے پیچھے آ گئی۔ جسپال کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ہرپریت......؟ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا' وہ تیزی سے پورچ میں آ گیا۔ انوجیت تیزی سے اپنی گاڑی میں سے نکلا' تب تک ایمبولینس میں سے پھوپھو کلجیت کور نکلیں' ڈرائیور نے عقبی دروازہ کھولا اور پھر دونوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسٹریچر اتارا۔

جسپال کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ تبھی انوجیت نے سہارا دے کر ہرپریت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا تو جسپال کی سانس میں سانس آئی۔ وہ تیزی سے بولا۔

''او یار......! اس کا کتنا وزن ہوگا۔ ہاتھوں پر اٹھا لو۔''

''چل پتر......! آ جا' اور اٹھا کر لے جا اسے اندر۔'' کلجیت کور نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہرپریت نے جسپال کی طرف ایک زخمی مسکراہٹ سے دیکھا جسپال آگے بڑھا اور ہرپریت کو بڑے آرام سے اٹھا لیا' پھر اس کے کمرے تک لے جا کر بڑے آرام سے بیڈ پر لٹا دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد انوجیت ایمبولینس والے کو بھیج کر آ گیا۔ تبھی جسپال نے پوچھا۔

''یار ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ کم از کم دس دن لگیں گے اور تم اسے......''

''پہلے تو یہی کہا تھا' لیکن رات انہوں نے ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد یہی کہا کہ اب زخم بھرتے بھرتے بھرے گا' گھر میں زیادہ آسانی سے دیکھ بھال ممکن ہوگی' بس کچھ احتیاطیں کرنے کو اور تین دن بعد چیک اپ کا کہا ہے۔'' اس نے پوری تفصیل بتا دی۔

''اب کیسا محسوس کر رہی ہو ہرپریت......'' اس نے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھا' یہاں گھر میں تو سکون ہے وہاں ایک طرح سے بے زاری تھی۔'' وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ تب انوجیت نے جسپال کو اشارے سے باہر بلایا' وہ دونوں باہر لان میں چلے آئے تو اس نے پوچھا۔

''رن ویر کو کس نے مارا ہے؟''

"میں نے......؟" جسپال نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"کیسے......؟" اس نے پوچھا تو جسپال نے تفصیل بتادی۔ جسے وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا پھر بولا۔ "میرا خود اسے مارنے کا پلان بن چکا تھا' سب لوگ تیار تھے۔ اس لیے میں ڈاکٹر کے سر چڑھ گیا کہ وہ ہرپریت کو گھر بھیج دے' مجھے تو صبح پتہ چلا' خیر......! اب تم سنبھالو یہاں' مجھے اپنے کچھ تنظیمی لوگوں سے ملنا ہے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست کرنا ہے' جو ہرپریت کے زخم کی روزانہ پٹی کر جایا کرے' شام تک لوٹ آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے......" جسپال نے کہا تو وہ انہی قدموں پلٹا اور اپنی گاڑی لے کر کوٹھی سے نکلتا چلا گیا۔ جسپال وہاں سے سیدھا ہرپریت کے کمرے میں چلا گیا۔ جو بلاشبہ اس کے انتظار میں تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرادی اور پھر آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"آؤ بیٹھو۔"

"پھوپھو کہاں ہے؟" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ بہت تھکی ہوئی تھیں' میں نے انہیں آرام کرنے کا کہا ہے' تم سناؤ۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میں ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے پاس آنے لگا تھا' تمہاری ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"آنے لگا تھا تو آجاتے؟" وہ بولی۔

"یار' وہ گرو مکھی نہیں نہ آتی نا' میں نے ایک خبر دیکھنی تھی۔" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی خاص خبر تھی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' خاص ہی تھی' پتہ نہیں تجھے انوجیت نے بتایا ہے کہ نہیں' میں نے اس بندے کو مار دیا ہے' جس نے تجھ پر فائر کروایا تھا۔"

"واقعی......کون تھا وہ؟" وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

"رن ویر......رات......میں نے......" اس نے کہا اور باقی بات اشاروں میں سمجھادی۔ ہرپریت کے اصرار پر اس نے تفصیل بتادی کہ کیسے پتہ چلا اور پھر کیسے مارا' وہ باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ سہ پہر ہوگئی۔ اس دوران لیڈی ڈاکٹر آگئی جو رسول پور کلاں کی رہنے والی تھی۔ اس نے آکر انجکشن دیا اور دوائیں دیں۔ کچھ دیر بعد ہرپریت سوگئی۔ ڈاکٹر چلی گئی تو جسپال حویلی جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ گاڑی لے کر جیسے ہی گیٹ پار کر کے باہر آیا تو اس کے سامنے دو جوان آن کھڑے ہوئے۔ جسپال نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ اور میرا راستہ کیسے روکا ہے؟"

"ہمارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے اور ہمیں حکم ہے کہ آپ کو گھر تک محدود رکھا جائے۔" ان میں سے ایک نے تیزی سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتا' لیکن آپ گھر تک ہی محدود رہیں گے۔" دوسری بار اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

"جس نے مجھے گھر تک محدود کرنے کا حکم دیا ہے اس سے وجہ بھی پوچھو ورنہ میرا راستہ مت روکو۔ جب معلوم ہو جائے تو مجھے بتا دینا' میں پنڈ جا رہا ہوں حویلی......" یہ کہہ کر اس نے اپنی گاڑی بڑھادی۔ اسے بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ معاملہ خاصا گمبھیر ہو گیا ہے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے گھیرنے کی کوشش

ہو رہی ہے۔ اس کے ارد گرد خطرہ بڑھ گیا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔ اس نے اپنے سیل فون سے رن ویر کے نمبر ملانا شروع کر دیئے۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی' کافی دیر بیل جانے کے بعد فون کسی نے ریسیو کر لیا' تبھی جسپال نے کہا۔

"آپ کون بات کر رہے ہیں' مجھے رن ویر سنگھ سے بات کرنا ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا۔

"میں جسپال سنگھ ہوں رن ویر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں فون دیں۔" اس بار وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"رن ویر سنگھ جی' کل رات شہید ہو گئے ہیں' میں ان کا بھائی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ......" وہ بولا' پھر لمحہ بھر کہا۔ "ٹھیک ہے' میں تھانے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا' وہ گاڑی لیے سیدھا تھانے جا پہنچا' وہ ڈیوٹی پر چند کانسٹیبل تھے اور ایک ایس آئی' تعارف وغیرہ کے بعد ڈیوٹی پر موجود اے ایس آئی سے پوچھا۔

"کیا آپ نے اپنے بندے میرے گھر پر لگائے ہوئے ہیں۔"

"ہم نے نہیں لگائے' یہ اوپر سے احکام آئے ہیں اور وہ بندے بھی چندی گڑھ سے آئے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں......؟" اس نے پوچھا۔

"رن ویر سنگھ رات قتل ہو گئے ہیں۔ دوسرے پولیس انسپکٹر ہیں' جن کا تھوڑے ہی دنوں میں قتل ہوا ہے۔ اس کی بڑے پیمانے پر تفتیش کی جا رہی ہے' اور سیدھی بات ہے کہ آپ پر بھی شک ہے۔"

"ٹھیک ہے' اس کا کوئی کاغذی ثبوت ہے تو مجھے دیں' میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں گا۔ لیکن اگر یونہی پولیس کو مجھ پر مسلط کیا گیا تو پھر میں اپنے وکلا سے مدد لینے کی ضرورت مجبوراً کروں گا۔ یہ بات اپنے آفیسر تک پہنچا دیں۔"

"آپ ان سے خود بات کیوں نہیں کر لیتے۔" اس نے کہا۔

"میں نہیں' میرے وکلا کریں گے' چندی گڑھ کونسا دور ہے' تین ساڑھے تین گھنٹے کا سفر ہے' اگر یہ اتنا ہی ضروری ہوا تو میں ضرور ایسا کر لوں گا' میں پھر یہاں کے نہیں اعلیٰ حکام سے بات کروں گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اب دیکھیں جی میں کیا کر سکتا ہوں۔" ڈیوٹی کانسٹیبل نے بے چارگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' اب میں خود دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔ عجیب رویہ ہے۔" جسپال نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

جسپال کو حویلی میں چہل پہل اچھی لگی تھی۔ تقریباً سبھی کمروں میں رہائش ہو گئی تھی۔ وہ دالان میں دھری ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو پریال سنگھ اس کے پاس آبیٹھا تو اس نے پوچھا۔

"کہو پریال! کیسا لگا ماحول؟"

"ماحول تو بہت اچھا ہے جی' آج صبح سے میں کچھ مشکوک بندے دیکھ رہا ہوں حویلی کے ارد گرد' کہیں یہ ہم پر شک نہ کر رہے ہوں کہ یہاں کا تھانیدار ہم نے مارا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"شک کرنے کو تو مجھ پر بھی کیا جا سکتا ہے مگر تم لوگ پھر بھی محتاط رہنا۔" جسپال نے عام سے لہجے میں کہا تو پریال نے پوچھا۔

"ویسے بائی جی' وہ گروپ جو ان تھانیداروں کو مار رہا ہے' ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

انہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی گروپ ہے جو ان تھانیداروں کو مار رہا ہے۔" جسپال نے چونک کر پوچھا۔

"حویلی کے باہر وہ جو ستھ (چوپال) ہے نا' میں کافی دیر ادھر بیٹھا رہا ہوں' لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اب یہ لوگوں کا اندازہ ہی ہے نا' کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ۔" اس نے بتایا۔

"انہوں نے تمہارے بارے میں بھی پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو اور حویلی میں کیوں رہتے ہو؟" جسپال نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھا تھا اور میں نے بتایا کہ ہم جسپال بائی جی کے ملازم ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہاں لاکر رکھا ہے' کیونکہ انہیں یہاں پر موجود کچھ لوگوں سے خطرہ ہے میرا خیال ہے یہ پیغام بلجیت سنگھ تک پہنچ بھی گیا ہوگا۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"چلو اچھا ہے۔ لیکن پرپال' یہ دھیان رکھنا تمہاری طرف سے پہل نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی جان کو آجائے' تبھی وار کرنا ورنہ تصادم سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرنا' کیونکہ وہ چاہیں گے کہ تم لڑو اور وہ کسی نہ کسی جال میں پھنسالیں۔" جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی' بائی جی!" اس نے مودبانہ انداز میں کہا' تبھی کچن کی طرف سے ایک لڑکی برآمد ہوئی جس نے سیاہ اور سفید دائروں والی قمیص شلوار پہنی ہوئی تھی اور سر پر سفید آنچل تھا' وہ ہاتھ میں ٹرے لیے نمودار ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر جسپال نے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ میری سویٹی ہے بائی جی' بہت جلد ہم شادی کرنے والے ہیں۔ باقی' یہ وہیں ہوتی ہے جہاں میں ہوتا ہوں۔ میرے بغیر رہ نہیں سکتی نا۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

"ست سری اکال جی۔" سویٹی نے ٹرے رکھا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے فتح بلائی۔

"ست سری اکال...... کیسی ہو؟" جسپال نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی' بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ چائے پئیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اچھی خاصی نوعمر اور خوبصورت لڑکی تھی۔ دونوں نے اپنا اپنا مگ اٹھالیا۔ چائے کے دھیرے دھیرے سپ لینے لگے۔ اس دوران پرپال اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ کس طرح وہ اسٹوڈنٹس سیاست میں رہا اور اب بدمعاشی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ کس طرح وہ ایک گروپ بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے جس سے اب بہت سارے کام وہ بڑی سہولت سے کرلیتا ہے۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے کہ باہر سے ایک نوجوان نے ان کے پاس آکر کہا۔

"باہر جی' کچھ لوگ آئے ہیں' جسپال جی' وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہیں تو بلالاؤں انہیں۔"

"نام نہیں پوچھا ان کا۔" پرپال نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

"پوچھا تھا' لیکن انہوں نے بتایا کچھ نہیں۔ بس ان کو باہر آنے کا کہا ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا چل' میں آتا ہوں۔" جسپال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پرپال اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے لوگ بھی اٹھ کر باہر کی سمت چل پڑے۔ جسپال نے حویلی کے پھاٹک پر آکر دیکھا' باہر کافی سارے لوگ کھڑے تھے جن کے درمیان ایک کار کھڑی تھی اور اس کے پیچھے پرانے ماڈل کی

جیپ تھی۔ ان کافی سارے لوگوں کے درمیان شلوار قمیص اور بھاری پگڑی کے ساتھ بلجیت سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے ابل رہے تھے اور وہ انتہائی نفرت وحقارت سے جسپال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جسپال نے اچٹتی ہوئی نگاہ سب پر ڈالی اور گیٹ کے قریب کھڑے بندے سے پوچھا۔

"ہاں بھئی' کیا بات ہے؟"

"سردار بلجیت سنگھ جی آئے ہیں۔ چلو ان کی بات سنو۔"

"اچھا' تو یہ ہے بلجیت سنگھ۔" پرپال سنگھ نے تیزی سے کہا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کر مخصوص اشارہ کیا جسے جسپال نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بلجیت سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"جس نے ملنا ہے وہ یہاں تک خود آجائے' جاؤ جاکر کہہ دو۔" اس نے قدر اونچا کیا تھا کہ اس کی آواز دور تک سنائی دے' جس پر وہ سب چند لمحے کے لیے تو خاموش کھڑے رہے پھر ایک ادھیڑ عمر کا بندہ آگے بڑھا اور اس کے پاس آکر سکون سے بولا۔

"جسپال سنگھ' میں اس گاؤں کا پنچ ہوں' دلبیر سنگھ نام ہے میرا اور ہمارا سرپنچ سردار بلجیت سنگھ ہے تمہیں شاید گاؤں کے ریتی رواج کا نہیں پتہ' اس لیے ہم سب مل کر تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تمہیں سمجھا سکیں' ورنہ پنچائیت کو یہ قانونی حق بھی حاصل ہے کہ وہ گاؤں کے کسی بھی شخص کو اپنے پاس حاضر ہونے کا کہہ دے۔"

"جی بولیں' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔" جسپال نے تحمل سے پوچھا۔

"کیا ہم یونہی کھڑے کھڑے بات کریں گے' ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟" دلبیر سنگھ پنچ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں سردار جی ہم آپ کو بیٹھنے کے لیے کیوں نہیں کہیں گے' آخر کو آپ چل کر میرے گھر آئے ہیں۔" یہ کہہ کر جسپال نے مڑ کر پرپال سے کہا۔ "ان سب کو بٹھاؤ اور ان کے لیے کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست کرو' جلدی۔"

"جی' بائی جی۔" پرپال نے کہا اور مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اندر سے چارپائیاں نکل کر باہر آنے لگیں۔ وہ "ستھ" میں برگد کے درخت کے نیچے ہی بیٹھتے جارہے تھے۔ پنچ اور سرپنچ کے لیے کرسیاں رکھ دی گئیں' انہی کے مقابل جسپال کو بھی ایک کرسی پر بٹھادیا گیا۔ تبھی دلبیر سنگھ نے بڑے ٹھنڈے اور تحمل بھرے انداز میں کہا۔

"دیکھ بھئی جسپال سنگھ' کسی بھی پنچائیت کا کام جہاں مسئلے مسائل کا فیصلہ کرنا ہے' وہاں اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ امن وامان رکھنے میں پوری مدد دے اور ایسا غیر قانونی کام نہ ہونے دے' جس سے امن وامان خراب ہوسکتا ہو' اس لیے ہم تمہیں سمجھانے آئے ہیں کہ یہ جو تم نے حویلی آباد کرلی ہے اور اس میں غنڈے لاکر بٹھادیئے ہیں' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اگر میں آپ کی ان ساری باتوں پر لکیر پھیر دوں تو......؟" جسپال نے سکون سے جواب دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" دلبیر سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں نے اچھے لفظ استعمال کیے ہیں بزرگو' ورنہ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میں آپ کی ان ساری باتوں کو جھوٹا ثابت کردوں۔" وہ اسی پرسکون لہجے میں بولا۔

"دیکھو' تم گھر پر آئی ہوئی پنچائیت کی بے عزتی کررہے ہو۔ تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس بار دلبیر سنگھ نے کافی حد تک سختی سے کہا۔
"میں نے کوئی غلط تو نہیں کہا۔ بجائے بے عزتی محسوس کرنے کے آپ مجھ سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے کہ میں کیسے غلط ثابت کر سکتا ہوں۔" وہ تحمل سے بولا۔
"بولو...... تم بتاؤ......" دلبیر نے غصے سے پوچھا۔
"میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور آپ پنچائیت میرے گھر لے کر آ گئے ہیں۔ میری کوئی غلطی بتاؤ، آپ امن وامان کی بات کرتے ہو تو بتاؤ مجھ پر جو قاتلانہ حملہ ہوا ہے، اس پر آپ لوگوں نے میرے گھر پر آ کر افسوس تک نہیں کیا، کیا آپ وہ لوگ تلاش کرنے میں میری مدد کرتے۔"
"ہم مانتے ہیں پتر کہ ہم افسوس کرنے تیرے گھر نہیں گئے، پہلی تو بات ہے کہ تمہارا گھر ہے کون سا؟ دوسری بات تم اپنا معاملہ لے کر پنچائیت کے پاس نہیں آئے، ہم تجھے کیوں پوچھتے پھرتے، تم تو پولیس کے پاس گئے ہو اب تم جانو اور پولیس......" دلبیر نے دلیل دیتے ہوئے کہا مگر جسپال کو اس کی بات چبھ گئی، وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
"یہ حویلی، وہ کوٹھی، کس کی ہے، میری نہیں تو اور کس کی ہے؟"
"نہ یہ حویلی تیری ہے اور نہ وہ کوٹھی تیری، قانون اس بات کو نہیں مانتا، تم تو ابھی تک یہ ثابت نہیں کر سکے ہو کہ تم واقعی کلوندر سنگھ کے پتر ہو۔ جس دن تمہیں اپنے بارے میں ثبوت مل جائے، اس دن آ کر بات کرنا۔ اب کوئی اور بات ہے تو کہو۔" دلبیر سنگھ نے صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے۔
"تو پھر تم لوگ کیا کرنے آئے ہو میرے پاس؟" جسپال غصے میں آ گیا، مگر تحمل سے بولا۔
"یہی کہ تم نے جو غیر قانونی طور پر اس پر قبضہ کیا ہے، اسے ختم کرو اور یہ جو منڈھیر (جتھہ) نے یہاں اکٹھی کر رکھی ہے اسے چلتا کرو... نقص امن کا خطرہ ہے۔"
"کیوں خطرہ کیوں ہے؟ انہوں نے کسی کو... کسی سے زیادتی کی، کسی کو برا بھلا کہا، یا پنچائیت... خوف ہے ان سے؟" جسپال نے پوچھا۔
"جب تم نے بنیادی طور پر ہی غلط کام کیا... باقی سارے غیر قانونی کام ہیں۔ پنچائیت کو یہ اختیار ہے کہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ اس کے لیے ہم پولیس سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔" دلبیر سنگھ نے کہا تو جسپال کو انتہائی غصہ آ گیا۔ وہ کھڑا ہو کر بولا۔
"میں آپ کو بزرگ مانتے ہوئے آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ یہ جو حویلی ہے، میرے باپ کی ہے اور اب میں اس کا مالک ہوں۔ یہاں پر موجود سب لوگ یہ بات کان کھول کر سن لیں اور سمجھ بھی لیں کل میرے باپ سمیت میرے خاندان کا خون کیا گیا، آج اگر میرا ہو جائے گا تو کوئی پروا نہیں۔ میں آیا ہی اس خاطر ہوں کہ یہاں مجھے قتل کر دیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرا خون کون کرتا ہے۔ اب جس میں ہمت ہے وہ حویلی کی جانب بڑھے، وہاں سے سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کا حوصلہ کرے، میں ابھی دیکھ لیتا ہوں اس کو۔"
"دیکھا لڑائی والی بات ہو گئی نا...... تم کر رہے ہو نا لڑنے کی بات۔" دلبیر سنگھ نے کہا
"بس دلبیر سنگھ جی، بس! مجھے نہ منافقت آتی ہے اور نہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ ایک سچے سکھ کا کرتو یہ ہی سچ ہوتا ہے۔ سچے بادشاہ گرونانک مہاراج نے سکھی کی

...ی سچ پر رکھی ہے۔ تم کیسے سکھ ہو جو جھوٹ اور ...ت کی بات کر رہے ہو۔ شرم کرو لڑنے کی بات ...کر رہا ہوں، یا تم لڑنے کے لیے آئے ہو اتنا لاؤ لشکر ...لے کر۔"
"زبان سنبھال کر بات کراوئے، میں ابھی تک ...ہوش اس لیے رہا ہوں کہ دلبیر سنگھ جی بات کر رہے ...چل روک تو کیسے روکتا ہے۔" بلجیت سنگھ نے ...ہو کر کہا تو دلبیر سنگھ نے جلدی سے کھڑے ہو ...سے بٹھا دیا۔
"تم بیٹھو بلجیت سنگھ، میں بات کر رہا ہوں نا۔" یہ کہہ ...ر اس نے جسپال سے کہا۔ "او لڑکے! شام سے پہلے ...یہ حویلی خالی کر کے چلے جاؤ، ہاں جب تم اس کے ...ہونے کا ثبوت لے کر آ جاؤ پنچائیت کے پاس تو ...تک یہاں پر رہنا، یہ ہمارا فیصلہ ہے۔"
"اور میں تم لوگوں کا فیصلہ نہیں مانتا۔ اب جو کرنا ...کر لیں۔" جسپال نے بے پروا انداز میں کہا۔
"چلو اوئے! اس کا سامان باہر پھینکو اور نکالو اسے ...ں سے۔" بلجیت سنگھ نے انتہائی غصے میں کہا تو چند ...آگے بڑھے، تبھی جسپال نے اونچی آواز میں کہا۔
"بلجیت، شروعات تم کر چکے ہو۔ یہ تمہاری دوسری ...ی ہے۔ اب بھاگنا نہیں۔" جسپال نے کہا اور اس ...طرف بڑھا، بلجیت کے اردگرد چند لڑکے کھڑے ...گئے۔ پریال سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بھی ...یں سیدھی کر کے بولٹ مار لیے۔
"رُک جاؤ۔" دلبیر نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتا ہوں ...جاؤ۔"
"دلبیر سنگھ آج فیصلہ ہو ہی جائے۔" جسپال نے ...کہا تو وہ درمیان میں آتے ہوئے بولا۔
"نہیں، ہم لڑنے نہیں آئے پنچائیت کا فیصلہ سنانے آئے ہیں۔ شام تک کا وقت ہے تیرے پاس، پھر نہ کہنا کہ زیادتی ہو گئی۔" پھر سب لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو...... چلو، واپس۔" تبھی جسپال نے اونچی آواز میں کہا۔
"سنو دلبیر سنگھ جی اور وہ بھی جو یہاں موجود ہیں، آج کان کھول کر سن لو جس میں بھی ہمت ہے، وہ جب چاہے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال سکتا ہے، میں بڑھ کر کسی پروا نہیں کروں گا اور نہ دھوکے سے سازش کر کے گھیرنے کی کوشش کروں گا، ایسا ہیجڑے کرتے ہیں۔ دس ہیجڑے مل کر ایک مرد کو مار سکتے ہیں، لیکن میں مرد اسے سمجھتا ہوں جو سامنے آ کر للکار کر وار کرے۔ تم میں سے اب بھی کوئی چاہتا ہے تو آئے، میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لے۔"
وہاں پورے مجمع میں خاموشی رہی، بلجیت سنگھ کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، تبھی دلبیر سنگھ نے کہنا چاہا۔
"دیکھو جسپال۔"
"نہیں صرف میری سنو اب...... میں جب سے یہاں آیا ہوں، مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ ہیجڑوں کی طرح چھپ کر وار کیا جا رہا ہے۔ مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ میں بھی مقابلے پر اتر آؤں، جہاں تک ہو سکا، میں قانون ہی کی زبان میں بات کروں گا، اور باقی رہی شام کی بات تو شام کس نے دیکھی، جو پنچائیت کا فیصلہ ہے وہ کر لے، پھر میرا جو فیصلہ ہو گا، وہ میں سناؤں گا۔"
"ہم نے بھی قانون کے مطابق تم سے بات کہہ دی ہے۔ اب شام تک تمہیں انتظار کرنا ہو گا۔" دلبیر سنگھ نے کہا اور لوگوں کو گھیر کر واپس لے جانے لگا۔ جسپال نے بلجیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں،

وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے' پھر بلجیت اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد صرف وہی وہاں پر رہ گئے۔ تبھی پریال نے کہا۔

''بائی جی! میں نے دیکھ لیا ہے' ان میں لڑنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''کتا کبھی شیر نہیں ہو سکتا پریال' جس طرح کمی کمین اپنی عادتوں سے پہچانا جاتا ہے' اسی طرح بے غیرت اور گھٹیا انسان بھی اپنی عادتوں ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو بندہ بھی سازش اور مکر سے لوگوں کو نقصان پہنچانے کا عادی ہو' کبھی سامنا نہیں کر سکتا لیکن محتاط رہنا' کتے اور سانپ کا کبھی بھروسہ نہیں کرو۔'' جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا بائی جی۔'' پریال نے کہا تو جسپال نے جیب میں سے اپنی کار کی چابی نکالی اور چل دیا۔

جس وقت وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو ذہنی طور پر کافی دباؤ میں تھا۔ جس طرح وہ سوچ رہا تھا' دشمن بھی اسی ٹریک پر سوچ رہے تھے۔ انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ یہاں پر حویلی کو اپنا مرکز بنائے گا اور ان کی طاقت ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے وہ اس مرکز کو بننے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ یہ بات تو چھپی نہیں رہی ہو گی کہ گاؤں کے لوگ بھی جسپال سے جا کر ملے تھے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو۔

انوجیت گھر پر تھا' وہ سیدھا ہرپریت کے کمرے میں گیا' وہ جاگ رہی تھی' اسے دیکھتے ہی مسکرا دی۔ پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی۔

''جسی جی' یہ چہرے پر کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' اس نے ہاتھوں سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اوہ نہیں جسی جی' تمہارا چہرہ ... بات ہوئی ہے۔''

''کس کا چہرہ کیا بتا رہا ہے؟'' انو... میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''میرے چہرے پر۔'' جسپال ... کرسی پر بیٹھ کر حویلی کے سامنے جو ... روداد اختصار سے سنا دی۔ وہ دونوں ... رہے' تبھی انوجیت نے کہا۔

''یار یہ جو پنچائیت کو اختیارات د... نا...... یہ ہیں تو اچھے مقاصد کے لیے' مگر ... اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کر... میرے خیال میں سب سے پہلے حویلی ... میں کوئی قانونی حوالہ تمہارے پاس ضرور ... کم از کم ان کی یہ دھمکی تو ختم ہو۔''

''میرا خیال بھی یہی ہے' اب نکودر میں ... گل صاحب ایڈووکیٹ بھی کچھ نہیں کر... دوسری طرف کیشیو مہرہ بھی ابھی تک کوئی ... تلاش نہیں کر سکا' جس سے کم از کم یہ مسئلہ تو ... جسپال نے کسی حد تک اکتائے ہوئے کہا۔

''یار یہ بھارت کی عدالت کے معاملات ... جلدی حل نہیں ہونے والے' یہ تو کسی دفتر ... گیدڑ پروانہ ہی لینا پڑے گا۔'' انوجیت نے ... ہوئے کہا۔

''اچھا تم ایسا کرو' گل ایڈووکیٹ سے ... میں کیشیو مہرہ سے بات کرتا ہوں' ابھی تو دفاتر ... ہو گا' دوپہر نہیں ڈھلی۔'' جسپال نے کہا۔

''او کے...... میں کرتا ہوں۔'' انوجیت ... سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ تبھی جسپال نے ... نکالا اور کیشیو مہرہ کو فون کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ...

... تو وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ تمہیدی جملوں کے ... بولا۔

''... بھی چند......''

''میں نے سب سن لیا ہے' پریال نے مجھے بتا دیا ... میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ تم ایسے ... بھی نکلو اور یہاں آ جاؤ' اسی ریزورٹ میں آ کر ... اور میرا انتظار کرو۔ میں کوئی نہ کوئی حل ... ہوں۔ میں تمہیں اس لیے بلوا رہا ہوں کہ ممکن ... آفیسر سے ملوانا پڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ... تمہیں جہاں بلواؤں وہاں آنا پڑے گا۔ خیر تم وہاں ... نکلو پھر بات کرتے ہیں۔'' کیشیو مہرہ نے تیزی ... کہا اور فون بند کر دیا۔

... واپس کمرے میں آ کر انوجیت سے مشورہ ... نے کے بعد جسپال کو وہاں سے نکلتے آدھا گھنٹہ ... گیا۔ اب اسے مزید آدھا گھنٹہ لگنا تھا جالندھر تک ... کا اس بار جب وہ گیٹ سے نکلا تو کوئی بندہ نہیں ... وہ جالندھر کی طرف اکیلا ہی چل پڑا۔

... وہ بائی پاس روڈ کے اس ریزورٹ میں پہنچ ... بڑے اطمینان سے چائے پی چکا تھا۔ وہ ... کیشیو مہرہ کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ جالندھر ... داخل ہونے پر اس نے خوش خبری سنا دی تھی کہ ... ہو گیا ہے' وہ وہاں انتظار کرے۔ تب سے وہ ... بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً چار بج گئے تھے' جب کیشیو ... وہاں آ گیا۔

''سوری یار مجھے دیر ہو گئی۔ دراصل بڑا صاحب ... چلا گیا تھا' اس سے دستخط کروانے کے چکر میں ... دیر ہو گئی' یہ لو۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک سفید ... کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

''اس کی قانونی حیثیت کیا ہے۔'' جسپال نے پوچھا۔

''ویسے تو قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے' لیکن یہ معمولی سا سفید کاغذ بہت بڑا ہیر پھیر ہے۔ اس کاغذ کے مطابق تمہارا کیس اس آفیسر کے پاس ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں چونکہ اس حویلی کا کوئی دوسرا دعویدار موجود نہیں ہے اس لیے حویلی میں رہنے اور اسے استعمال کی اجازت دی جاتی ہے جب تک...... جب تک...... کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔'' کیشیو مہرہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ گڈ......! مطلب' میں ان کی ایک فوٹو کاپی پنچائیت والوں کو دے دوں۔ ان کے اطمینان کے لیے یہ کافی ہو گا۔''

''بالکل' میں نے پریال کو فون کر کے بتا دیا ہے۔ وہ مطمئن ہیں۔ میرے خیال میں اب تم نکلو' شام ہونے سے پہلے تک یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے دو فوٹو کاپی والے کاغذ نکال کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ''یہ لو' یہ انہیں دے دینا۔'' کیشیو نے اٹھتے ہوئے کہا تو جسپال بھی کاغذ پکڑتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے پارکنگ تک آئے' ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے چل دیئے۔

اس وقت جسپال اوگی پنڈ سے ذرا فاصلے پر تھا' جب اس نے اپنے واپس آنے کے بارے میں انوجیت کو بتایا۔

''ٹھیک ہے' تم آ جاؤ' پھر شام ہوتے ہی میں تمہارے ساتھ دلبیر سنگھ کے پاس جاؤں گا۔ میرا خیال ہے اسے کچھ دوسری باتیں بھی سمجھانا ہوں گی۔''

''نہیں......؟ ابھی اور اسی وقت' انہوں نے شام تک کا الٹی میٹم دیا تھا۔ میں کہتا ہوں وہ حجت بھی نہ

رہے ابھی وہ معاملہ ختم ہوجائے تو ذہنی دباؤ ختم ہوجائے گا۔" انوجیت نے کہا۔

"نہیں، تم سیدھے دلبیر سنگھ کے گھر آؤ، میں پنڈ کے باہر تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" جسپال نے تیزی سے کہا اور فون بند کردیا۔

وہ دونوں دلبیر سنگھ کے گھر جاپہنچے۔ اس کے گھر کے باہر ایک ہرا بھرا درخت تھا، کافی بڑی ڈیوڑھی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ تبھی جسپال نے اس سفید کاغذ کی فوٹو کاپی نکال کر اسے دی۔

"یہ لیں سردار جی، میں بڑے صاحب کا حکم نامہ لے آیا ہوں۔ اصل میرے پاس ہے۔ اور یہ نقل آپ کو دے رہا ہوں۔ اس حکم نامے کی تصدیق جب چاہیں کرالیں۔"

سردار دلبیر سنگھ نے وہ کاغذ پکڑا، پھر پڑھے بغیر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"جسپال پتر! میں جانتا ہوں کہ تو ہی کلوندر سنگھ کا پتر ہے اور یہ حویلی تیری ہے، میں اگر آج نہ ہوتا تو بلجیت کی نیت لڑائی ہی کی تھی۔ یہ کاغذ بنوالیا تو نے اچھا کیا...... اب کم از کم کوئی ثبوت تو ہے نا جس پر میں ان سے بات کرسکتا ہوں۔ پتر......! ہماری سو مجبوریاں ہیں، ان کے ساتھ چلنا پڑتا ہے، کبھی خاموش رہنا پڑتا ہے، کبھی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے اور کبھی کوئی اپنی بھی منوا لیتے ہیں۔ بس تو ان سے بچ کر رہ بڑے ظالم لوگ ہیں......" اس نے کافی حد تک دردمند لہجے میں کہا۔

"بس آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ اتنا ہی ظلم کریں، جتنا سہہ سکیں، یہ نہ ہو کہ اب میں پچھلا حساب بھی ان کے ساتھ برابر کردوں۔"

"دیکھ پتر......! ان کا تو کام ہی لڑنا بھڑنا ہے۔

رب کی مار ہے ان پر اسی لیے تو ان کی
کنواری مرگئی تھیں۔ ان کی شادی
معاشرے میں ان کی کیا قدر جو ا
دلاسکیں۔ ہر بندے کے اندر غصہ
ہے، عزت اور غیرت کا مسئلہ ہوتا ہے
آدمی معاشرے کو ختم کرکے رکھ دے
اپنی زمینیں سنبھال، دوسروں کے دکھ
کو نظر انداز کردے۔" اس وقت وہ پنچایت
سنگھ لگ ہی نہیں رہا تھا۔

"تو پھر رب راکھا دلبیر سنگھ جی
ہوگی۔" جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسے نہیں پتر، تو پہلی بار میرے گھر آیا
آرہی ہے پیڑوں والی، تیری چاچی کو کہہ کر آیا
وہ پی لو تم دونوں تو پھر چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے سردار جی، جیسے آپ چاہو۔" جسپال
گیا تو اس کے ساتھ انوجیت نے بھی کرسی سنبھال

"پتر......! میں نے سنا ہے ادھر کینیڈا
تمہارا اچھا بھلا کاروبار ہے، تم ادھر رہو گے تو وہاں
دیکھ بھال کرتا ہوگا۔" دلبیر سنگھ نے پوچھا۔

"وہ جی میری پھوپھو سکھ جیت کور کے پتر
سنبھالتے ہیں۔ میں ایک یہ زمین اپنے نام کروا
تو ادھر ہی کینیڈا بنا دینا ہے۔ یہاں فیکٹریاں لگا
یہ جو سارا دن منڈھیر و یہلی پھرتی رہتی ہے اسے
پر لگادوں گا...... اور یہ جو......" لفظ اس کے منہ میں
تھے کہ ایک نوجوان تیزی سے موٹر سائیکل پر آن
وہ حواس باختہ سا بولا۔

"سردار جی...... وہ...... حویلی۔"

"اوئے کیا ہوا حویلی کو۔" دلبیر سنگھ اٹھ کھڑا ہوا
اس کے ساتھ انوجیت اور جسپال بھی اٹھ گئے۔

نووارد دونوں کو دیکھ کر ایک دم سے جھجک گیا تھا۔ پھر حوصلہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ جی بلجیت سنگھ نے حویلی کو آگ لگادی ہے۔"

"آگ لگادی ہے۔" جسپال نے پوچھا اس کے لہجے میں انتہا درجے کی حیرت چھلک پڑی تھی۔

"وہاں پر موجود بندے......" انوجیت نے پوچھا۔ اس کے حواس قابو میں تھے۔

"انہیں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے، تبھی تو خالی حویلی کو انہوں نے......" نووارد نے کہا تو جسپال تیزی سے اپنی گاڑی کی جانب بھاگا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ اس کے پیچھے کون آرہا ہے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی گاؤں کی گلیوں میں بھگاتا ہوا جارہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اپنی حویلی میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ کھولا، اس میں سے کولٹ پسٹل نکالا، پھر سیفٹی کیچ ہٹا کر اس گلی میں گاڑی موڑلی، جو سیدھی ستھ میں جاکر کھلتی تھی اور سامنے حویلی تھی۔ اس نے حویلی میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا تو اس کا اپنا دماغ دھوئیں سے بھر گیا۔ اس نے دیکھا، ستھ میں بلجیت سنگھ کے ساتھ چند لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ گاڑی رکی تو وہ متوجہ ہوئے، جسپال نے اندر بیٹھے ہی گولیاں برسانا شروع کردیں۔ وہ وینکوور کے شوٹنگ کلب کا بہترین ممبر تھا، لیکن یہاں اس نے یہ نہیں دیکھا کہ کس کے کہاں گولی لگ رہی ہے۔ اس نے پورا میگزین خالی کیا تو دوسرا میگزین لمحے میں لگاتے ہوئے باہر جھانکا۔ وہاں کئی ڈھیر ہوچکے تھے۔ اچانک وارد ہونے اور دوسرا نشے میں ہونے کے باعث وہ اپنے ہتھیار ہی سیدھے نہیں کرپائے تھے۔ یہ جسپال کا جنون تھا، ایک دو نے ہتھیار سیدھے کیے تو جسپال نے ان پر بھی گولیاں برسادیں۔ بلجیت درخت کی دوسری طرف تھا، جس وقت اس نے دیکھا کہ پانسہ ہی پلٹ گیا ہے، اس نے بھاگنا چاہا، اس نے غلطی یہ کی کہ اپنی گاڑی کی جانب بھاگا، ممکن ہے اس میں اسلحہ پڑا ہوا یا کچھ اور مقصد تھا، لیکن اس وقت تک جسپال اپنی گاڑی سے باہر آچکا تھا۔ انہی لمحات میں انوجیت کی گاڑی بھی وہاں آگئی تھی۔ جسپال نے اونچی اور کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رک جاؤ بلجیت......! تم بھاگ نہیں پاؤ گے۔ اب تیری ساری سرپنچی ادھر ہی نکالنی ہے...... تکڑا ہوجا۔"

اتنا کہتے ہوئے اس نے دو تین فائر اس کے پیروں میں ماردیئے۔ وہ ساکت ہوگیا۔ بلجیت نے دھیرے سے گھوم کر جسپال کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے اردگرد کچھ زخمی زمین پر ادھ موئے پڑے تھے اور کچھ بھاگ گئے تھے۔ اس نے اپنی ضد پوری کرلی تھی، حویلی کو جلادیا تھا اور یہی وہ جذبات کا انتہائی مقام تھا جہاں جسپال کے لیے تمام حدیں ختم ہوگئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا بلجیت کے پاس جاپہنچا، جو شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ جسپال چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اپنا پسٹل بیلٹ میں اڑستے ہوئے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ بلجیت کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا، پھر جسپال نے اسے گریبان سے پکڑ کر گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے ذرا سی مزاحمت کی، لیکن تب تک جسپال نے اس کی دھنائی شروع کردی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ بلجیت کے

کہاں کہاں مار رہا ہے‘ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا تو جسپال نے پوری طاقت سے ٹھوکر اس کے سر پر ماری‘ اس کی دستار اتر گئی اور کیس کھل گئے۔ تبھی وہ اس کے منہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ جسپال نے ایک پاؤں اس کی بغل میں رکھا اور پوری قوت سے اس کا ہاتھ کھینچ کر بازو نکال دیا۔ بلجیت کی چیخ فضا میں بلند ہوگئی۔ جسپال نے ادھر ادھر دیکھا‘ اسے برگد کے درخت تلے لاٹھیاں اور ڈنڈے پڑے دکھائی دیئے۔ جسپال نے بھاگ کر ان میں سے ایک ڈنڈا اٹھایا جو کافی موٹا اور مضبوط تھا۔ پہلے اس نے بلجیت کی بائیں ٹانگ پر پنڈلی کے پاس ضربیں لگانا شروع کردیں‘ بلجیت ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح ڈکارنے لگا تھا۔ تین چار ضربوں کے بعد اس کی پنڈلی ٹوٹ گئی‘ تو دوسری پر طاقت آزمائی کرنے لگا۔ اسے توڑنے کے بعد اس کا وہ بازو توڑنے لگا جو ابھی سلامت تھا۔ پہلا تو جڑ سے نکل کر بے حس و حرکت ہوگیا تھا۔ بلجیت ہوش و حواس سے بے گانہ ہوچکا تھا‘ اس وقت جسپال مٹی کے تیل کا وہ کین اٹھا چکا تھا‘ جو ستھ کے قریب پڑا تھا‘ اور حویلی کے جلانے کے کام نہیں آیا تھا کہ پولیس کی گاڑیاں وہاں آن پہنچیں‘ اس کے ساتھ ہی گاؤں کے لوگوں کا ایک اژدھام وہاں آ گیا۔ پولیس انچارج نے اونچی آواز میں کہا۔

’’رک جاؤ جسپال......! اب کوئی حرکت نہ کرنا۔‘‘

’’تم رک جاؤ پولیس والو! تم کچھ نہیں کرسکتے‘ میں ان بے غیرتوں کو سبق سکھا رہا ہوں جو دوسروں کا گھر جلاتے ہیں۔ تم بھی انہی کے ساتھ شامل ہو۔‘‘

’’بکواس بند کرو اور اپنا آپ ہمارے حوالے کردو۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔‘‘ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

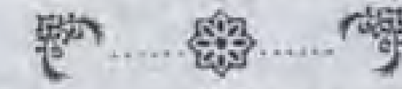
’’گولی مجھے بھی چلانا آتی ہے۔ چلاؤ‘ دیکھیں کون مرتا ہے۔‘‘ جسپال نے اپنا پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔

’’دیکھو پلیز......! میں مانتا ہوں کہ بلجیت نے زیادتی کی ہے اور تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اپنے دفاع میں کیا ہے‘ میں تمہیں گرفتار نہیں کرتا‘ تم چاہو تو جاسکتے ہو‘ اب بلجیت کو کچھ نہ کہو......‘‘ وہ لجاجت سے بولا تو جسپال نے پوچھا۔

’’وہ بندے جو تم یہاں سے لے کر گئے ہو‘ کیوں......؟‘‘

’’ہمیں حکم ملا تھا کہ انہیں گرفتار کر کے جالندھر لایا جائے‘ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں ایسی سازش ہے‘ پلیز‘ اسے چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔ میں تمہارے بندے بھی چھوڑ دوں گا۔‘‘

’’تم نہ بھی چاہو انہیں چھوڑنا تو پڑے گا تمہیں۔ میں جا رہا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس میں بیٹھ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ نجانے کدھر تھا‘ اس کے ساتھ ہی انوجیت بھی نکل گیا۔



میں اپنی گلی میں پہنچا تو مجھے دور ہی سے اپنا گھر جلنے کے آثار دکھائی دے گئے۔ میرے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں میرے دماغ کو بوجھل بنا رہا تھا۔ میرا دوران خون تیز ہونے لگا تھا اور میرا غصہ میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں جوں جوں اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا رہا تھا‘ میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ پیرزادہ وقاص مجھے گاؤں کے قریب اتار کر چلا گیا تھا۔ جس وقت میں جیپ سے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک پسٹل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’جمال......! اگر تم میرے پاس آنا چاہو تو پھر دیر مت کرنا‘ جو کہو گے وہی کرلیں گے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ گاؤں میں زیادہ دیر نہ رہنا۔‘‘

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور چپ چاپ اپنے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔ میں اپنے گھر کے گیٹ پر رکا‘ جلے ہوئے گھر کو دیکھ رہا تھا‘ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں صحن میں گیا تو ہر کمرہ ہی نہیں دیواریں بھی سیاہ ہوچکی تھیں۔ چھت والا کمرہ ٹوٹ کر گر چکا تھا‘ ایک ہی نگاہ میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہاں کچھ بھی نہیں بچا ہے‘ سب کچھ خاکستر ہوگیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں رہا تو میرا دماغ خراب ہوجائے گا‘ جس گھر میں‘ میں نے شعور کی آنکھ کھولی‘ جو صحن میرے بچپن اور جوانی کا گواہ تھا‘ وہاں اب کچھ نہیں بچا تھا۔ اگرچہ میرا دل رو رہا تھا‘ لیکن میری آنکھوں میں نمی نہیں اتری تھی۔ شاید میرے اندر آگ ہی اس قدر زیادہ تھی۔ میں پلٹ کر گھر سے باہر آ گیا۔ اب میرے لیے دنیا بھر کے کاموں سے زیادہ یہی اہم ترین کام تھا کہ میری ماں کہاں ہے؟ میری آمد کے بارے میں شاید معلوم ہوگیا تھا‘ اس لیے گلی کے لوگ باہر نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ تبھی مجھے یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ انہوں نے آگ لگتے ہوئے دیکھی‘ بندے شاہ زیب کے پروردہ تھے۔ لیکن کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ میری ماں کدھر ہے؟ میں کچھ دیر ان کے پاس رہا‘ پھر چوک کی طرف چل پڑا۔

شاید میری آمد کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی‘ اس لیے جیسے ہی میں چوک میں برگد کے درخت تلے پہنچا‘ وہاں کئی نوجوان اور بزرگ جمع ہوگئے تھے۔ بھیدہ مجھے دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

بلاشبہ وہ اکیلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں ان سب لوگوں سے نکل کر بھیدے کے پاس چلا گیا۔

’’چلو آ...... گھر چل کر بات کرتے ہیں؟‘‘

’’نہیں! گھر نہیں جانا‘ تو صرف یہ بتا کہ اماں کے......‘‘

’’وہی تو کہہ رہا ہوں‘ سکون سے بتاتا ہوں۔ چل آ......!‘‘ بھیدے نے کہا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد کہا۔

’’نہیں بھیدے...... میں نہیں چاہتا کہ تو بھی دشمنوں کے ظلم کا شکار ہوجائے‘ تو نے مجھے جو بتانا ہے یہاں بتادے‘ یا پھر ڈیرے پر چل‘ میں وہیں آتا ہوں۔‘‘

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا‘ پھر بولا۔

’’چھاکا مجھے بتا کر گیا ہے۔ وہ اماں کے ساتھ سوہنی کو لے کر قصبے میں چلا گیا ہے۔ وہ وہیں ہے‘ لیکن چھپا ہوا ہے‘ کہہ رہا تھا کہ جب تک تو پولیس کے چنگل سے نکل نہیں آتا‘ تب تک وہ وہیں رہے گا‘ قصبے میں‘ وہ کہاں ہیں‘ یہ مجھے نہیں معلوم۔‘‘

’’ٹھیک ہے تو جا‘ ڈیرے کا خیال رکھنا۔ میری اگر قسمت میں ہوا تو دوبارہ آن ملوں گا۔‘‘ میں نے کہا اور واپس درخت تلے آ بیٹھا۔

میں درخت کے تلے صرف اس لیے جا کر بیٹھا تھا کہ جہاں گاؤں والوں کو معلوم ہوجائے کہ میں واپس آ گیا ہوں‘ وہاں شاہ زیب تک بھی اطلاع پہنچ جائے۔ تیسرا یہ‘ مجھے یہ خود بخود معلوم ہوجانا تھا کہ میرے ٹولے کے لڑکے گاؤں میں ہیں یا کہیں چھپ چھپا گئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر کوئی گاؤں میں ہوتا تو

ضرور سامنے آجاتا کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا' میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اٹھ گیا۔ میرا رخ اب قصبے کی طرف تھا۔ اس وقت سہ پہر کے بعد سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہاں چند دکانیں تھیں اور ذرا سا آگے جا کر حویلی کی طرف جانے والا راستہ تھا' میں ایک دکان کی طرف بڑھا' جہاں سے چائے وغیرہ کے ساتھ کھانے پینے کو مل جاتا تھا۔ میں جا کر وہاں بیٹھ گیا اور دکان دار کو اچھی سی چائے بنانے کو کہا۔ میرا مقصد وہاں چائے پینا نہیں تھا' بلکہ کسی ایسے بندے کی تاڑ میں تھا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح حویلی سے ہو۔ دراصل اس وقت میں سخت الجھن میں تھا۔ ایک طرف دماغ یہ کہہ رہا تھا کہ سب سے پہلے اپنی اماں کو تلاش کروں پھر اطمینان کے بعد شاہ زیب سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں گے لیکن دوسری طرف میرے اندر کا جانور مطمئن نہیں ہو رہا تھا' وہ چاہتا تھا کہ شاہ زیب کو اس کا سبق سکھا کر ہی جاؤں' میں دراصل وہاں فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میری نگاہوں میں ان تینوں کے چہرے گھوم رہے تھے اور میری تمام تر توجہ ان کی طرف تھی۔ اماں اور سوہنی کا تو معاملہ ایک طرف رہا' میں اپنے جگری دوست چھاکے کے گھر جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہاں تھا بھی کون؟ اس کا ایک اکیلا باپ ، اگر وہ مجھ سے یہ سوال کر دیتا کہ وہ میری وجہ سے غائب کیوں ہے تو میں اسے کیا جواب دیتا۔ اگر انہی لمحات میں مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ تینوں کہاں ہیں اور خیریت سے ہیں تو میں پوری توجہ سے شاہ زیب کو ختم کرنے کے بارے میں سوچتا۔ مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ میرے سامنے چائے آ گئی۔ میں دھیرے دھیرے سپ لے رہا تھا اور سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بھیدے نے اگرچہ مجھے اشارہ دے دیا تھا لیکن اسے بھی پوری امید نہیں تھی کہ وہ قصبے میں کہیں ہوں گے بھی یا نہیں۔ مجھے بہرحال انہیں تلاش کرنے جانا تھا۔ اگر میں انہیں تلاش کر بھی لیتا ہوں تو پھر انہیں کہاں رکھوں گا' یہاں گاؤں میں؛ جہاں وہ ہر وقت غیر محفوظ ہوں گے؟ یا پھر مجھے سوہنی کی بات ماننا پڑے گی اور اس کے پاس اماں کو رکھنا ہوگا؟ کیا وہ ملک سجاد اور شاہ زیب کا مقابلہ کر پائے گی؟ کیا وہ وہاں پر محفوظ ہوگی؟ میں خیالوں کی راہ پر بہت دور تک سوچتا چلا گیا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا اور میری چائے ختم ہو گئی۔ اسی دوران میں نے سڑک پر دیکھا' دلبر کا دوست جانی شوکر بائیک پر بیٹھا آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے تلاش کر رہا تھا کیونکہ اس کی جیسے ہی مجھ پر نگاہ پڑی' وہ چونک گیا اور میری طرف بڑھ آیا۔ چند لمحوں بعد میرے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''بڑا زوردار حملہ تھا یار، شاہ زیب کے بندوں کا' ہمیں تو بعد میں پتہ چلا......''

''تو پتہ کر سکتا ہے کہ اس وقت شاہ زیب کہاں ہے؟'' میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

''وہ کل رات سے یہاں پر نہیں ہے۔ سنا ہے شہر گیا ہوا ہے' ہو سکتا ہے شام تک واپس آ جائے۔''

''یہ پکی خبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یہ پکی خبر ہے۔'' اس نے تصدیق کی۔

''چلو پھر تو ایسے کر' مجھے اپنا بائیک دے' میں رات کسی بھی وقت تیرے پاس آؤں گا' تو ادھر میرے ڈیرے پر رہنا' اور یہ خبر ضرور لینا کہ شاہ زیب واپس آ گیا ہے یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے بائیک کی چابی مجھے تھماتے ہوئے کہا تو ایک دم سے مجھے خیال آیا۔

''نہیں......! تو اپنے گھر ہی رہنا' میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ پھر تو شاہ زیب کی پکی خبر رکھنا۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

اس وقت میں بائیک پر بیٹھا ہی تھا اور چابی اگنیشن میں لگائی ہی تھی کہ قصبے کی طرف سے پولیس گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں چونک گیا' نجانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دے دیا۔ میں اس طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ حویلی کی جانب مڑ جائیں تو خطرے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ آگے آتی ہیں تو مجھے اپنا بچاؤ بہرحال کرنا چاہیے تھا۔ میں نے انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ وہاں سے نکل پڑا' میں سڑک کنارے چلتا ہوا گاؤں کی طرف ایک پگڈنڈی پر اتر گیا۔ پولیس گاڑیاں وہیں سڑک پر دکانوں کے پاس رک گئی تھیں۔ کیا میری مخبری ہو گئی تھی؟ اگرچہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے بہرحال احساس ضرور ہو گیا تھا۔ میں رکا نہیں' بلکہ گاؤں کے اوپر سے نکلتا ہوا چل پڑا۔ مجھے قصبے تو جانا ہی تھا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں نہر کنارے آ گیا۔ میں نے سڑک کا راستہ نہیں لیا' بلکہ نہر کنارے چلتا چلا گیا' اس وقت اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ جب میں قصبے کے قریب پہنچ گیا۔

میرے لیے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ چھاکا' اماں اور سوہنی کو لے کر کہاں جا سکتا ہے؟ میرے ذہن میں تین ہی نام تھے۔ وہ تینوں میرے جگری دوست تھے اور چھاکے کو ان کے بارے میں پوری طرح علم تھا۔ وہ انہی پر یقین کر سکتا تھا' ان تینوں کے گھر مجھے باری باری جانا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک ترتیب رکھی اور قصبے کی گلیوں میں گھس گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد میں اپنے پہلے دوست کے گھر پر تھا۔ اگرچہ اس سے کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا' مگر کہیں بھی اس کی باتوں سے مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ اماں' سوہنی اور چھاکا اس کے پاس ہوں گے۔ اس طرح جب میں سہیل کے گھر گیا تو وہ مجھے دیکھتے ہی کھل گیا۔

''اوئے تو صبح کا کدھر غائب ہو گیا تھا' ہم تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گئے کہ تو' یا تو پولیس کے ہاتھوں کھپ گیا یا پھر فرار ہو گیا...... چل آ اندر آ......''

''تو مجھے کہاں تلاش کرتا رہا۔'' میں نے محتاط انداز میں پوچھا تو وہ گیٹ کھولتے کھولتے رک گیا۔

''میں اور چھاکا' صبح ہی تھانے گئے تھے' اس وقت تک وہ تجھے لے کر نکل گئے تھے۔ پتہ یہی چلا کہ وہ تجھے شہر کی عدالت میں لے کر جائیں گے' ہم جب وہاں پہنچے ہیں تو پتہ چلا کہ تم آئے ہی نہیں ہو۔''

''پھر......؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا' ہم سب ہی پریشان ہو گئے۔ اک کانسٹیبل سے ذرا سا سراغ ملا تھا کہ تمہیں راستے ہی میں اتار دیا تھا بس پھر ہم نے اپنے طور پر اندازے لگائے' تو بتا گیا کدھر تھا؟'' اس نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''وہ تو میں تجھے بتاتا ہوں لیکن تو یہ بتا کہ اماں اور سوہنی کدھر ہیں' اب چھاکا کہاں پر ہے؟''

''وہ تو شام کے وقت چلے گئے لاہور' ابھی راستے ہی میں ہوں گے' سوہنی نے جیپ منگوائی تھی۔ اس میں گئے ہیں۔'' سہیل نے مجھے بتایا۔

''اوہ......!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''ویسے وہ خیریت سے تھے نا......؟'' میرے انداز پر وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔

''وہ ٹھیک تھے۔ چھاکے کو اطلاع ملی تھی کہ شاہ زیب وغیرہ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں لے کر سیدھا میرے پاس آ گیا۔ آج صبح مجھے اطلاع ملی کہ ......خیر' آؤ اندر آ۔'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ میں نے بائیک اندر کر لی اور صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ بھابی کچن میں تھی' اور بچے اندر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''اب مجھے بتا' وہ کب گئے ہیں؟''

''یہی کوئی دو گھنٹے پہلے' ان کا پروگرام یہی ہے کہ چھاکا انہیں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔ پھر ہم دونوں تیرا کوئی سراغ تلاش کریں گے...... وہ تیرے لیے پریشان تھے......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ''لے بات کر لے ان سے' تجھے اطمینان ہو جائے گا۔'' کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا' فون سوہنی ہی نے اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چہک اٹھی۔

''تو ٹھیک تو ہے نا جمال......''

''میں ٹھیک ہوں' تو اماں کے بارے میں بتا' چھاکا کدھر ہے؟''

''وہ دونوں ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ لاہور جا رہے ہیں۔ تو بھی ایسا کر لاہور ہی آ جا' وہاں اطمینان سے بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔''

''تو میری اماں سے بات کروا......'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ چند لمحے بعد اماں کی آواز فون میں گونج اٹھی۔

''میں ٹھیک ہوں پتر! تو اپنی سنا۔''

''بس جب تک تیرا پتہ نہیں مل رہا تھا' میں پریشان تھا' اب میں پریشان نہیں ہوں۔''

''تیرے لیے وہاں بہت خطرہ ہوگا' جیسا یہ کہتی ہے' ویسے مان لے......'' اماں نے کہا۔

''اماں......! تو بس دعا کر...... میں سارے مسئلے حل کر لوں' پھر سکون ہوگا۔ چھاکے سے میری بات کروا دے۔''

چند لمحے بعد چھاکا لائن پر تھا۔

''تو فکر نہ کر جمال......! میں انہیں لاہور چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا تو ادھر سہیل کے پاس ہی ٹھہر' میں نے وقت سے پہلے ہی اماں اور سوہنی کو وہاں سے نکال لیا تھا۔ دوسرا تیرے چھت والے کمرے کا سارا سامان بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تو فکر نہ کر' میں آ جاؤں تو دونوں مل کر سب کچھ کریں گے۔ اگر کہتا ہے تو ہم واپس آ جاتے ہیں۔''

''نہیں...... سوہنی کے ذہن میں کوئی محفوظ ٹھکانہ ہوگا' انہیں وہاں چھوڑ کر تو فوراً واپس آ جا' تیری ضرورت ہے مجھے۔ سوہنی سے بات کروا۔''

''ہاں بول جمال کیا کہتا ہے۔'' سوہنی کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''سوہنی......! تیرے پاس کوئی ایسا ٹھکانہ ہے جہاں تم اور اماں محفوظ رہ سکو' اور ملک سجاد......؟''

''تو فکر نہ کر...... میرا نمبر ہے نا تیرے پاس...... اس سے رابطہ رہے گا' بلکہ نہیں...... میں لاہور جاتے ہی اپنا نمبر تبدیل کر لوں گی' اور چھاکے کو دے دوں گی' تو مجھ سے رابطہ رکھنا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے' میں چھاکے کا انتظار کروں گا۔ اسے کل تک بھجوا دینا واپس۔'' میں نے کہا اور پھر چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔

میں نے سہیل کو ساری روداد بتائی تو وہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔

''اب تجھے بہت محتاط رہنا ہوگا جمالے۔ ایک طرف شاہ زیب ہے تو دوسری طرف پولیس اور یہ جو پیرزادہ وقاص ہے نا' اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا' ایسے لوگ دوسروں کو فقط شطرنج کا مہرہ خیال کرتے ہیں۔ جس سے شاہ کو بھی مارا جا سکتا ہے یا پھر اگر پٹ جائیں تو انہیں فرق نہیں پڑتا۔''

''میں سمجھتا ہوں سہیل' اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں جائے گا تو......ادھر سکون سے سوجا' ابھی کھانا کھاتے ہیں۔ پھر گپ شپ کریں گے۔'' سہیل نے بے تکلفی سے کہا تو میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں! مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ تیرا شکریہ اب بس مجھے اجازت دے۔''

''نا بھائی...... کھانا کھا کر جانا' بس پانچ منٹ میں لائی۔'' بھابی نے کچن میں سے کہا تو مجھے وہاں بیٹھنا پڑا۔

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ جب میں سہیل کے گھر سے نکلا۔ میرا رخ گاؤں نور نگر ہی کی طرف تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے' بیس پچیس منٹ بعد میں اپنے ڈیرے پر تھا۔ بھیدہ ابھی سویا نہیں تھا۔ اس نے میرے لیے بستر بچھایا تو دل میں اک ہوک اٹھی۔ دو دن پہلے تک میرا اپنا گھر تھا۔ جسے دشمنوں نے جلا دیا تھا۔ آج اگر میرے پاس یہ ڈیرہ نہ ہوا تو میں در بدر تھا۔ میں بستر پر لیٹا نہیں' یہی سوچتا رہا' تبھی بھیدہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''تو پریشان نہ ہو جمالے' رب سوہنا کرم کرے گا۔''

''ہاں اس رب ہی سے تو امیدیں ہیں ساری......'' میں نے کہا اور پھر لیٹتے ہوئے اس سے کہا۔ ''بھیدے...... تو ایسا کر یہ بائیک لے جا اور جا کر جانی شوکر کو دے دے' میرے بارے میں پوچھے تو بتا دینا کہ میں ادھر ڈیرے پر ہوں۔''

''میں آ جاؤں واپس یا......'' اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اگر فوراً تیرے ساتھ چل پڑے تو ساتھ ہی آ جانا' ورنہ جیسے تیرا دل چاہے۔'' میں نے کہا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد بھیدہ چلا گیا اور میری کب آنکھ لگی' یہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

اس وقت اندھیرا ہی تھا' جب میری آنکھ کھلی' میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی تو ستاروں کی چال بتا رہی تھی کہ رات گزر چکی ہے اور کچھ دیر میں صبح صادق ہونے والی ہے۔ ایسے وقت میں ڈنگروں کا اپنا ایک مخصوص شور ہوتا ہے۔ میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ تبھی مجھے بھیدہ دکھائی دیا جو چارے کی ٹوکری اٹھائے ڈنگروں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چارہ ڈال کر واپس پلٹا تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ تبھی وہ سیدھا میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں......! کیا کہا تھا جانی شوکر نے......؟''

''اس نے کہا تھا تو جا' میں آ جاتا ہوں۔ میں تو پھر واپس آ گیا' مگر وہ نہیں آیا ابھی تک۔''

''چل کوئی بات نہیں۔ آ جائے گا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر نہانے کے لیے چل دیا۔

میں نہا کر واپس اپنی چارپائی پر آیا تو جانی شوکر آیا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''اچھا ہوا تم کل فوراً ہی نکل گئے۔ پولیس تیرے لیے ہی کل آئی تھی۔ اسے شاہ زیب نے بھجوایا تھا۔ وہ

کل پورے گاؤں میں تجھے تلاش کرتے رہے ہیں۔ لگتا ہے تیری مخبری ہوئی ہے۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی جانی! میں کل جان بوجھ کر چوک میں بیٹھا رہا تھا۔ گاؤں میں سارے ہی لوگ میرے سجن نہیں ہیں' ان میں بہترے دشمن بھی ہیں۔ تو مجھے صرف اتنا بتا کہ شاہ زیب حویلی میں آیا ہے یا نہیں؟"

"نہیں آیا۔" اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پکی خبر ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"پکی خبر ہے۔" اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "میرا بڑا بھائی حویلی میں ملازم ہے۔ اسے حویلی کے ہر معاملے کی خبر ہوتی ہے ابھی اس سے تصدیق کر کے تیرے پاس آیا ہوں۔"

"ہے کہاں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"شہر ہی گیا تھا' ابھی تک واپس نہیں پلٹا' ممکن ہے وہیں سے کہیں دوسری طرف نکل گیا ہو۔ ہاں! ان بندوں کے بارے میں جان گیا ہوں جنہوں نے تیرا گھر جلایا تھا۔"

"واہ...... کتنے بندے تھے...... سبھی کے......" میں نے تیزی سے پوچھا تو اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"بندے تو بہت تھے لیکن وہ چار پانچ بندے جو سب سے آگے تھے اور ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ اس وقت ڈیرے پر ہیں۔ شیدا چدھڑ گاؤں میں ہے۔ شاہ زیب نے تیرے گھر کو جلانے کی ذمے داری اس کو دی تھی۔"

"کیا اس وقت وہ گھر پر ہوگا؟" میں نے پرجوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......! وہ گھر ہی ہے' باقی ڈیرے پر ہیں۔"

جانی شوکر نے مجھے بتایا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"چل جانی......! تو مجھے گاؤں کے باہر چھوڑ دینا' سامنے مت آنا' باقی میں سب دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔

جانی شوکر مجھے گاؤں کی نکڑ پر اتار کر چلا گیا۔ صبح صادق کا نور ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور میں تیز تیز قدموں سے شیدے چدھڑ کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند گلیاں پار کر کے میں اس کے گھر کے سامنے تھا۔ میں یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ گھر پر ہے بھی یا نکل گیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اپنی بائیک پر باہر نکلا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا پسٹل نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر اس کی ٹانگوں میں دے مارے۔ وہ اس اچانک افتاد پر گھبرا گیا اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے سر پر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کے ساتھ حیرت جمی ہوئی تھی۔ وہ چیخنا بھول گیا اور کراہنے لگا۔ صبح ہی صبح فائرنگ کی آواز سے نور نگر گونج اٹھا تھا۔ یہ تو اب ممکن ہی نہیں تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے نہ نکلتے' وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کی بائیک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گر گئی تھی۔ میں نے اسے جا کر بالوں سے پکڑ لیا اور انتہائی غصے میں کہا۔

"تو نے میرے گھر کو آگ کیوں لگائی؟"

"سردار...... نے کہا...... معاف کر دو...... میں......" وہ انتہائی مشکل سے بول رہا تھا۔ اتنے میں اس کے گھر کے اندر سے اس کی بیوی اور بچے نکل آئے۔ اس نے اپنے شوہر کی حالت دیکھی تو چیخ مار کر بڑھی۔

"خبردار! کوئی آگے بڑھا تو گولی مار دوں گا۔" میرے یوں کہنے پر وہ وہیں رک گئی۔ گاؤں کے ہر بندے کو خبر تھی کہ شیدے چدھڑ نے کیا جرم کیا ہے تو اس کی بیوی کو کیوں معلوم نہ ہوتا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس کے سر پر سوار کیوں ہوں۔ سو وہ منتوں پر اتر آئی۔

"خدا کے لیے اسے معاف کر دو...... اس سے غلطی ہو گئی...... ہم تیرا سارا نقصان پورا کر دیں گے۔" وہ چیخ رہی تھی۔ گلی کے لوگ نکل کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گلی کے درمیان میں لے آیا اور پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند لمحوں ہی میں وہ بے دم ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ تب میں نے پسٹل سیدھا کیا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی جوان بیٹی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نہایت آزردہ لہجے میں روتے ہوئے کہا۔

"میرے باپ کو معاف کر دو......"

میں نے ایک لمحہ اسے دیکھا' پھر پسٹل ہٹاتے ہوئے کہا۔

"جا بیٹی' تیرے صدقے معاف کیا۔"

یہ کہہ کر میں پلٹا' اس کی بائیک اٹھائی اور کسی کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ میرا رخ دلبر کے ڈیرے کی طرف تھا۔ جہاں مجھے جانی شوکر نے ملنا تھا۔ وہ میرا ناشتہ لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے ناشتہ کیا' شیدے چدھڑ کے بارے میں اسے بتایا تو وہ بولا۔

تو اکیلا کب تک ان کے ساتھ لڑتا رہے گا۔ چند بندے تیرے ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"یار بندے اکٹھے کرنے کو تو میں ایک گھنٹے میں کر لوں' پتہ نہیں کون کون علاقے بھر میں میرے انتظار میں بیٹھا ہوگا' مگر میں ان میں سے کسی کا بھی نقصان نہیں چاہتا' اب میری اور شاہ زیب کی جنگ شروع ہو گئی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں جمالے! تو اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا' تجھے ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی' میں بہت سارے ایسے شہ زوروں کو جانتا ہوں جو شاہ زیب کے مخالف ہیں انہیں ساتھ......"

"جس طرح سانپ اور شیر کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا کہ وہ جنگل میں کب اور کہاں مل جائیں' اسی طرح میرے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں ہوں' لوگوں کی بھیڑ تو ہر وقت نشانہ ہی کرتی رہے گی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جیسے تیری مرضی' پر ایک اکیلا اور دو گیارہ ہی ہوتے ہیں۔" جانی شوکر نے دوبارہ مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ میں اسے اب کیا بتاتا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے' مجھے خود سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی' اتنے لوگوں کو کہاں رکھتا۔ میں نے یہی بات جب جانی شوکر کو سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"واہ......! جمالے واہ! شاہ زیب نے تیرا ٹھکانہ چھین لیا تو اس کا چھین لے۔ حویلی پر قبضہ نہیں کر سکتا نہ کر' کم از کم اس کا ڈیرہ تو تیرے قبضے میں ہو۔ پھر دیکھنا کتنے لوگ تیرے ساتھ آ کر شامل ہوتے ہیں۔ ان جاگیرداروں' زمینداروں کے ظلم و ستم کے ستائے نہ جانے کتنے لوگ اپنے دل میں غصہ دبائے بیٹھے ہیں۔ ناراض مت ہونا' میں کوئی تیری محبت میں تیرا ساتھ نہیں دے رہا' بلکہ میرے دل میں ان بے غیرت جاگیرداروں کی نفرت تیری مدد پر مجبور کر رہی ہے۔"

"چل پھر اٹھ' آر یا پار' ڈیرے پر قبضہ جماتے ہیں' یا پھر ہم نہیں...... بول کیا کہتا ہے؟" میں نے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔
''چل...... پہلے گاؤں چلتے ہیں وہاں سے کچھ اسلحہ لے لیں ممکن ہے میرے دو چار بندے بھی ساتھ ہو جائیں۔'' ہم دونوں ڈیرے پر سے اٹھے اور اپنی اپنی بائیک پر گاؤں چلے گئے۔ سورج کی روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ میرے گاؤں میں داخل ہوتے ہی لوگ مجھے یوں دیکھنے لگے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ ظاہر ہے انہیں شیدے چدھڑ کے بارے میں پتہ چل گیا ہوگا۔ میں نے کسی کی پروا نہیں کی اور نہ ہی کسی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی۔ جانی شوکر اپنے گھر سے دو گنیں اٹھا لایا تھا۔ میں نے پسٹل کے لیے کچھ فاضل راؤنڈ بھی منگوا لیے تھے۔ ہم صرف دو تھے اور ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ڈیرے پر کتنے لوگ ہوں گے۔ مجھے جانی شوکر کا حوصلہ دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ہی ڈیرے کی جانب چل نکلے۔
گاؤں سے نکل کر ہم پکی سڑک پر آ گئے۔ صبح کے وقت لوگ اپنے اپنے کام کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ان کے قریب سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہوئے اس کچی سڑک پر آ گئے جہاں سے ڈیرے کی طرف جایا جاتا تھا۔ ہم تیزی سے ڈیرے کے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ ڈیرے سے دو تین ایکڑ کے فاصلے پر رک گئے۔ تبھی میں نے جانی سے کہا۔
''میں ڈیرے کی پچھلی طرف سے اندر جاتا ہوں' پہلے چھت پر جاؤں گا اور پھر اندر اتروں گا۔ تم تیار رہنا' جیسے ہی اندر سے گولی چلنے کی آواز آئے' تم دروازے کی طرف سے اندر آنا' جو بھی سامنے آئے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بنا گولی مار دینا' ورنہ وہ تجھے گولی مار دے گا۔''
''سمجھ گیا۔'' اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
میں نے بائیک وہیں کھڑی کی اور تیزی سے ڈیرے کے پچھواڑے چلا گیا' جہاں سے میں ایک بار پہلے بھی چھت پر گیا تھا۔ اس وقت تو اندھیرا تھا' اس لیے بہت محتاط تھا۔ لیکن اب دن کے وقت سب کچھ صاف تھا۔ میں تیزی سے چڑھتا چلا گیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے منڈیر سے نیچے جھانکا' صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنے لوگ ہوں گے۔ میں نے چھت پر سے گھوم کر نیچے اندازہ لگانے کی کوشش کی' برآمدے میں بھی مجھے کوئی بندہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں کوئی ہلچل نہ پا کر مجھے الجھن ہونے لگی۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا' جانی نے مجھے پکی خبر دی تھی کہ اندر پانچ سات بندے تو ہیں۔ جنہوں نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی۔ میں کئی منٹ تک تذبذب کا شکار رہا' میں انتظار کروں یا نیچے جاؤں' یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ڈیرہ خالی ہو۔ میں نے انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تقریباً پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد ایک بندہ برآمدے میں سے وارد ہوا اور وہ ٹہلنے والے انداز میں باہر کی طرف جانے لگا' میں مزید صبر نہ کر سکا اور میں نے اس پر فائر داغ دیا۔ اس کی چیخ فضا میں بلند ہو گئی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس پر فائر کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے شانے کے قریب کا نشانہ لیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ مچھلی کی مانند تڑپتا ہوا زمین پر آ رہا۔ تقریباً دو منٹ کے اندر اندر چھ سات بندے برآمدے کی مختلف اطراف سے برآمد ہوئے' اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھتے میں نے ان پر فائر کھول دیا۔ تبھی دروازے کی طرف سے جانی اندر داخل ہوا' اس نے اپنے سامنے ان بندوں کو پا کر گن سے فائر کرنا شروع کر دیا۔ کس کے کہاں گولی لگتی ہے یہ قطعاً اندازہ نہیں

تھا۔ وہ تقریباً سارے ہی خون میں لت پت صحن میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اندر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اب مزید کتنے بندے اندر ہیں۔ میں جانی کو نیچے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا' اس لیے آناً فاناً سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے صحن میں آ گیا۔ پہلے وہ میرے فائر کی زد میں تھے اب کوئی بھی گولی کسی بھی کمرے سے میرے بدن کو چاٹ سکتی تھی لیکن یہ رسک لینا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا تو چاچا بیرو کچن کے دروازے کے پیچھے چھپا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے جانی کو چھپنے کا اشارہ کر کے سیدھا چاچے بیرو کے پاس چلا گیا۔ صحن میں چیخ و پکار اور کراہیں اٹھ رہی تھیں۔
''ان کے علاوہ کتنے بندے ہیں اور کہاں ہیں؟''
''وہاں ہیں۔'' چاچے بیرو نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دائیں طرف کا ایک لمبا کمرہ تھا۔ میں نے اسے نگاہوں میں رکھتے ہوئے جانی کو اشارہ کیا وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس کے دروازے کے ساتھ جا لگا۔ صحن میں پڑے زخمی بندے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اپنی بقا کے لیے تو بلی بھی گلے پڑ جاتی ہے وہ تو پھر سمجھ بوجھ والے انسان تھے۔ میں ان کے سر پر جا کھڑا ہوا اور زور سے پکار کر پوچھا۔
''تم میں نے کس کس نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی......؟''
ان میں سے کوئی نہیں بولا بلکہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں دہشت کے ساتھ ساتھ وحشت بھی دکھائی دے رہی تھی۔
''ہمیں...... معاف...... معاف کر دے۔'' ان میں سے ایک تنومند بندے نے کہا۔
''اس کی ایک ہی صورت ہے' تم میں سے جو بھاگ کے یہاں سے جا سکتا ہے وہ چلا جائے' جو نہ جا سکا اس کی قبر یہیں اس ڈیرے میں بنی ہو گی۔ میں دس تک گنوں گا...... ایک......''
انہوں نے ناقابل یقین انداز سے میری طرف دیکھا' پھر ان میں ہلچل آ گئی۔ وہ کل سات لوگ تھے۔ ایک بے ہوش پڑا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔
''دو......''
ان میں تیزی آ گئی۔ اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ دو لوگوں نے بے ہوش بندے کو ڈنڈا ڈولی کیا اور باہر کی جانب چل پڑے۔
''چار...... پانچ...... چھ......''
وہ ڈیوڑھی کے پاس پہنچ گئے۔
''آٹھ......''
وہ دروازہ پار کر گئے۔ تب میں نے اس کمرے کی طرف توجہ کی' جدھر چاچے بیرو نے اشارہ دیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر ہی سے جھانک کر دیکھا' اندر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ میں نے جانی کو باہر کا دھیان رکھنے کو کہا اور ایک دم سے اندر چلا گیا۔ اندر سے ذرا بھی مزاحمت نہیں ہوئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک کونے میں دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی بندھے ہوئے پڑے تھے' ان کی آنکھوں میں خوف تیر رہا تھا اور وہ سہمے ہوئے تھے۔ جلدی سے باہر آ گیا۔ میں نے جانی کو بتایا تو اس نے کہا
''تُو ان سے پوچھ کہ یہ کون ہیں۔ میں دروازہ بند کر کے آتا ہوں۔''
''نہیں' دروازہ بند نہیں کرنا' بلکہ چھت پر چلا جا''

دور دور تک دشمن کے بارے میں پتہ چلے گا اور جو بندے ابھی باہر گئے ہیں انہیں دیکھ اگر کوئی گڑبڑ کریں تو گولی مار دینا' ابھی تو وہ صرف زخمی ہیں۔"

میری مزید بات سنے بغیر وہ سیڑھیوں کی جانب بھاگا' میں کمرے میں چلا گیا۔ اس بار میں نے ان "قیدیوں" کو دیکھا۔ ایک بوڑھا دیہاتی اور دونوں لڑکیاں بھی دیہاتی ہی تھیں۔ ایک لمبے قد کی' جس پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ گورا رنگ اور جسم کے نشیب وفراز سے کوئی بھی مرد متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری چھوٹے قد کی اور موٹے نقوش والی تھی' اس کا جسم قدرے بھاری تھا' میں نے انہیں رسیوں سے آزاد کیا اور بوڑھے سے پوچھا۔

"بابا..... کون ہو تم..... اور یہاں کیسے؟"

"میں بتاتی ہوں۔" اس لمبی لڑکی نے رندھے ہوئے انداز میں کہا۔ "رات ہی یہ لوگ ہمیں چک سندر سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

"کیوں.....؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے' یہی بوڑھا باپ ہے' ہماری تھوڑی سی زمین ہے' اور شاہ زیب وہ زمین ہم سے لینا چاہتا تھا۔ اب ہماری روزی روٹی وہی ہے تو کیا کریں' کب تک زمین کے پیسے کھائیں گے' ہم نے انکار کیا تو....." اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"کوئی زیادتی تو نہیں کی....." میں نے پوچھا۔

"ہمیں مارا بہت ہے' باقی دھمکیاں دیتے رہے ہیں کہ عزت لوٹ لیں گے..... مگر ابھی....." اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"بابا..... تو یہاں بیٹھ' اور تم لوگ آؤ میرے ساتھ' ایک ایک کمرے کی تلاشی لینی ہے۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

"پر پتر..... تو ہے کون.....؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"میں کوئی بھی ہوں' لیکن تیری عزت کا رکھوالا ہوں۔ اب کوئی تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ آج ہی تجھے تیرے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

"اللہ سلامت رکھے تجھے۔" بوڑھے نے دعا دی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے تقریباً آدھے گھنٹے میں وہاں پر موجود ہر کمرہ دیکھ لیا' کوئی بندہ نہیں تھا' دو کمرے خاص اہمیت کے حامل تھے۔ ایک شاہ زیب کا کمرہ جس میں فون رکھا ہوا تھا' اور دوسرا اس کے ساتھ والا جہاں سے اسلحہ ملا تھا' پورا اطمینان کرنے کے بعد میں نے جانی کو بلا لیا۔ وہ نیچے آیا تو ساری صورت حال اس کو سمجھ آ گئی۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

"تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر وہاں جاؤ اور کھانا وانا کھاؤ..... اب یہ ڈیرہ ہمارے قبضے میں ہے۔ تم اطمینان رکھو' شام سے پہلے تم چک سندر پہنچ جاؤ گے۔ جاؤ۔" اس کے یوں کہنے پر وہ لڑکیاں تیزی سے واپس اسی کمرے میں چلی گئیں۔ میں شاہ زیب کے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلی فون چل رہا تھا۔ میں نے پیرزادہ وقاص کے نمبر ملائے' کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال بتائی' جسے سن کر وہ بولا۔

"واہ.....! اب تو شاہ زیب واپس نہیں آئے گا وہ تو بھاگتا پھر رہا ہے تاکہ پولیس تجھے گرفتار کر لے۔"

"تجھے کیسے پتہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پوری کوشش کر کے ڈی ایس پی کا تبادلہ کروا رہا ہے۔ وہ اعلیٰ حکام کے سامنے بیٹھا رو رہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اب دیکھیں کیا بنتا ہے۔ خیر! میں بندے بھیجتا ہوں' آدھے پونے گھنٹے تک تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ تمہارے

تیرے دوست ہیں' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ گاڑی بھی آ رہی ہے۔ اس پر ان لڑکیوں اور بابے کو بھیج دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اور ہاں..... اس ڈیرے میں آج دن تک یا رات..... بس اس سے زیادہ نہیں رہنا' خطرناک ہو گا۔" اس نے مجھے سمجھایا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے اسے باور کرایا۔

"پھر اپنا ٹھکانہ چوہدری شاہنواز کے ڈیرے پر....." اس نے مجھے بتا دیا کہ آئندہ کیا کرنا ہے' میں نے الوداعی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا۔ میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا' لیکن جیسے ہی مجھے شاہ زیب کا خیال آتا' میرے اندر نفرت اور غصے کی لہریں سر ٹکرانے لگتیں۔



جسپال رات کے پہلے پہر ہی جالندھر جا پہنچا تھا۔ اوگی پنڈ سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں انوجیت ہی کا خیال تھا کہ بعد میں پولیس انہیں تنگ کرے گی وہ تو پہلے ہی عتاب کا شکار ہیں۔ دوسرا اس کے دماغ پر ہرپریت کور چھائی ہوئی تھی۔ وہ زخمی حالت میں گھر پر پڑی تھی۔ ایسے میں اگر پولیس والے انہیں تنگ کرتے تو اس گھرانے کے لیے بہت مشکل پیدا ہو جانے والی تھی۔ یہ سب ظلم اس کی وجہ سے ان پر ہونے والے تھے۔ اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ یوں بھاگ کر وہاں سے نکلے' لیکن کیشیو مہرہ کا فون آ گیا تھا' اس نے یہی زور دیا تھا کہ جس قدر جلد وہ اوگی سے نکل سکتا ہے نکل آئے' بعد میں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ وہ کیشیو مہرہ کے اصرار پر اوگی سے نکل تو آیا تھا مگر اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ مشکل وقت میں وہ انوجیت اور ہرپریت کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اوگی پنڈ سے چند کلو میٹر باہر آ جانے تک وہ یہی سوچتا رہا' پھر ایک جگہ اس نے بریک لگا کر گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ وہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ جالندھر جائے یا نہیں۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

"او جسپال..... جالندھر پہنچے ہو یا نہیں؟"

"نہیں' راستے میں کھڑا ہوں' میرا دل نہیں کر رہا ہے جالندھر جانے کو' میں واپس آنا چاہتا ہوں۔" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہے پاگل..... اوئے وہ کیوں؟"

"تو اور ہرپریت اکیلے ہو' پھوپھو..... میں اتنے مشکل وقت میں تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جاؤں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"او نہیں اوئے جسپال' ایسے مت سوچ' یہ حالات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم نے اس سے بھی مشکل اور سخت حالات دیکھے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوتے تو اب تک زندہ ہی نہ ہوتے۔ ان کی جرات نہیں کہ ہماری طرف انگلی بھی اٹھا سکیں۔" اس نے کافی سخت لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں....." جسپال نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

"تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے اور یہ صرف چند دن کی بات ہے' بات پولیس کی نہیں یہاں کے غنڈوں کی ہے' میں نے اپنے لوگ بلوا لیے ہیں' اس کی تم فکر مت کرو' میری پوری کوشش ہے کہ معاملہ قانونی بن جائے' پولیس والے پریال سنگھ وغیرہ کو چھوڑ رہے ہیں لیکن وہ حوالات سے باہر نہیں آ رہے ہیں کیونکہ انہیں غیر قانونی طور پر پکڑا ہے'

پولیس والوں کو گمان بھی نہیں تھا کہ تم بلجیت کے ساتھ ایسا کردو گے۔ کچھ دیر بعد اوگی میں بہت سارے لوگ پہنچ رہے ہیں۔ کیشیو مہرہ بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آ رہا ہے تم بس دو چار دن کے لیے اپنے آپ کو محفوظ کرلو۔" انوجیت نے پوری تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر جیسا تم چاہو۔ میں رابطے میں رہوں گا۔" انوجیت نے کہا' چند منٹ باتوں کے بعد اس نے فون بند کردیا۔ فون بند ہوا ہی تھا کہ کیشیو مہرہ کا فون آ گیا۔

"میں جالندھر نکودر روڈ پر ہوں' تم کہاں ہو؟"

"میں بھی اسی روڈ پر جالندھر آ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' میری سرخ گاڑی ہے' میرے ساتھ دو تین گاڑیاں اور بھی ہیں۔ راستے میں ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ جسپال نے گاڑی بڑھادی۔ تقریباً دس منٹ سفر کے بعد اسے دور ہی سے سرخ گاڑی دکھائی دی۔ جسپال نے فون پر بتادیا کہ میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اگلے ایک منٹ میں وہ دونوں سڑک پر رک چکے تھے۔ سرخ گاڑی سے کیشیو مہرہ باہر نکلا تو اس کے ساتھ سارے لوگ باہر آ گئے۔ جسپال بھی باہر آ گیا تو کیشیو مہرہ نے کہا۔

"جسپال! تم اپنی گاڑی چھوڑ کر اس سرخ گاڑی میں آ جاؤ اور اپنی گاڑی ہمیں دے دو' یہاں سے دشمنوں کے لیے تمہارا سراغ ختم ہوجانا چاہیے۔ تم دو دن سکون کرو' پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے' بلجیت کے بارے میں اطلاعات چندی گڑھ سے دہلی تک پہنچ گئی ہیں۔ بہت احتیاط کرنا۔"

"او کے۔" جسپال نے کہا اور اپنی گاڑی سے پسٹل کے علاوہ دوسری چیزیں نکال کر سرخ گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس نے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا تو اس کی نگاہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی' وہ جیسے ہی بیٹھا' لڑکی نے گاڑی بڑھادی۔ پھر تیزی سے یوٹرن لے کر واپس جالندھر کی جانب چل دی۔ جسپال نے بیک مرر میں دیکھا' کیشیو مہرہ کی گاڑیاں بھی چل پڑی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا تھا۔ تبھی ڈرائیونگ کرتی ہوئی لڑکی نے کہا۔

"ہائے جسپال! نمریتا نام ہے میرا۔ نمریتا کور..... اب چونکہ دو چار دن ہم نے ساتھ ہی رہنا ہے' اس لیے تعارف ابھی ہوجائے تو اچھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ جسپال کی طرف بڑھادیا۔ گلابی بھرا بھرا ہاتھ اس کے سامنے تھا۔ تبھی اس نے نمریتا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے غور سے دیکھا' سفید گول چہرہ جس پر موٹے نقوش تھے' آنکھیں خاصی بڑی اور بال گھنگھریالے تھے۔ خاص طور پر اس کے گال بہت سرخ تھے۔ بھرے بھرے نرم بدن پر گلابی ٹی شرٹ اور نیلی جین تھی' اس کی رانیں بہت موٹی اور بھاری تھیں۔ پاؤں میں سفید سینڈل' جسپال نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کیسی لگی ہوں میں؟"

"کس حوالے سے؟" جسپال نے شوخ سے انداز میں سوال کردیا۔

"پہلی نگاہ میں دیکھنے کے حوالے سے' باقی خوبیاں تو شاید بعد میں کھلیں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"اچھی ہو' امید ہے کہ اچھی دوست بھی ثابت ہوگی۔" جسپال نے کہا۔

"وہ تو ہوں۔ خیر.....! کیشیو جی نے کہا ہے کہ آپ نے کم از کم چار دن تک باہر نہیں نکلنا اور اتنے

دن گھر میں رہنے کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ کیا پسند ہے آپ کو' اس کا بندوبست کردیا جائے گا۔"

"کچھ نہیں' بس تم ڈرائیونگ پر دھیان دو' باقی باتیں بعد میں۔" اس نے کہا اور سڑک پر دیکھنے لگا۔ نمریتا نے کاندھے یوں اچکائے جیسے اس کی بات کو وہ نظر انداز کرچکی ہو۔ پھر گاڑی کی اسپیڈ تیز کردی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جالندھر شہر میں داخل ہوگئے لیکن پریتم کالونی تک جاتے ہوئے انہیں آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ لگ گیا۔ یہ شہر کا وہ علاقہ تھا جہاں پرانے انداز کی رہائشی عمارتیں تھیں۔ تقسیم کے بعد یہی پوش علاقہ مانا جاتا تھا۔ اب آبادی کے بے تحاشہ بڑھنے کی وجہ سے وہ اندرون شہر میں آ گیا تھا۔ اس لیے اس علاقے میں کافی رش تھا۔ ایک بڑے سارے گھر کے وہ سامنے رکی' پھر ہارن کے جواب میں چوکیدار نے گیٹ کھولا تو وہ اندر چلا گیا۔ رات کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری منزل پر ایک کشادہ بیڈروم میں اسے بٹھا کر نمریتا غائب ہوگئی تھی۔ کافی دیر بعد وہ آئی تو اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ نازک سی' تیکھے نقوش والی' اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ نمریتا اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جو کھانے میں پسند ہے اسے بتادو...... یہ بنادے گی۔"

"جو مل جائے۔" جسپال نے پرسکون لہجے میں کہا تو نمریتا نے اسے کہا۔

"جاؤ......! جو تمہاری سمجھ میں آتا ہے بنالو' بازار سے منگوالو...... لیکن کھانا بہت اچھا ہونا چاہیے۔"

یہ سنتے ہی وہ لڑکی واپس چلی گئی تو نمریتا اسے یوں بیٹھا دیکھ کر بولی۔ "جسپال......! یار کیا سوگوار سے بیٹھے ہو۔ جاؤ' جا کر فریش ہوجاؤ' پھر کھانا کھا کر جو چاہے کرنا۔ او کے۔"

اس پر جسپال نے اسے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اٹھ کر واش روم کی طرف چلا گیا۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ جسپال کو سکون نہیں آ رہا تھا' نمریتا گپ شپ لگا کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ اس کا سارا دھیان اوگی کی طرف تھا۔ جہاں سے ابھی تک اسے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس نے خود اس لیے رابطہ نہیں کیا تھا کہ نجانے وہ کس طرح مصروف ہوں گے اور وہ انہیں ڈسٹرب کرے۔ یہی سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ہرپریت سے بات کرے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سیل فون اٹھایا' ہرپریت کے نمبر ڈائل کردیے۔ دوسری بیل پر اس نے فون اٹھالیا۔

"کیسے ہو جسپال؟"

"میں ٹھیک ہوں...... تم سناؤ۔"

"میں بہت خوش ہوں۔ تم نے بلجیت کو جس بے رحمی سے مارا' اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی' وہ تھا ہی اس قابل' جالندھر ہی کے کسی اسپتال میں ہے۔ امید نہیں ہے کہ وہ بچے گا۔"

"چلو اچھا ہے' لیکن میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے۔ مگر اپاہجوں والی زندگی گزارے' سناؤ ابھی تک انوجیت نہیں آیا؟"

"گھر آ کر پھر گیا ہے' کسی جگہ کوئی بہت بڑی پنچائیت ہے' سنا ہے کہ اس میں رویندر سنگھ بھی آئے گا۔ یہ لوگ چاہ رہے ہیں کہ اسے سیاسی ایشو بنایا جائے' لیکن انوجیت لوگ چاہ رہے ہیں کہ یہ قانونی مسئلہ بنے۔ حویلی جلانے پر ہی یہ واقعہ پیش آیا' میرے خیال میں' یہاں پنچائیت میں اس معاملے کو

ٹھپ دیا جائے گا' اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"
"معاملہ وقتی طور پر دبے یا نہیں' مجھے تم لوگوں کی فکر ہے۔ وہ کہیں قانونی شکنجے میں......"
"نہیں جسپال نہیں! تم ہماری فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔"
"میں تمہیں بہت مس کررہا ہوں۔" اس نے اپنے دل کی بات کہی۔
"کاش میں تمہارے پاس ہوتی۔" اس نے بھی کہہ دیا۔ تو دونوں کافی دیر تک یونہی گپ شپ کرتے رہے' پھر جسپال نے فون بند کیا اور سوگیا۔
صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو نمریتا اس کے ساتھ بیڈ پر پڑی سو رہی تھی۔ اس نے مہین سی نائٹی پہنی ہوئی تھی' جس میں اس کا سارا بدن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو جسپال چکرا گیا کہ یہ اس قدر بولڈ ہوکر میرے ساتھ کیوں پیش آرہی ہے' کیا ایسا سب کچھ کرنے کے لیے اسے کہا گیا ہے یا یہ خود سے ہی ایسا کررہی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ باتھ روم میں گیا۔ اچھی طرح فریش ہونے کے بعد جب وہ واپس آیا تو نمریتا جاگ رہی تھی۔
"صبح بخیر جسپال......! میرے خیال میں تمہاری رات بہت اچھی گزری ہے۔"
"ہاں......! لیکن یہ تم کیا دکانداری چمکائے ہوئے ہو۔ جاؤ' کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آؤ۔" اس نے نمریتا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔
"اوہ......! یہ کہتے ہوئے وہ خود میں سمٹ گئی۔ حالانکہ ایسے سمٹنے سے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔" وہ دراصل میں آئی تھی کہ تم سے اوگی کے بارے میں بات کروں' مگر تم سو رہے تھے۔"
"ہاں بولو...... کیا ہے اوگی کے بارے میں......"

اس نے تجسس سے پوچھا۔
"رات گئے تک وہاں پنچائیت چلی ہے' جس میں بلجیت سنگھ کا باپ رویندر سنگھ اور پولیس کے اعلیٰ حکام بھی تھے۔ ظاہر ہے کیشیو مہرہ کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے' انوجیت کے بھی لوگ تھے۔"
"بنا کیا' وہ بتاؤ۔" میں نے تنگ آکر کہا۔
"کسی فیصلے کے بغیر وہ پنچائیت ختم ہوگئی لیکن یہ ثابت ہوگیا کہ بلجیت سنگھ کی شرارت کے باعث یہ حادثہ ہوا۔ اس کے بارے میں دلبیر سنگھ نے گواہی دی تھی۔ پولیس نے یہ کیس رجسٹرڈ کرلیا ہے۔ چوکی انچارج معطل ہوگیا ہے۔ اب کیس عدالت میں چلے گا' لیکن تمہاری گرفتاری کے بعد......" نمریتا نے کہا تو وہ بولا۔
"اوہ...... خیر کوئی بات نہیں' وہ تو میری ضمانت ہوجائے گی۔"
"ہاں' اس کے لیے آج کوشش کی جائے گی' نکودر میں' لیکن اگر بلجیت نہ رہا تو صورت حال تبدیل ہوجائے گی' اس کے بارے میں اطلاع یہ ہے کہ وہ بچتا دکھائی نہیں دیتا۔"
"چلو جو بھی ہوگا وہ دیکھا جائے گا' تم جاؤ اور ناشتہ بھجواؤ' میں مزید تفصیل معلوم کرتا ہوں۔ نمریتا اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر اس موجودہ صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا' کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہیں۔ جسپال نے اس وقت انوجیت کو فون کیا۔ وہاں سے بھی یہی معلومات ملیں جو نمریتا اسے دے چکی تھی۔ وہ کچھ دیر گپ شپ کے بعد رابطہ منقطع کرچکے تو ناشتے کے لیے بلاوا آگیا۔
اس وقت نمریتا اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ مقامی کالج میں پڑھنے کے بعد اب آزاد ہے'

...نے چاچا کے ساتھ رہتی تھی' سا کا چور اسی ہی میں ...کے والدین بھی مارے گئے۔ وہ اس لیے بچ گئی ...وہ ان دنوں گاؤں میں اپنے چاچا کے پاس ہی ...۔ اس کے دو بھائی بھی اس ظلم کی نذر ہوگئے۔ ...ہی سے یہ غصہ اس کے اندر تھا' اس نے باقاعدہ ...م کے ساتھ فریڈیم موومنٹ کو جوائن کیا اور اس ...لیے کام کرتی رہی' پھر ایک بار پولیس کے ہتھے ...ھ گئی۔ مگر کوئی جرم ثابت نہ ہوا۔ تب سے وہ پوری ...ح اپنی تنظیم کے ساتھ چل رہی ہے۔ بظاہر وہ ایک ...پنی میں جاب کررہی تھی۔ وہ باتوں میں مصروف ...ے کہ کیشیو مہرہ کا فون آگیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی ...ں کے بعد اس نے کہا۔
"جسمیند ر تم سے نیٹ پر رابطہ چاہتا ہے' نمریتا ...ے کہو' تمہیں لیپ ٹاپ دے۔"
"اوکے......! میں کہتا ہوں۔"
"پھر جو بھی صورت حال ہو' مجھے بتانا' میں ...ندھر ہی میں ہوں اور تمہاری ضمانت کی کوشش نکودر ...ں ہورہی ہے ورنہ پھر یہاں......"
"اوکے......!" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔
...ں نے نمریتا سے لیپ ٹاپ لانے کو کہا تو وہ اٹھ ...ئی۔ میرے دل میں اچانک تجسس بیدار ہوگیا۔ ...یونکہ جسمیند ر نے جو مجھ سے براہ راست بات کرنا ...ہی تھی' لازمی طور پر وہ بہت اہم تھی۔ ورنہ جہاں وہ ...یشیو کو یہ پیغام دے سکتا تھا وہاں دوسرا کوئی پیغام ...ی دے سکتا تھا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی تھی' اور یہ ...ے چینی اس وقت عروج پر تھی جب وہ لیپ ٹاپ ...ے کر آئی' اس نے نیٹ ساکٹ میں پلگ لگادیا۔
"نمریتا......! تم ایسا کرو' اچھی سی چائے بنا کرلاؤ۔" میرے یوں کہنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے

اکیلا چھوڑ دے۔ وہ سمجھ گئی اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔
کچھ دیر بعد میں آن لائن تھا اور خوش ہوگیا جب جسمیند ر کو بھی آن لائن دیکھا۔ اس سے باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔
"تم جانتے ہو کہ رویندر سنگھ کا ایک بیٹا چندی گڑھ میں ہے اور بزنس کرتا ہے۔"
"ہاں میں جانتا ہوں۔" یہ جواب دیتے ہی میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔
"وہ سیکٹر سولہ میں رہتا ہے' لیکن اس کا آفس وہاں سے دور مال روڈ پر ہے۔"
"یہ مجھے نہیں معلوم۔"
"میں تمہیں معلومات دے رہا ہوں۔ اسے ذہن نشین کرنے کے بعد صاف کردینا کمپیوٹر سے' تم وہاں جاؤ اور اس کا پتہ صاف کردو۔"
"واؤ......!" میں نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔
"اس بار تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ جالندھر اور اس کے گردونواح میں تمہاری تلاش بہت شدت سے شروع ہوگئی ہے۔ صرف پولیس والے ہی تلاش نہیں کررہے بلکہ خفیہ والے بھی ہیں۔ یہاں معاملہ کیشیو مہرہ سے اوپر کا ہوگیا ہے۔ وہ نہیں سنبھال پائے گا۔ میں اس لیے بھی تمہیں جالندھر سے نکال رہا ہوں کہ وہ جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے بات مکمل ہوتے ہی چندی گڑھ کے لیے نکل جاؤ' تم کدھر جارہے ہو' اس بارے میں نمریتا کو بھی معلوم نہ ہو۔"
"ٹھیک ہے۔"
"میں تمہیں ایک تصویر بھیج رہا ہوں' یہ لڑکی تمہارے ساتھ ہوگی۔ یہ لڑکی تمہیں جالندھر اسٹیشن پر

ملے گی یا پھر چندی گڑھ اسٹیشن پر اس کا نمبر بھی میں بھیج رہا ہوں' میں پھر تمہیں کہہ رہا ہوں کہ بہت محتاط رہنا۔ ''معصوم سانپ'' کے ذاتی دوست تمہاری تلاش میں لگ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ وہ ڈیوٹی پر ہیں یا اپنے دوست کا انتقام لینے کے لئے بغیر ڈیوٹی کے ہیں۔ جالندھر سے نکلنا اب تمہاری اپنی صلاحیت پر ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے تم یہاں دھوکا کھا جاؤ' میرے بندوں کے چکر میں کہیں تم رویندر سنگھ کے بندوں کے ہاتھ ٹریپ نہ ہو جاؤ' کسی پر اعتماد کیے بغیر ابھی نکل جاؤ۔''

تصویر تو بھیجو۔''

کچھ ہی دیر بعد تصویر آ گئی۔ وہ خوابیدہ آنکھوں والی لڑکی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ابھی سو کر اٹھی ہو۔ سفید' گلابی اور پیلے پھولوں والی قمیص پہنے' کھلے گیسوؤں کے ساتھ' اس کے چہرے کی معصومیت دیدنی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی سنڈیکیٹ' ریکٹ یا خفیہ تنظیم کے ساتھ کام کرتی ہوگی' اس کا چہرہ دیکھ کر تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ معصوم سی اسکول ٹیچر ہو' جو سوئی چبھنے پر بھی واویلا مچا دے۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ جسے ایک بار دیکھا جائے تو وہ تادیر ذہن نشین رہے۔ اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر مجھے تازگی کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو میں بھول گیا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں اور کن الجھنوں میں گھرا ہوا ہوں۔

''اوکے گڈ لک جسپال......! چندی گڑھ پہنچو۔ وہاں باتیں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں ابھی نکلتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو وہ آف لائن ہو گیا۔ اس نے جو مجھے ضروری معلومات بھیجی تھیں' انہیں دیکھتے ہوئے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جسمیندر نے یہ بڑے اہم وقت پر میری توجہ اس طرف دلائی تھی۔ وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بلجیت سنگھ کا معاملہ حل ہوئے بغیر میں کوئی اور کارروائی کا سوچ سکوں گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پہلی بار جسمیندر نے مجھے اس قدر محتاط رہنے کا کہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے دی گئی تمام معلومات ختم کر دیں' میں نے چندی گڑھ نہیں دیکھا تھا' اور نہ ہی اس بارے میں اتنی معلومات تھیں۔ سنا تھا کہ وہ جدید شہر ہے' جسمیندر کی دی ہوئی معلومات میرے ذہن نشین ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے مجھے بھارتی ریلوے کا تجربہ نہیں تھا۔ اک نیا جہان میرے سامنے وا ہونے کو تھا۔ اس لیے میں اپنے بدن میں سنسنی محسوس کر رہا تھا' مجھے اب نمریتا کی نگاہوں سے بچ کر نکلنا تھا۔ فی الحال تو وہ چائے لینے گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے کیسے نکلوں' انہی لمحات میں جبکہ میں وہاں سے نکلنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ نمریتا حواس باختہ سی کمرے میں داخل ہوئی' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھولے ہوئے سانس کی وجہ سے کہہ نہیں پا رہی تھی' اچانک ہی میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔

(باقی آئندہ)

سنگ دل

انجم فاروق

عورت کی ذات عبارت ہے نرم و نازک جذبوں سے' وہ ہر روپ میں سراپا پیار و محبت ہوتی ہے۔ وہ ماں کے روپ میں جنت کی دیوی' بہن کے روپ میں بھائیوں کا مان' بیوی کے روپ میں سراپا ایثار و قربانی ہوتی ہے۔ مگر جب یہی عورت حرص اور جاہ حشمت کا شکار بن جائے تو وہ ڈائن کی طرح اپنے بچے کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

ایک سنگ دل عورت کا المیہ وہ دولت کی چاہ میں انسانیت سے کوسوں دور ہوگئی تھی۔

فوزیہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بجے کا ...تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر ...تابی سے باہر دیکھنے لگی۔ بیرونی بلب شاید فیوز ...تھا اس لیے سامنے تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ...سردی سے دھند بھی پھیل گئی تھی۔

اس کا خاوند فراز آج رات دیر سے آنے والا تھا۔ ...شورنس کمپنی میں بیمہ ایجنٹ تھا۔ وہ کرائے کے ...میں رہائش پذیر تھے۔ فراز کی شخصیت' انداز ...گفتگو اور مردانہ وجاہت سے متاثر ہو کر اس نے ...کر لی تھی لیکن وہ اس کی خواہشات پوری کرنے ...بالکل قابل نہیں تھا۔ آج اس کے اندر ہلچل سی ...ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صرف چند گھنٹوں کی ...ہے پھر قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو جائے ...

وہ بدستور کھڑکی کے شیشے سے باہر موبائل کی ...ڈالتے ہوئے روشنی میں ویران راستے کو گھور ...تھی۔ اس کی نگاہ بار بار گھڑی پر بے تابی سے اٹھ ...تھی۔ جیسے ایک منٹ اس کے لیے بے حد قیمتی ...اس وقت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں' اس کی ہم ...بہن نادیہ ٹیکسی سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ...کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ نادیہ گیٹ پر آ کر بیل بجانا چاہتی تھی کہ فوزیہ نے موبائل پر نادیہ سے کہا کہ گیٹ کھلا ہے۔ اندر چلی آؤ۔ نادیہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئی پھر گیٹ کو دھکیل کر اندر چلی آئی۔

وہ گیراج کے بعد برآمدے سے کاریڈور میں آئی پھر چلتے ہوئے فوزیہ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ فوزیہ نے اسے ایک قیمتی ہیرا دینے کے لیے بلایا تھا۔ نادیہ چونک کر رک گئی۔ اندر یک دم اندھیرا ہو گیا تھا۔ بس اس لمحے قیامت گزر گئی۔ بے چاری نادیہ کو چیخنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ فوزیہ نے بٹن دبایا کمرا جگمگا اٹھا۔

''بے چاری نادیہ! میں مجبور تھی' کروڑوں کے ہیرے اب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا' اب یہ سمجھ لیا جائے گا کہ فوزیہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میں ماحول کو حادثے کا' ڈکیتی کا رنگ دوں گی۔'' یہ کہہ کر فوزیہ نے بھاگ کر ہاتھ میں موجود لوہے کا ہتھوڑا جس سے نادیہ کا دماغ پھٹ گیا تھا اور خون کے چھینٹے اس پر دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اچھی طرح دھو کر اسٹور میں پھینکا اور پھر واپس کمرے میں آ کے اپنا لباس اتار کر رکھ دیا پھر جلدی جلدی خون سے آلود ہوئے بغیر ٹانگوں کی طرف سے نادیہ کا لباس اتار ڈالا اور تیزی سے اسے پہننے لگی۔ اپنا موبائل اس نے

کچھ فاصلے پر پھینک دیا۔ پھر نادیہ کا موبائل اپنے قبضے میں کیا۔ کمرے میں موجود میز اور کرسیاں الٹ دیں۔ الماری سے کچھ کپڑے بھی نکال کر بکھیر دیئے۔ لیمپ اور پی ٹی سی ایل فون کے اتار بھی اکھیڑ دیئے۔

اپنے کپڑے پھاڑتے ہوئے انہیں لاش سے کچھ فاصلے پر پھینک دیا۔ اب کمرہ فوزیہ کی لاش، جنسی زیادتی اور ڈکیتی کا منظر پیش کررہا تھا۔ الماری کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی اس نے ادھر ادھر گرا دی تھیں۔ اس نے نادیہ کے زیر جامے کو قینچی سے کاٹ ڈالا تھا۔ جان بوجھ کر قینچی کی نوک اس کی لان پر چبھوئی تھی۔ پھر اس کے سینے پر بھی قینچی سے لکیریں کھینچی تھیں۔

اس نے اپنی نقدی اور زیورات پرس میں ڈالے ہیروں سے بھرا ہوا بریف کیس اٹھایا' کمرے پر الوداعی نگاہ ڈال کے جلدی سے گھڑی پر نظر جمائی۔ ابھی ساڑھے دس بجے کا وقت ہوا تھا اور اجنبی ڈاکو جس نے اس کی اوپن چھت والی پرانی کار میں پولیس کا گھیرا دیکھ کر بریف کیس ڈال دیا تھا۔ وہ اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے اس کا نام اور پتہ معلوم کرچکا تھا۔ یہ دو دن قبل ہفتے کی رات کا واقعہ تھا۔ کل رات وہ دیر تک ہیروں سے بستر پر کھیلتی رہی تھی۔ فراز گزشتہ شب بھی لیٹ تھا' اس کے آفس میں میٹنگیں چل رہی تھیں۔ "کتنے خوبصورت سرخ' سبز' نیلے' پیلے فیروزی ہیرے ہیں۔ ان سے دنیا کے ہر عیش' آرام کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔"

فوزیہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خاوند فراز اس کے لیے بے حد بور ثابت ہوا تھا۔ اس کا رویہ بھی سرد اور خشک سا تھا پھر وہ اس کے باہر گھومنے پھرنے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ خود اس کے ساتھ کسی تفریح میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ پنجرے میں بند چڑیا بنانا چاہتا تھا۔ وہ اجنبی رات گیارہ بجے آنے والا تھا۔ اس نے اسے یہی وقت دیا تھا کہ وہ ہیرے امانت کے طور پر اس کے حوالے کردے گی۔ وہ اسے جو دینا چاہے وہ خوشی سے لے لے گی۔ فوزیہ شادی سے قبل ٹی وی آرٹسٹ بھی رہ چکی تھی اس سے قبل وہ ایک امیر ترین عورت کی سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دے چکی تھی۔ وہ عورت ہروقت ہیروں سے جگمگاتے ہوئے ہار' انگوٹھیاں اور ہیروں سے سجا ہوا ایک لباس بھی پہنا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر فوزیہ میں ہیروں کی سحر انگیز طلب پیدا ہوگئی تھی۔

فوزیہ ہیروں والا بریف کیس لیے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مکان سے دور ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ ایک خیال آنے پر ایک درخت کی آڑ میں رک کر اپنے گھر کی طرف دیکھنے لگی وہ اجنبی ڈاکو کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی تھی۔

اس وقت ایک دراز قد خوفناک چہرے والا آدمی جس کے چہرے پر زخموں کے بے ترتیب نشانات تھے کچھ دور اندھیرے میں ایک چھوٹی سی کار سے نیچے اترا اور ماحول پر ایک نگاہ ڈال کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا فوزیہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ فوزیہ نے اس کے نقوش ذہن نشین کرلیے۔ پھر وہ تیزی سے اقبال ٹاؤن کے بے ترتیب پلاٹوں سے گزر کر دوسری سڑک پر نکل آئی۔ جلد ہی اسے ایک رکشہ مل گیا جسے ایک نوعمر لڑکا چلا رہا تھا۔ فوزیہ اسے دوبئی چوک کے پاس واقع پاک بلاک فلیٹس کا کہہ کر سوار ہوگئی۔ اس نے اس وقت چہرے کو سیاہ نقاب میں چھپالیا تھا۔

دراز قد شخص ...... بلاک کے مطلوبہ گھر کا گیٹ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ماحول پر اندھیرے اور

سناٹے کی حکمرانی تھی۔ وہ نادیہ کی طرح چلتا ہوا فوزیہ کے کمرے میں داخل ہوا' کمرہ بھی تاریک تھا۔ اس نے موبائل کی لائٹ سے سوئچ بورڈ دیکھ کر بٹن دبایا۔ تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سامنے فوزیہ جس کی گاڑی میں اس نے گلشن اقبال کے پاس سے گزرنے والی بس کی کھڑکی سے چپکے سے بریف کیس ڈال دیا تھا۔ کیونکہ جیل سے کسی مجرم کے فرار ہونے پر سامنے ناکا لگا ہوا تھا اور وہ بس میں سوار تھا جو سیدھی ناکے کی طرف جارہی تھی۔ بس کے دروازے آج کل بند کردیئے جاتے تھے اور صرف اسٹاپ پر ہی انہیں وا کیا جاتا تھا' چنانچہ اس نے مجبوراً جان پر کھیل کر حاصل کیے جانے والے رنگین ٹکڑے اس کی کار میں ڈال دیئے تھے اور نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ ناکے پر لوگوں کے سامان کی تلاشی بھی لی جارہی تھی۔

وہ اب فرش پر مردہ پڑی تھی۔ اس کا سر پھٹا ہوا اور بھیجہ باہر نکلا ہوا تھا۔ لباس پھٹا ہوا بکھرا پڑا تھا۔ میز کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ اس نے منظر فراموش کر کے کمرے کی تلاشی لی لیکن بریف کیس نہ ملا' مکان خالی تھا۔ کوئی ڈاکو یا لٹیرا فوزیہ کو مزاحمت پر قتل کر کے بریف کیس لے گیا ہے۔ وہ کشمکش و پیچ اور غم کے عالم میں کمرے کے فرش پر بیٹھ کر پھیلی ہوئی نظروں سے مردہ فوزیہ کو دیکھنے لگا۔ پھر یکایک خطرے کا احساس ہوتے ہی اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا الٹے پیر باہر نکل کر سڑک پر بھاگنے لگا پھر وہ اپنی پرانی اور بھدی سی کار میں بیٹھ کر دور نکلتا چلا گیا۔

......☆☆☆......

رات کے دو بجے فراز سیٹی بجاتا گنگناتا ہوا گیٹ پر پہنچا۔ بیرونی بلب بجھا ہوا تھا۔ اس نے کال بیل بجائی لیکن گیٹ نہ کھلا۔ اس نے موبائل پر فوزیہ سے رابطہ قائم کیا لیکن اس کا موبائل بند تھا۔ اسے بے چینی کا احساس ہوا۔ اس نے گیٹ کو دھکیلا تو وہ کھلا تھا۔ فراز چونک پڑا اور تیزی سے اندر داخل ہو کر جلدی جلدی گیراج میں کھڑی فوزیہ کی پرانی اوپن کار کے پاس سے گزر کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہوش اڑ گئے وہ پھٹی پھٹی نظروں سے فوزیہ کی لاش دیکھنے لگا۔ اس نے بکھرے ہوئے سامان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی پھر فوراً بعد ہی دوبئی چوک پولیس اسٹیشن کو فون کیا۔ ایک گشتی کار جلد ہی اس طرف آگئی۔ پولیس نے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے سارے بلب روشن کردیئے۔ لاش والے کمرے سے انگلیوں کے نشانات اٹھائے گئے' ہلکی گرد پر قدموں کے نشانات بھی دیکھے گئے۔ جو ایک اجنبی کے تھے اس کے علاوہ لیڈیز جوتوں کے نشانات بھی تھے جنہیں فوزیہ کے نشانات سمجھا گیا۔ اتفاق سے نادیہ کے جوتے کا ڈیزائن بھی فوزیہ سے ملتا جلتا ہی تھا۔ جس سے دہری موجودی کی طرف

انمول جواہر

پریشانی میں پریشان ہونا پریشانی سے زیادہ خراب ہے۔
(حضرت علیؓ)

خدا کے نزدیک سے سے پیاری بات والدین کی اطاعت ہے۔
(حضرت جنید بغدادیؒ)

جس میں برداشت کی قوت ہو وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔
(لقمان)

میں نے خدا کو ارادوں کے ٹوٹ جانے اور عقدوں کے حل ہوجانے سے پہچانا ہے۔
(حضرت علیؓ)

زبان کو شکایت سے بند کرو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

(مرسلہ: **محمد عثمان**...... کراچی)

خیال نہ جا سکا۔ پولیس کے خیال میں یہ آبروریزی اور ڈکیتی کی واردات تھی۔ فراز اپنے بیڈ روم میں لٹکتی فوزیہ کی تصویر اتارنے لگا۔ شاید وہ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اس نے تصویر بے دلی سے الماری میں ٹھونس دی اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بار بار نادیہ کو موبائل پر اطلاع کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا فون بند تھا۔ پولیس نادیہ کے فلیٹ پر گئی لیکن فلیٹ مقفل تھا۔

فوزیہ اس وقت ہیروں سے بھرا بریف کیس نادیہ کے گندے اسٹور روم میں چھپا کر جہاں سڑاند اور بلی کے پاخانے کی بو پھیلی ہوئی تھی خود اس وقت پلازہ سینما میں جیمز بانڈ کی نئی فلم دیکھ رہی تھی اور خود کو لیڈی بانڈ ہی تصور کر رہی تھی۔

وہ فلم کا آخری شو دیکھ کر باہر نکلی اور پھر اس نے اپنا موبائل فون آن کر لیا۔ اس وقت اسے فراز کا پیغام ملا کہ فوزیہ قتل کر دی گئی ہے فوراً پہنچو۔ فوزیہ وہیں سے رکشہ لے کر فراز کے گھر پہنچی اور نادیہ کے لب و لہجے میں اظہار افسوس کیا پھر آنسو بہائے۔ واویلا کیا کہ بہن بہت اچھی تھی۔ پولیس اس کی اداکاری سے متاثر ہوئی۔ دونوں بہنوں میں بڑا سلوک اتفاق معلوم ہوتا تھا۔

''نادیہ تم نے دو تین گھنٹے موبائل کیوں بند رکھا۔'' فراز نے نادیہ کی حالت سنبھلتے ہی سوال کیا۔ ''بس فراز بھائی کچھ ناپسندیدہ فون کالز آ رہی تھیں اس لیے میں نے فون بند کر دیا تھا۔ دولڑکے مجھے ستا رہے تھے۔''

''تمہارے اور فوزیہ کے درمیان کوئی فرق ہے تو بتاؤ؟'' فراز نے اس پر نظریں جما دیں۔ ''نہیں میں اور فوزیہ ہو بہو ایک ہیں حتیٰ کہ آواز میں بھی بے حد مشابہت ورثے میں ملی تھی۔'' فوزیہ نے کھانستے ہوئے اسٹرپسلز کی گولی چوسنی شروع کر دی۔

''آپ دونوں کی عہد جوانی کی کوئی مشترکہ تصویر ہے تو ہمیں فراہم کر دیجیے۔'' تفتیشی افسر انسپکٹر سرفراز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تلاش کرنا پڑے گی شاید ایک ادھ مل جائے۔'' فوزیہ نے مگرمچھ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ عرصہ ٹی وی آرٹسٹ بھی رہ چکی تھی اس لیے اس کے چہرے کے تاثرات بالکل حقیقی معلوم ہو رہے تھے۔ جنہیں وہ اپنے اوپر طاری کیے ہوئے تھی۔

لاش کو ڈاکٹری معائنہ کے لیے بھیج دیا گیا۔ اگلے روز انسپکٹر خود رپورٹ لے کر فراز کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ فوزیہ کی آبروریزی نہیں ہوئی صرف لڑائی جھگڑے میں کمرے کا نقشہ الٹ پلٹ ہو گیا۔

''جناب آپ تفتیش جاری رکھیے میری بیوی کے سفاک قاتل کو ہر حال میں اس کے منطقی انجام تک پہنچنا چاہیے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں سوچ بچار اور بھاگ دوڑ کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''یہ اتنا آسان کام نہیں۔'' انسپکٹر سرفراز نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''اگر انسان ارادہ پختہ کر لے تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ ضرورت ذہانت کو بروئے کار لانے کی ہوتی ہے۔'' فراز نے مکا اپنی ہتھیلی پر جماتے ہوئے کہا۔

''بہرحال محتاط رہیے گا' کہیں وہ قاتل پھر کوئی وار نہ کر گزرے۔'' انسپکٹر سرفراز نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ہم سے ممکن ہوا وہ ہم ضرور کریں گے۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

......☆☆☆......

دو دن تک فوزیہ نادیہ کے فلیٹ سے نکل کر سیر سپاٹا کرتی رہی۔ کبھی فلم کبھی عجائب گھر' کبھی انار کلی

میں شاپنگ' وغیرہ کرتی رہی۔ اس کے پرس میں تین ہزار روپے اپنے تھے' کچھ نادیہ کی الماری سے اسے مل گئے تھے۔ تیسرے روز جب وہ الفلاح سینما سے نکل کر رکشہ میں سوار ہو رہی تھی اس کا شبہ یقین میں بدل گیا' ایک سیاہ لباس والا آدمی جسے وہ پہلے بھی اپنے تعاقب میں دیکھ چکی تھی۔ جلدی سے سینما کی طرف آنے والے افراد میں گھل مل گیا تھا۔ فوزیہ کا ماتھا ٹھنکا کیا پولیس اس کی نگرانی کر رہی ہے یا یہ فراز ہے کیونکہ وہ اسے دو تین بار چبھتی ہوئی طنزیہ نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ کیا اسے شک ہو گیا ہے اور وہ جان گیا ہے کہ میں نے کیا دھوکا دیا ہے لیکن وہ ہیروں سے تولاعلم ہی ہے وہ انہی سوچوں میں گم تھی' اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

اس وقت اس کی بہترین سہیلی عالیہ بخاری کا فون آ گیا۔ اس نے اسے فوری طور پر اپنے بنگلے میں رائے ونڈ روڈ پر بلوایا تھا۔ عالیہ اس کی بے تکلف دوست تھی اور صاحب جائیداد بھی تھی۔ اس کا خاوند امریکا میں دو بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور چلا رہا تھا۔ رائے ونڈ روڈ پر واقع اس کے آبائی بنگلے میں اس وقت عالیہ اپنے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ عالیہ نے اسے ایک پیش کش کی جسے سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

عالیہ کہہ رہی تھی کہ ''میں کل دوپہر کو کراچی روانہ ہو رہی ہوں۔ وہاں سے اپنی والدہ سے مل کر اپنے شوہر اخلاق بخاری کے پاس بچوں سمیت جا رہی ہوں۔ تم مجھے چونکہ بے حد عزیز ہو اور تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتی ہو۔ لہٰذا تم یہاں آ کے بنگلے کا چارج سنبھال لو۔ میں چھ ماہ بعد ہی واپس آؤں گی تب تک تم عیش کرو۔''

''بہت بہت شکریہ' عالیہ تم کتنی اچھی اور سویٹ ہو' میں واقعی اپنے فلیٹ میں بہت بور ہو چکی ہوں۔ اب ذرا کھلی جگہ پر رہنا چاہتی تھی۔ تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''اس میں احسان کی کیا بات ہے نادیہ! میں تمہیں بہن بول چکی ہوں۔'' عالیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ چند باتوں کے بعد فوزیہ نے موبائل چومتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔ نادیہ چونکہ فوزیہ کو ایک بار باتوں باتوں میں عالیہ کے متعلق بتا چکی تھی اس لیے اسے گفتگو میں کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی' وہ بالکل نادیہ جیسا لہجہ اپنائے ہوئے تھی۔

اس وقت وہ یہ دیکھ کر چونک اٹھی کہ ایک ٹیکسی برابر رکشہ کے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ اس کا دل پھر دھک دھک کرنے لگا۔ کیا یہ فراز ہے یا وہ خطرناک اجنبی جس کے ہیرے وہ اپنے قبضے میں کر چکی ہے۔ پھر اچانک اسے یہ خیال آیا کہ میں صبح ہی فلیٹ کے عقبی زینے سے خاموشی سے اتر کر فلینس کے پچھلے ویران راستے سے گزر کر عالیہ کے ہاں چلی جاؤں گی اور فراز سے فون پر یہ کہہ دوں گی کہ کچھ دنوں کے لیے آرام کی غرض سے اپنی نانی کے ہاں گاؤں جا رہی ہوں۔ فوزیہ کی موت سے اسے بڑا صدمہ پہنچا ہے اور وہ راتوں کو سو نہیں سکتی۔ اس نے دوبئی چوک کے بائیں جانب چھوٹے سے پارک کے پاس رکشہ رکوایا اور تیزی سے چکر کاٹ کر ٹیکسی پر نظر رکھتے ہوئے اپنے فلیٹ میں داخل ہو گئی۔ اس نے تعاقب کرنے والے کو دھوکا دے دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر نگاہ اٹھا کر جائزہ لے رہا تھا۔

فلیٹ کے اندر پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور پھر بدبودار اسٹور روم کے کاٹھ کباڑ سے سیاہ بریف کیس گھسیٹ کر نکالا اور اسے کھول کر دیکھا۔ رنگ برنگی ہیرے جگمگا رہے تھے۔ کمرے کی روشنی

میں چھوٹی چھوٹی رنگین شعاعیں مچلنے لگیں۔ بڑا سحر انگیز منظر تھا۔ وہ بے ساختہ کھلکھلا اٹھی تھی اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ پھر اس نے جلدی سے بریف کیس بند کیا اور کاٹھ کباڑ میں پھنسا کر دبا دیا۔ اب کوئی اس کے وجود کے متعلق آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے ایک بار پھر دروازے کھڑکیاں چیک کیں جنہیں وہ ہیرے دیکھنے سے قبل بند کر چکی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے دوبئ چوک کا منظر دیکھنے والی کھڑکی کھولی اسے وہ سیاہ لباس والا چہرے پر کیپ جھکائے دور جاتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اس نے ایک رکشہ لے لیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جھکی ہوئی کیپ کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکی تھی۔ ”یہ کون ہو سکتا ہے فراز یا وہ خطرناک آدمی یا پھر پولیس کا کوئی کارندہ۔“ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر رات بھر بیڈ پر جاگتی رہی۔ اور اس کا دل دھک دھک کرتا رہا۔

......☆☆☆......

علی الصباح وہ کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر تیار ہوئی۔ ضروری سامان ایک بڑے شاپنگ بیگ میں ٹھونسا پھر ہیروں والا بریف کیس اپنے بڑے سوٹ کیس میں چھپا کر فلیٹ کے عقبی دروازے سے سنسان راہداری میں آئی پھر جلدی جلدی پچھلے زینے کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ زینے سے گزر کر وہ فلیٹس کے پچھواڑے ویران پلاٹ اور جگہ جگہ گندے پانی سے بھرے جوہڑوں کے پاس سے گزرتی ہوئی چکر کاٹ کر مین روڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے اجنبی آدمی کے آنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اسٹاپ پر پہنچ کر اس نے فراز سے گاؤں جانے کے متعلق گفتگو کی اور پھر سامنے سے آتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔ جس نے اسے تیز رفتاری سے عالیہ کے رائے ونڈ روڈ پر واقع بنگلے کے سامنے اتار دیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی جان میں جان آ گئی۔

وہ بھاگ کر عالیہ کے سینے سے لگ گئی اور اس کے گال چومنے لگی۔ آخر وہ آرٹسٹ رہ چکی تھی۔ اداکاری اسے خوب آتی تھی۔ عالیہ کے رخصت ہونے کے بعد فوزیہ نے عالیشان بنگلے کا گھوم پھر کر جائزہ لیا تو خوشی اور مسرت سے کھل کھلا اٹھی۔ خوبصورت عمارت سامنے خوشنما لان، عقبی باغ میں سوئمنگ پول جو اوپری خواب گاہ کی کھڑکیوں سے تیراکی کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ فوزیہ تیراکی جانتی تھی، لہٰذا وہ کپڑے اتار کر تالاب میں کود گئی اور خوب اچھی طرح تیراکی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ سوئمنگ پول کے اردگرد بکھرے ہوئے پھولوں سے خوشنما اور بھینی بھینی خوشبو اڑتی ہوئی ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ کچھ پرندے درختوں پر بیٹھے چہچہاتے ہوئے موسیقی کا رس کانوں میں ٹپکا رہے تھے۔

سوئمنگ پول سے نکل کر وہ اتارے ہوئے کپڑوں کی طرف بڑھنے لگی۔ سامنے نشست گاہ میں دو قد آدم ستونوں کے درمیان راڈ پر تولیے لٹک رہے تھے پاس ہی ایک بڑی سی رنگین چھتری نصب تھی۔ اس نے تولیے سے جسم خشک کیا اور کپڑے پہننے لگی۔

ملازموں اور گارڈز سے عالیہ نے اس کا فرداً فرداً تعارف کروا دیا تھا اور تاکید بھی کر دی تھی کہ میں اب اپنی دوست کو قائم مقام مالکن بنا کے جا رہی ہوں۔ ان کا احترام کرنا، ہر بڑے کمرے، خواب گاہ اور ڈرائنگ روم میں خطرے کے الارم کے بٹن موجود تھے۔ دو گارڈز مین گیٹ پر متعین تھے اور دو گھوم پھر کر عقبی باغ میں عمارت کے مختلف حصوں پر نگاہ رکھتے ہوئے ڈیوٹی دیتے تھے۔ باغ میں تین خونخوار کتے بھی رات کو گھومتے رہتے تھے۔ ان کے جبڑے بھاری آنکھیں سرخ سرخ اور جسم بے حد پھرتیلے تھے۔ عالیہ بخاری کے بنگلے میں دو مرتبہ ڈاکو گھس آئے تھے۔

اس لیے اب اس نے حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔ فوزیہ بے حد خوش تھی کہ قسمت نے اس کے لیے ترقی کے دروازے کو کتنی جلدی کھول دیا ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جسے کھولتے ہوئے اکثر لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ کچھ اس کے ساتھ چمٹ کر حسرت اور امید آنکھوں میں لیے ختم ہو جاتے ہیں لیکن دروازے کی دوسری طرف جھانکنا انہیں نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اب کروڑوں کے ہیروں کی مالک بن چکی ہے۔ اور ہیروں کا مالک اس کی ذہانت سے الو بن چکا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب بہنوئی سے بھی جان چھوٹ گئی ہے پولیس اور اجنبی بھی پیچھے رہ گئے ہیں لیکن احتیاطاً اسے ہلکے پھلکے میک اپ، بڑے سیاہ شیشوں والی عینک اور بالوں کا رنگ اور اسٹائل بدل کر گھومنا ہوگا اور جب عالیہ واپس آئے گی تو وہ ہیرے فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ دولت سے اپنا ایک ایسا ہی بنگلہ تعمیر کروائے گی۔ جس میں ہر آسائش اور سہولت موجود ہوگی۔ پھر وہ کسی بہترین لڑکے کا انتخاب کرے گی۔

اگلے دو دن اس نے سیر و تفریح میں گزرے۔ گلشن اقبال پارک، میں گھومتے ہوئے اسے ایک خوبصورت اور اسمارٹ لڑکا پسند آ گیا جو جھیل کے پاس ایک بینچ پر بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب چلی گئی اور اس کی بنسری کی تان کی تعریف کی اور اس طرح ان کے درمیان دوستی کی شروعات ہو گئی۔

اگلے دن وہ بے تکلفی سے گلشن اقبال کے مین گیٹ سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک بھیڑ میں آتی ہوئی ایک لڑکی زور سے فوزیہ سے ٹکرا گئی۔ اتنے میں فوزیہ کے بالکل پیچھے آنے والی دو تین لڑکیاں بھی اس سے ٹکرا گئیں۔ ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔ کسی کا ہاتھ لگنے سے فوزیہ کی عینک گر گئی، فوزیہ نے اپنے مخصوص انگریزی لہجے میں لڑکیوں کو جھاڑا تو اس کے قریب پیچھے آنے والا فراز چونک کر اس کے وجود اور چہرے کو دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے ایک پردے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ انداز تو بالکل فوزیہ کا ہے اور بڑے سیاہ شیشوں کے پیچھے آنکھیں بھی فوزیہ کی ہیں اگرچہ نیلی آنکھوں پر سبز لینز چڑھا ہوا ہے۔ بالوں کو سنہری رنگ سے رنگا ہوا ہے۔ فراز احتیاط سے باہر نکلا اور پھر پارکنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ فوزیہ بھی اس طرف قدم اٹھا رہی تھی پھر اس نے عالیہ کی بڑی گاڑی میں لڑکے کو بٹھایا اور اسے مون مارکیٹ چھوڑ دیا اور خود رائے ونڈ روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔

آج دونوں نے گلشن اقبال میں آسمانی جھولے بڑے کشتی اور الٹے گھومنے والے پیالے کی سیر کی تھی۔ فراز محتاط انداز سے فوزیہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

فراز اپنے ذہن میں واقعات کا تانا بانا جوڑنے لگا کہ یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ نادیہ مجھ سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ اپنی نانی کے ہاں جا رہی ہے لیکن اس لڑکی نے تو بالکل فوزیہ کے انداز میں دونوں مٹھیاں دبا کر لڑکی کو جھاڑا تھا۔

جیسے ہی فراز نے رینٹ پر حاصل کردہ کار کرائے کے مکان کے گیراج میں کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تو سامنے نیم تاریکی میں بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے ایک اجنبی کو

دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ وہ چہرے کے زخموں اور جبڑوں کی ساخت سے خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا پھر اس کے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول بھی تھا جس کی نال کے اوپر ایک سرخ رنگ کا کانسی سے بنا ہوا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

''تم کون ہو اور کیوں میرے گھر میں گھسے بیٹھے ہو'' فراز نے حواس بحال کرکے آگے بڑھتے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''مسٹر فراز میں تمہارا انتظار کررہا تھا۔ مجھے ہیروں سے بھرا ہوا بریف کیس واپس چاہیے جسے تم نے کسی طرح اپنی بیوی کو ٹھکانے لگا کے ہضم کرلیا ہے یاد رکھو میں بہت خراب آدمی ہوں میرے سامنے تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔'' وہ شخص اچھل کر کھڑا ہوگیا اور فراز کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیسے ہیرے؟ کیسا بریف کیس؟ میں کچھ نہیں جانتا ایک تو میری بیوی قتل ہوگئی' دوسرا تم مجھے خوفزدہ کررہے ہو۔'' فراز حیرت سے اچھل پڑا۔ اجنبی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''اچھا غور سے سن لو چند روز قبل میں سیٹھ دولت خان کی کوٹھی سے جو اقبال بلاک میں واقع ہے' تمیں کروڑ کے ہیرے چرا کر بھاگا تھا اور مین روڈ سے گزرتی بس میں سوار ہو کر دوئی چوک اترنا چاہتا تھا لیکن سامنے پولیس نے بڑا ناکا لگا رکھا تھا۔ شاید انہیں کسی مفرور کی تلاش تھی۔ آج کل بسوں کے دروازے صرف اسٹاپ پر ہی کھولے جاتے ہیں' میں پھنس گیا' اتنے میں تمہاری بیوی اوپن کار مجھے گلشن اقبال کے چوک سے دائیں طرف کشمیر بلاک کی طرف مڑتی ہوئی دکھائی دی' میں نے اس کی کار کا نمبر ذہن نشین کیا اور بریف کیس لٹکا کر چپکے سے اس میں ڈال دیا۔ بس میں سواریاں کم تھیں اور فاصلے پر بیٹھی تھیں کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کار کے نمبر سے ایڈریس نام وغیرہ معلوم کرکے پھر بریف کیس چھین لوں گا لیکن تمہاری بیوی کے بلاوے پر پہنچا تو وہ قتل ہوچکی تھی۔ تم نے اسے مار دیا اور ہیرے.....'' اجنبی نے غرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ارے خدا کے بندے' میں دفتر کی میٹنگ میں تھا۔ دس بارہ آدمی گواہ ہیں۔ میں نے کس طرح اسے مارا۔''

''تم نے نہیں مارا تو پھر کیا چکر ہے' مجھے سازش کی بو آرہی ہے۔ ضرور کہیں گڑبڑ یا گھپلا ہوا ہے۔'' وہ سانپ کی مانند غرایا اور ریوالور کی نال قریب آکے فراز کے سینے سے لگادی۔

اس وقت فراز واقعات کی کڑیاں جوڑتے ہوئے ایک نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ ''میں سمجھ گیا۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر ان کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔

......☆☆☆......

اس نے نگاہ گھماتے ہوئے جائزہ لیا' طوفانی موسم میں رائے ونڈ روڈ پر اس وقت ٹریفک کم ہوگیا تھا۔ لوڈ شیڈنگ کے باعث ماحول پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں جنریٹر اور یو پی ایس چلنے سے روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ رات کا وقت آسمان پر سیاہ بادلوں کے جھرمٹ میں بجلی کبھی کبھی چمک کر ماحول کو جگمگا دیتی۔ ٹھنڈی اور سرد ہوا کے جھونکے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے گزرتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی' بارش کسی وقت بھی شروع ہوسکتی تھی۔

خوفناک چہرے والا دراز قد آدمی ایک زیر تعمیر مکان کے ملبے کی آڑ میں اپنی پرانی کار کھڑی کرکے موسم اور سرد ہوا کے جھونکوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ایک شاندار بنگلے کی طرف

بڑھنے لگا۔ جہاں دو تین مقامات پر اندھیرے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈ چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی خوفناک چہرے والے کی گرفت جیب میں موجود پستول پر مضبوط ہوگئی وہ انہیں ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت بادل زور سے گرجے اور بجلی کی چمک سے پل بھر کے لیے عقبی عمارتی حصہ روشن ہوگیا۔ وہ تیزی سے دیوار کے قریب چلا آیا۔ پھر ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ گھما کے ایک جگہ دیوار میں رخنے دیکھ کر پاؤں جماتا ہوا اچک کر دیوار پر چلا آیا اور پھر بجلی کی دوسری چمک سے باغ کا منظر دیکھ کر ایک آم کے درخت کی دیوار تک آنے والی شاخ سے لپٹ کر نیچے اترتا چلا گیا۔ زمین پر رک کر اس نے کسی چیتے کے مانند حلق سے ایک مخصوص غراہٹ نکالی جیسے درندہ شکار کے قریب ہونے پر غراتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت بارش شروع ہوگئی۔ دراز قد شخص ٹارچ روشن کرتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ عمارتی حصے کی طرف پیش قدمی کررہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور بھی نمودار ہوچکا تھا۔ لبلبی پر ہلکا سا دباؤ رکھ کر ادھر ادھر درختوں اور جھاڑیوں پر نگاہ ڈالتا ہوا چوکنے انداز سے آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ لمبے اوور کوٹ میں ملبوس تھا۔ کوٹ کا بڑا گول کالر گردن کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی پتلون اور جوتے بھی سیاہ تھے۔

اچانک ایک غراہٹ کے ساتھ کسی شے نے اس پر چھلانگ لگادی۔ دراز قد آدمی لڑکھڑا گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن وہ بھی کسی درندے سے کم نہیں تھا۔ وہ بھاری بھرکم خوفناک کتے سے بھڑ گیا۔

کتا اس کی گردن دبوچ کر دانت گاڑ رہا تھا۔ دراز قامت نے سینے سے چمٹے سیاہ وحشی کتے کے پیٹ سے پستول لگا کے اطمینان سے ٹرائیگر دبا دیا۔ کتا پورے زور سے گردن چبا رہا تھا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی البتہ بے آواز گولی نے ضرور اسے بے جان کر دیا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ اچھلا اور پھر نیچے گرتے ہوئے بارش کے پانی کو رنگین کرنے لگا۔ دراز قد وحشی انداز سے مسکرا دیا اور اس نے کتے کو اچھال پھینکا۔ کتا ہلکی ہلکی غراہٹیں خارج کرتا ہوا ابدی نیند سو گیا۔ دراز قامت نے مسکرا کے کوٹ کا پھٹا ہوا کالر ہٹا کر فولادی گلو بند پر ہاتھ پھیرا جسے وہ کسی بھی مہم پر نکلتے وقت پہن کر نکلا کرتا تھا۔ کتے کے دانت فولاد سے ٹکراتے رہے تھے اور وہ گردن نہیں چبا سکا تھا۔ وہ آگے بڑھا پھر ٹھٹک گیا اس کے دائیں اور بائیں سے دو خوفناک کتے مزید غصے سے پاگل ہو کر غراتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اچانک ہی درختوں کی اوٹ سے نکل آئے تھے۔ کتے لمبی چھلانگیں مارتے ہوئے حملہ آور ہوئے لیکن دراز قامت شخص نے دونوں جانب فائر جھونک مارے۔ اتفاق سے دونوں گولیاں نشانے پر بیٹھیں اور کتے چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔ طوفانی موسم میں ان کی آواز زیادہ دور نہ جا سکی۔ دراز قد آدمی چالیس گز دور رہائشی حصے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس نے میک اپ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی نہ چہرے کو ڈھانپ کر نکلا تھا۔ کیونکہ وہ زخموں کے نشانات والے میک اپ میں ہی تھا جسے وہ ہیرے حاصل کرنے کے بعد ختم کرنے والا تھا۔

''بس رک جاؤ چالاک لٹیرے۔'' ایک پھنکارتی ہوئی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔ وہ چونک کر مڑا تو اس سے دو قدم کے فاصلے پر ایک جھاڑی سے نکلنے والا گن مین محافظ پوزیشن لے چکا تھا۔ کون ہو تم اور کس ارادے سے آگے جا رہے ہو۔ میں نے کتوں کے مرنے کی آوازیں سن لی ہیں۔'' محافظ غصے سے سرخ ہوتا ہوا آگے بڑھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ دراز قامت نے آگے سرک کر پھرتی سے ایک زوردار مکا اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ محافظ فائر کر چکا تھا لیکن اس کی گولی خوفناک چہرے والے کے سینے سے ٹکرا کر اچٹ گئی۔ اس نے مسکرا کر اپنے سینے کو تھپکی دی۔ وہ کوٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ محافظ اس کے قدموں میں بے ہوش پڑا تھا وہ اسے حقارت سے ٹھوکر لگاتا ہوا آگے بڑھا اور بے دھڑک ہو کر عمارت کی طرف چلنے لگا۔ اچانک ایک چھینک کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔ وہ فوراً ہی ایک قریبی درخت کی آڑ میں کھسک گیا۔ اس لمحے پھول دار جھاڑیوں سے دوسرا محافظ نکلا اور گن گھماتا ہوا اجنبی کو تلاش کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ درخت کے قریب پہنچا اجنبی نے گھوم کر درخت کے تنے کی دوسری جانب سے محافظ کی پشت پر آ کر ریوالور کا دستہ اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ دوسرا محافظ بھی آنکھوں میں حیرت لیے زمین پر لیٹتا چلا گیا۔ دراز قد نے اس کا جائزہ لیا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔

اب عمارتی برآمدہ اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس لمحے بجلی زور سے چمکی اور اس روشنی میں بنگلے کی اوپری خواب گاہ کی کھڑکی سے فوزیہ نے خوفناک چہرے والے دراز قامت کو دیکھ لیا وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی شخص ہے جو ہیرے حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس نے خطرے کا الارم بجا دیا اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے وہ سب ہیرے جو بریف کیس سے نکال کر بستر پر اچھالتے ہوئے

مسرت کے عالم میں کھیل رہی تھی انہیں فوراً بریف کیس میں بند کر کے الماری کے نچلے بکس میں چھپا دیا اور تکیے کے نیچے سے لمبی نال والا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کے سگریٹ کے کش لیتی ہوئی دروازے کو گھورنے لگی۔ ''اگر یہ آ ہی گیا ہے تو بچ کر نہیں جائے گا' میں اپنی بہن کی جان لے سکتی ہوں تو اس سیاہ مچھر کو بھی قتل کر سکتی ہوں۔'' وہ سفاک انداز سے بڑبڑائی۔

دراز قامت بھی آج ہر رکاوٹ کو توڑنے کا ارادہ کر کے نکلا تھا۔ وہ بھی بجلی کے چمکتے ہی باغ سے اوپری خواب گاہ میں فوزیہ کی موجودگی کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے دونوں محافظ خطرے کا الارم سن کر اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے لگے لیکن وہ تو بے ہوش تھے وہ کیا جواب دیتے' اب دونوں بھاگتے ہوئے اندرونی عمارت کی طرف بڑھے اور نچلی منزل کا جائزہ لینے کے بعد میڈم فوزیہ کی خواب گاہ کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر پہنچے ہی تھے کہ قریبی گول ستون کی آڑ میں چھپے دراز قد نے عقب سے حملہ کر کے دونوں کو ریوالور کے دستے سے بے ہوش کر دیا اور خود بے دھڑک سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا آیا۔ وہ خواب گاہ کے دروازے کے سامنے آ کر رک گیا۔ جہاں فوزیہ بستر پر ریوالور ہاتھ میں لیے اس کی منتظر تھی۔

''دروازہ کھول کے ہیرے میرے حوالے کر دو مس فوزیہ! میں سب کچھ جان چکا ہوں۔'' دراز قد غرایا۔

''چالاک چوہے بھاگ جاؤ ورنہ میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ بس سمجھو ایک بلی اندر چوہے کی تاک میں ہے۔'' فوزیہ بھی دلیری سے غرائی۔ دولت آنے سے اس کے اندر دبدبہ اور استحکام پیدا ہو گیا تھا۔

''کتیا تمہارا برا حشر کر دوں گا۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی دراز قامت اپنے چوڑے کندھے سے بھاگ کر ٹکر مارتے ہوئے دروازہ توڑنے لگا۔ دوسری ٹکر پر ہی دروازہ اکھڑ کر اندر جا گرا۔ جیسے ہی وہ دو قدم آگے بڑھا۔

فوزیہ غرائی۔ ''چالاک چوہے رک جاؤ ورنہ بھیجہ اڑا دوں گی۔ اس نے فائر کر کے خوفناک چہرے والے کا پستول اڑا دیا۔ وہ باغ میں نشانہ بازی کی مشق کر چکی تھی اور چند ڈراموں میں بھی یہ عمل دہرا چکی تھی۔ خوفناک چہرے والا حلق سے کسی درندے جیسی غراہٹ خارج کرتا ہوا آگے بڑھا' فوزیہ نے بے دھڑک دوبارہ ٹرائیگر دبایا لیکن دونوں گولیاں اجنبی کے سینے سے ٹکرا کر اچٹ گئیں۔ فوزیہ نے پھر فائر کیا' خوفناک چہرے والے نے منہ پر بازو سامنے لاتے ہوئے فولادی پٹی پر فائر روکا اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بستر پر چھلانگ لگا دی۔ فوزیہ فائر بیکار دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ خوفناک چہرے والے نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر حقارت سے ایک طرف پھینک دیا اور اسے بازوؤں سے جکڑ کر سانپ کی مانند پھنکارا۔

''تم بہت خبیث اور حرامی عورت ہو۔ میں تمہیں گلا دبا کر مار دوں گا۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی انسان کو قتل نہیں کیا لیکن تم اس قابل ہو تم نے تو اپنی بہن کو موت کے گھاٹ اتار دیا پھر اس کا روپ دھار کر ہیرے غائب کر دیئے اور گاؤں جانے کا ڈرامہ کر کے اپنی کسی دوست کے خالی بنگلے میں آ چھپی ہو۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب کچھ؟'' فوزیہ زور آزمائی کرتی ہوئی بولی۔ وہ بپھری ہوئی تھی لیکن

خوفناک چہرے والا اس کے دونوں بازو جکڑے ہوئے تھا۔ خوفناک چہرے والا مسکرایا اس کی مسکراہٹ بھیانک تھی فوزیہ لرز گئی۔ ’’تمہارا خاوند جان چکا تھا کہ تم نادیہ نہیں فوزیہ ہو کیونکہ وہ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے۔ دو دن قبل تمہارا خاوند اس کی ران پر ایک بڑا سا سرخ دانہ دیکھ چکا تھا پھر گلشن اقبال میں گیٹ پر تمہاری عینک گری تو وہ قریب ہی موجود تھا' اس نے تمہارا تعاقب کیا اور میں اس کے گھر میں اس کا منتظر تھا۔ میں نے اسے دھمکایا کہ تم نے بیوی کو مار کر ہیرے غائب کر دیئے ہیں بتا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔ پھر اس کے اور میرے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔‘‘

’’وہ معاہدہ کیا ہے۔‘‘ فوزیہ کسمساتی ہوئی بولی۔

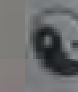
’’لو اپنے خاوند سے ہی سن لو۔‘‘ خوفناک چہرے والے نے موبائل نکال کے بٹن دباتے ہوئے فراز سے سلسلہ قائم کر لیا فون فوزیہ کا ایک بازو چھوڑ کر اسے تھما دیا۔ اس کے خاوند کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی صورت میں اس کے کانوں میں اترنے لگی۔ ’’آوارہ' سنگدل عورت تم نے نادیہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ مغالطہ ہو کہ کسی نے تمہیں قتل کر کے ہیرے چھین لیے ہیں۔ میں اور نادیہ آپس میں محبت کرتے تھے۔ میں اس کے فلیٹ میں کافی وقت گزارتا رہا ہوں۔ اب میرا یہ آدمی معاہدہ کے مطابق میری سنگدل بیوی کو موت کے گھاٹ اتار کے ہیرے خود حاصل کر لے گا۔ تمہاری موت کی شرط میں نے رکھی تھی۔‘‘

’’فراز...... اچھے فراز...... مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف......‘‘

’’نہیں...... نہیں‘‘ فراز گرج کر بولا۔

’’تم نے اپنی معصوم بہن کی جان لی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں چھوڑ کر اس سے شادی کر لوں کیونکہ تم آوارہ اور پھوہڑ ہو اور شاید بانجھ بھی لیکن مجھے نادیہ ہی روکتی رہی کہ اس طرح فوزیہ کا دل ٹوٹ جائے گا اور تم نے اسے بے حسی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب تم بھی مرو۔‘‘ ان الفاظ کے ساتھ رابطہ کٹ گیا۔ خوفناک چہرے والے کا ہاتھ سرک کر اس کے حلق پر آ گیا۔ ’’مجھے چھوڑ دو' میں ہیرے تمہارے حوالے کر دیتی ہوں۔‘‘ ’’نہیں' وہ بے رحمی سے بولا۔ میں معاہدہ نہیں توڑ سکتا۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی انسان کو قتل نہیں کیا لیکن تم بے حد سنگدل ہو تم نے ہیروں کے لالچ میں اپنی بہن کو ہلاک کر ڈالا تمہارے لیے میرے دل میں بالکل رحم نہیں۔‘‘ خوفناک چہرے والے نے فوزیہ کی جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر بستر پر ڈال دیا اور پھر کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ فوزیہ آنکھوں میں آنسو لیے پھٹی پھٹی نظروں سے خوفناک چہرے والے کو الماری سے سیاہ بریف کیس برآمد کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس نے بریف کیس کھولا کمرے میں ہیروں کی چکا چوند پھیلی پھر بریف کیس بند ہوا اور وہ سیدھا ہو کر پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ فوزیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ فوزیہ نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت خوفناک چہرے والے کے لمبے مضبوط ہاتھ اس کا گلا دبانے لگے۔ وہ تڑپی مچلی اور پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

اس وقت باہر سے پولیس سائرن کی آواز گونجی لیکن خوفناک چہرے والا بریف کیس سمیت باغ کی سمت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔



سوفٹ ویئر

آلشبہ مخدوم

موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے۔ دنیا کا پورا نظام کمپیوٹرائزڈ ہو رہا ہے' آنے والے دور میں ہر کام' ہر شے بس ایک کلک کا محتاج ہوگا لیکن اس تیز رفتار ترقی کی کوکھ میں جو برائیاں اور دشواریاں پل رہی ہیں یہ کہانی اسی کی عکاس ہے۔

ایک لڑکی کے تیار کردہ سوفٹ وئیر کا قضیہ' ہیکرز نے اسے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

سائنس فکشن کے شائقین کے لیے بطور خاص ایک دلچسپ تحریر

نجانے کب سے الوینہ کے من میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ ہوا پر تحقیق کرے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ یہ تحقیق بھی منفرد قسم کی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ہر طرح کی مقناطیسی لہریں جن میں ٹیلی فون، سیل فون، وائرلیس، ٹی وی کی اور نجانے کیسی کیسی لہریں موجود ہیں۔ ان کو درمیان میں سے اُچک کر نہ صرف سنا جائے بلکہ اپنی پسند سے جس کے ساتھ چاہے بات کر لی جائے۔ مثلاً وہ اپنی پسند کا نمبر ہوا میں چھوڑے اور اگر ویسا نمبر کہیں استعمال ہو رہا ہے تو وہ اس پر ہونے والی بات چیت سن سکے بلکہ جب چاہے اس سے کسی کے ساتھ بات کر لے۔

یہ ایک انتہائی خطرناک تجسس ہی نہیں مہم جوئی بھی تھا۔ بڑھتی عمر کے الوینہ کے دماغ میں یہ تجسس پختہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ تقریباً تین سال پہلے اس نے اپنی تحقیقات کا آغاز بھی کر دیا تھا' جس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کے منگیتر آصف کو بھی پتہ نہیں چلا جس سے وہ شدید محبت کرتی تھی۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ کمپیوٹر تکنیک میں اپنی ریسرچ کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس نے جب کمپیوٹر میں ماسٹرز کیا تھا تو سلور میڈل لیا تھا۔ سب ہی اس کے شاندار مستقبل کے حوالے سے مطمئن تھے۔ وہ ایک کمپنی میں جاب بھی کرنے لگی تھی' جہاں سے اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی۔ میں بھی اسی کمپنی میں جاب کرتی تھی اور اس کے ساتھ میری اچھی بنتی تھی۔

الوینہ نے کسی کو بتائے بغیر اپنی تحقیق جاری رکھی۔ شاید مجھے بھی اس کی تحقیق کے بارے میں علم نہ ہوتا اگر اس کے ساتھ کچھ ایسے مسائل نہ ہونے لگتے جس کی اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان دنوں حد درجہ پریشان تھی اور ایک دن اس نے مجھے اپنی تحقیق کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ہم اپنے آفس ہی کی کینٹین پر بریک کے وقت کھا پی رہے تھے۔ میں نے جب پوچھا کہ وہ پریشان کیوں ہے تب اس نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بتاتے ہوئے کہا۔

’’میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میرے ساتھ کیا ہونے لگا ہے۔ میں بہت مشکل میں ہوں، میں تم سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟‘‘

’’پرابلم کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ میں اپنی پرابلم تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ میں ڈرتی ہوں کہ اگر تم نے میرا مذاق اڑایا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔‘‘ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اگرچہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کہوں کہ تمہارے پاگل پن میں پہلے بھی کوئی شک نہیں لیکن اس کی شکل دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور میں نے نہایت متانت سے پوچھا۔

’’پاگل ہوں تمہارے دشمن، تم نہایت سادہ لفظوں میں مجھے بتاؤ آخر مسئلہ کیا ہے؟‘‘

’’اب غور سے سنو۔‘‘ اس نے الجھتے ہوئے کہا تو

میں ہمہ تن گوش ہوگئی تب وہ بولی۔

"میں تو اپنی تحقیق کر ہی رہی تھی کہ چند ہفتے پہلے مجھے ایک ایسا سوفٹ ویئر ملا جس سے جن بھوت یا ایسی کوئی سپر نیچرل مخلوق کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"وہاٹ...... ! کیا کہہ رہی ہو...... ایسا کوئی سوفٹ ویئر ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"بالکل ہے اور بہت جلد وہ سیل فون تک میں آجائے گا' یہ اس سوفٹ ویئر بنانے والے کا دعویٰ ہے۔ میں تمہیں ابھی واپس جا کر دکھاتی ہوں۔"

"وہ میں دیکھ لوں گی، میں نے مان لیا کہ ایسا سوفٹ ویئر ہے، وہ کیسے کام کرتا ہے اور اس سے تجھے کیا پرابلم ہے؟" میں نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سوال کر ڈالے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"اصل میں یہ سوفٹ ویئر سیل فون کے لیے ہی بنایا جا رہا ہے۔ اسے آن کرنے کے بعد جیسے ہی آپ کے اردگرد یا جہاں آپ ہوں گے، وہاں اگر کوئی جن، بھوت یا کوئی گھوسٹ وغیرہ ہوگا، اس کے بارے میں علم ہو جائے گا۔"

"اچھا اس سے تمہیں کیا پرابلم ہے؟" میں نے انتہائی تجسس کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اس سوفٹ ویئر کو سمجھنے کے لیے اسے اپلائی کرنے کی کوشش کی' میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسے کام کرتا ہے تو......" یہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے خاموش ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی، جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے پھر مطمئن ہو کر بولی۔

"تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہمارے آفس میں کئی بھوت ہیں اور ان کے مختلف جگہوں پر ٹھکانے ہیں۔" اس نے کہا تو خوف کی ایک لکیر میں نے اپنے پورے بدن میں سرسراتے ہوئے محسوس کی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" اب تجسس سے زیادہ مجھ پر خوف زیادہ طاری ہو گیا تھا۔

"میں تمہیں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں، ابھی میں تجھے دکھا دیتی ہوں، آؤ میرے ساتھ۔" اس نے اعتماد سے کہا تو ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے ساتھ مذاق کر رہی ہے اور یہ مذاق بہت ہی سنجیدہ قسم کا ہے۔ بھلا بھی کوئی ممکن بات ہے کہ دکھائی نہ دینے والی مخلوق کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہو۔ تبھی میں نے یہ بات اپنے دل میں رکھی اور اس کے مذاق کا جواب دینے کے لیے میں اسی طرح معصوم صورت بنائے اس کی بات سنتی رہی۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ اس میں وہ جن، بھوت یا گھوسٹ نظر آنے لگتا ہے؟"

"اس کی واضح صورت دکھائی نہیں دیتی، صرف اس کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں پر کوئی سپر نیچرل شے موجود ہے۔ اسکرین پر جو اشارے ابھرتے ہیں ان سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہاں پر کس قسم کی مخلوق ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہو گیا کہ سپر نیچرل شے کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے اور ادھر ہمارے آفس میں بھی بھوت موجود ہیں۔ لیکن تمہیں اس سے کیا پرابلم ہے وہ تو بتاؤ ذرا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز آ گیا مگر اس نے میرے طنز کو محسوس کیے بنا کہا۔

"ہوا یوں کہ میں جب یہ دیکھ رہی تھی تو پہلے دن اپنی سیٹ کے پاس صرف ایک بھوت کو پایا اور جس دن میں نے اپنے سیل فون پر اس سوفٹ ویئر کو چلایا تو' پھر میری اپنی مرضی ختم ہو گئی ہے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ میں آج کل اپنا سیل فون بند رکھتی ہوں؟"

"مطلب جب تم اپنا سیل فون آن کرتی ہو تو وہ سوفٹ ویئر آن ہو جاتا ہے تب تمہاری مرضی نہیں رہتی' یہ حل تو تم نے تلاش کر لیا اب۔"

"سنو گی بھی۔" اس نے اکتاتے ہوئے کہا، میرے خاموش رہنے پر وہ بولی "اب میں کمپیوٹر پر بھی کام نہیں کر سکتی ہوں' میں جب یہاں سیٹ پر آتی ہوں تو وہ مجھے کام نہیں کرنے دیتے بلکہ کمپیوٹر اسکرین پر میرے سامنے ایسی دنیا آ جاتی ہے کہ جس کا میں تصور نہیں کر سکتی۔ اب تو وہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو ایک دم مجھے خوف تو آیا، لیکن جب میں نے یہ سوچا کہ یہ محض مذاق ہے تو مجھے کچھ ڈھارس ملی۔ میں کینٹین سے اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ تب میں نے اپنے آفس کی عمارت کے طول و عرض کا دیکھا۔

یہ عمارت لاہور کے معروف ماڈل ٹاؤن میں چار کنال کی تھی۔ بنیادی طور یہ رہائش کے لیے بنائی گئی تھی، لیکن ملٹی نیشنل کمپنی نے اسے کرایے پر حاصل کیا اور اس میں اپنا کام شروع کیا۔ رہائشی عمارت کے علاوہ اس میں لان، درخت اور وہ سب کچھ تھا جو ایسی عمارتوں میں ہوتا ہے۔ آفس کی عمارت کی جانب جاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"الوینہ! جہاں ہم جا رہے ہیں، یہاں اردگرد بھی کوئی بھوت ہوگا؟" میرا مقصد صرف اس کا مذاق اڑانا تھا مگر اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں...... یہ جو دائیں جانب تین درخت ہیں ان میں سے پہلے پر ایک بھوت رہتا ہے' کیا تم دیکھنا چاہو گی؟"

"کیا تم دکھا سکتی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بولی۔

"بالکل...... آؤ دکھاؤں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی' کچھ منٹوں میں وہ اپنی سیٹ پر پہنچ گئی، میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سیل فون آن کیا پھر اس پر غور سے دیکھتی رہی۔ اس نے وہ سوفٹ ویئر چلایا تو چند لمحے اسکرین صاف رہی پھر اس پر دائروں میں سرخ سرخ دھبے بننے لگے، میں سمجھ گئی ایسا وال پیپر تو کوئی بھی بنا سکتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر کے ساتھ سیل فون کو رکھا اور ایک پروگرام کھول لیا' اس میں ہیولا سا لہرایا پھر کئی بادل امڈنے لگے پھر اس میں جو شبیہہ دکھائی دی اس سے نہ صرف میں ڈر گئی بلکہ مجھے نہایت کراہت محسوس ہوئی۔ اس کے نہ ہاتھ تھے نہ پاؤں، بلکہ وہ جیلی کی صورت لجلجا سا تھا اور اوپر کی جانب بس دو آنکھیں تھیں، جن میں سے آنسوؤں کی مانند خون ٹپک رہا تھا۔ مجھے قے محسوس ہوئی تو میں نے منہ پھیر لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے الوینہ! یہ کیا ہے؟" میں نے غصے میں کہا۔

"تم مانتی کیوں نہیں ہو یہ......" اس نے کہنا چاہا اور پھر اچانک ہی دہشت سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر آ گئی...... میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کے مذاق کا بدلہ میں کسی اور طرح سے لوں گی۔ میں دیر تک سوچتی رہی کہ اس سے کیسا بدلہ لوں جو اس نے بڑی معصومیت سے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس پر غصہ تو آ رہا تھا لیکن سمجھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ میں اسی غصے میں بھول گئی کہ اس سے پوچھوں اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی اور پھر مجھے یاد ہی نہ رہا کہ کیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ جب تک میرے پاس وہ سوفٹ ویئر نہیں ہوگا تو میں کیسے اسے سمجھ سکوں گی۔ میں اسی وقت اٹھی اور الوینہ کے پاس چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر اسے کہا۔

"الوینہ! تمہیں پتہ ہے تمہارے پاس کیوں آئی ہوں؟"

"نہیں۔" اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے اسکرین پر

نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔
”میں چائے پینا چاہتی ہوں۔ دو کپ چائے کے تو بناؤ۔ ایک اپنے لیے اور ایک میرے لیے۔“
”ضروری ہے۔“ اس نے پوچھا۔
”ہاں تم ذرا چائے اچھی بناتی ہو۔“ میرے یوں کہنے پر اس نے کام درمیان ہی میں چھوڑا اور چائے بنانے اٹھ گئی۔ وہ چائے بنانے لگی تھی۔ اس کا کمپیوٹر میرے سامنے تھا۔ میں نے وہ سوفٹ وئیر کاپی کر لیا۔ کچھ دیر بعد میں چائے پی کر اس کے پاس سے اٹھ کر آ گئی۔
ڈنر تک مجھے وقت ہی نہیں ملا کہ اس سوفٹ وئیر کو دیکھ سکوں۔ کام سے فراغت کے بعد میں اپنے کمرے میں گئی۔ پھر بڑے سکون سے میں نے اس سوفٹ وئیر کو اپنے کمپیوٹر پر انسٹال کر کے چلایا۔ کچھ دیر تک میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے اس میں نہ کوئی جن دکھائی دیا، نہ بھوت اور نہ کوئی گھوسٹ...... میں دل ہی دل میں مسکرانے لگی کہ اب میں اسے سمجھ کر کل سارا کچا چٹھا الوینہ کے سامنے کھول دوں گی۔ یہ خیال ابھی میرے دماغ میں آیا ہی تھا کہ مجھے لگا میری انگلیاں بھیگ گئی ہیں۔ میں نے اپنی انگلیوں کو دیکھا تو میری چیخ نکل گئی، وہ خون میں لت پت تھیں۔ سارا کی بورڈ خون سے لتھڑا ہوا تھا' خون کی چپچپاہٹ سے میرا جی مکدر ہو گیا اور مجھے قے محسوس ہوئی، میں وہاں سے اٹھ کر جانے چاہتی تھی مگر کوئی نادیدہ قوت مجھے جکڑے ہوئی تھی' میرا دماغ چکرانے لگا تھا' ایسے میں میری نگاہ اسکرین پر پڑی۔ وہاں دھواں تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ میں شاید اسے کچھ اور ہی سمجھتی لیکن یہ ویسا ہی گھوسٹ تھا جیسا میں الوینہ کے کمپیوٹر پر دیکھ چکی تھی۔ میری ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں' میں امی ابو اور بھائی کو مدد کے لیے پکارنا چاہ رہی تھی لیکن میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔
میں جس قدر بے چین ہو رہی تھی وہ دھواں اسی قدر تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ میرے سامنے پڑا کی بورڈ خون سے لت پت تھا اور پھر اس میں سے ڈجٹ ابھرنے لگے۔ ان میں اس قسم کی سنڈیاں باہر نکلنے لگیں، جنہیں دیکھ کر کراہت آ رہی تھی۔ میں کبھی کی بورڈ کی طرف دیکھتی اور کبھی اسکرین کی طرف، اچانک وہ متحرک دھواں رُک گیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میری نگاہیں بھی اس پر جم گئیں' یوں جیسے اس نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گر رہے تھے اور ہونٹوں کی لکیر سے کچھ کہا جا رہا تھا جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی' مجھے لگا جیسے میرے سارے بدن پر کیڑے اور سنڈیاں رینگ رہی ہیں لیکن میں ہل ہی نہیں پا رہی تھی۔ میں چیخنا چاہتی تھی لیکن چیخ نہیں سکتی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری جان نکل رہی ہے اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ کہاں ہوں۔ میری جب آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے کمپیوٹر کی طرف دیکھا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ ویسے ہی صاف اور شفاف پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور میں خواب میں یہ سب دیکھ کر ڈرتی رہی ہوں۔ میں ایک دم سے خود پر ہنس دی کہ الوینہ اپنے مذاق میں کامیاب رہی ہے۔ اس نے تو مجھے سوتے میں بھی ڈرا دیا۔ میں اٹھی اور جلدی سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئی۔ ناشتے پر اماں مجھے غور سے دیکھتی تو رہی لیکن کوئی بات نہیں کی۔ میں آفس کے لیے چل دی۔
اب میں اتنی پاگل بھی نہیں تھی کہ الوینہ کو اپنے ڈر جانے کی بابت بتاتی اور اس کے مذاق کا نشانہ بنتی۔ میں سارا دن اس کے پاس ہی نہ گئی تا کہ اسے تجسس ہو کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ وہ بھی میرے پاس نہیں آئی، بلکہ جس وقت میں

بریک کے وقت کینٹین پر گئی اس وقت بھی وہ اپنے کام میں محو رہی تھی۔ میں چھٹی کے وقت جب باہر نکلی تو الوینہ جا چکی تھی۔ میں نے اپنا پرس لیا اور باہر جانے کے لیے لپکی۔
جیسے ہی میں اس درخت کے پاس سے گذری جس کے بارے الوینہ نے نشاندہی کی تھی، مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ لجلجا سا چہرہ یاد آ کے میری طبیعت مکدر کر گیا۔ ٹھیک انہی لمحات میں مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ نجانے کیوں میری نگاہ اس درخت کی جانب اٹھ گئی۔ تب میں حیران رہ گئی۔ اگرچہ وہ ویسا ہی لجلجا سا کوئی وجود تھا، لیکن اس میں ویسی ہی آنکھوں کے علاوہ ایک لکیر نما منہ بھی تھا، جس سے رال ٹپک رہی تھی۔ دو نوکیلے دانت اس میں نمایاں تھے۔ وہ دھیرے دھیرے میرا نام پکار رہا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ میری اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ مجھے لگا کہ جیسے میرے اور اس کے درمیان کوئی ایسی مقناطیسی قوت آ گئی ہے جو مجھے ہلنے نہیں دے رہی اور میں مسلسل اسی کی طرف دیکھتے رہنے پر مجبور ہوں۔ نجانے کتنا وقت ایسے گذر گیا۔ میں ہر طرف سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف اس بھوت کی نوکیلی آواز میں اپنا نام سن رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا اور اس جانب بڑھنے لگی اور پھر اس درخت کے پاس پہنچ گئی' وہ دھواں سا میرے اردگرد لپٹنے لگا اور میں نے واضح طور پر خود کو اس درخت میں ضم ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے میں پانی ہوں اور وہ بھی پانی ہے اور دونوں کا وجود ایک ہو رہا ہے۔ مجھے سب کچھ ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا اور میرے سارے حواس کام کرنا بند ہو گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ موت آ گئی۔
میری آنکھ کھلی تو میں ایک بہت بڑے ہال میں تھی۔ اس کا دوسرا کنارہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہال عجیب و غریب چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں تقریباً ہر شے سرخ تھی۔ دروازے سے ایک سرخ قالین اندر تک بچھا ہوا تھا جس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ مختلف جانور اور انسان بت کی طرح ایستادہ تھے۔ وہ بے جان دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں دیدوں میں حرکت کر رہی تھیں' وہ اپنا چہرہ اِدھر اُدھر نہیں موڑ سکتے تھے بس دیدے ہی گھما کر دیکھ رہے تھی۔ ان سب کے لباس سرخ اور سنہرے رنگ کے تھے۔ میں یوں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے آگے ہی آگے دھکیل کر لیے جا رہی ہے۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے' میں آگے آگے ہی چلی جا رہی تھی مگر کوئی دوسرا کنارا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں طرف جانور اور انسان ویسے ہی دکھائی دے رہے تھے کہ اچانک وہ ہال ختم ہو گیا اور میں نے خود کو ایک دوسرے کمرے میں پایا۔ وہاں دیواریں سیاہ رنگ کی تھیں لیکن تیز سرخ روشنی میں کوئی نقاب پوش کھڑا تھا۔ اس کے سر سے پاؤں تک لمبا سا کوٹ تھا، جس سے اس کا سر بھی ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے رک گئی تب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو میری چیخ نکل گئی۔ اس کوٹ کے اندر ایک ڈھانچہ تھا اس کی آنکھوں سے پیلی روشنی نکل رہی تھی' دیدے کبھی باہر نکل آتے اور کبھی اندر چلے جاتے۔ کبھی وہ ڈھانچہ ہنسا تو یوں آواز نکلی جیسے کسی کار کے بریک چرچرائے ہوں پھر تیز اور نوکیلی آواز میں وہ ڈھانچہ کہنے لگا۔
”اے لڑکی! تم ہماری جُو (علاقہ) میں رہ کر ہی ہمارے خلاف سوچ رہی ہو۔ ہال میں دیکھ کر آئی ہو نا...... یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح ہمارے خلاف سوچا تھا' ہم تمہیں سزا دیں گے لیکن تمہاری مرضی کی' تم ہماری جُو دیکھو پھر جہاں رہنا

چاہو...... ہم تمہیں وہیں رکھ دیں گے۔"

میں جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میری آواز ہی نہ نکل سکی اور وہ ڈھانچہ بدترین آواز نکالتا ہوا دھواں میں تبدیل ہو کر غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرہ نہ رہا اور میں نے خود کو ایک جنگل میں پایا۔

اس میں ہر شے سبز تھی۔ پتے، تنے اور جھاڑیاں تک۔ اس وقت میں دہشت زدہ ہو گئی جب ان درختوں پر ہر طرح کے سانپ پھر رہے تھے۔ ان کی پھنکار کے ساتھ آگ بھی لپکتی تھی۔ ہر طرف رینگتے ہوئے سانپ دیکھ کر مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

میں وہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی راستا نہیں تھا لیکن سامنے ایک راستا جا رہا تھا۔ میں اس طرف بھاگی اور میں جس قدر بھاگتی جا رہی تھی اسی قدر وہ راستا بھی پیچھے کی طرف جا رہا تھا' یہاں تک کہ میں اس جنگل سے نکلتی چلی گئی۔

میرے سامنے ساحل تھا اور اس سے آگے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس کی سنہری ریت پر جا کر میں گر گئی۔ میں اپنی سانسوں پر قابو پا رہی تھی کہ سمندر کی جانب سے مچھلی کود کر میری طرف آئی اور جیسے ہی وہ ہوا میں آتی تو اسے آگ لگ جاتی' وہ شعلہ بنی میری طرف آتی اور میرے قریب گر کر سنہری راکھ میں تبدیل ہو جاتی' پہلے پہل اکا دکا مچھلی آئی لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں اپنے آپ کو ان سے بچاتی ہوئی، ساحل پر بھاگنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے آگ کا شعلہ بنی مچھلیاں بارش کی مانند برسنے لگی ہیں۔ ان میں اس قدر شدت آنے لگی کہ مجھے یوں لگا جیسے ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ آگ کی تپش تو میں محسوس کر رہی تھی لیکن مجھے آگ لگ نہیں رہی تھی۔ میں ایک لمحہ کے لیے رُک گئی، میں دیکھنا چاہتی تھی کہ مجھے آگ کیوں نہیں لگ رہی، یہ صرف مجھے ڈرایا جا رہا ہے یا اس سے آگ لگ بھی سکتی ہے۔ میرے رُکتے ہی وہ مچھلیاں دائرے میں گرنے لگیں اور آگ میرے چاروں طرف بھڑکنے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ تپش بڑھنے لگی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی۔ آگ مجھے لگ گی نہیں مگر اس کی تپش اس قدر ہو جائے گی کہ میرا وجود پھٹ جائے گا۔ اب وہاں سے فرار کا کوئی راستا نہیں تھا۔ جبکہ آگ کی دیوار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جس میں میرا بدن جلنے لگا۔ میرے حواس مختل ہونا شروع ہو گئے تو میں نے فیصلہ کیا کہ اس آگ کی دیوار کو چیر کر نکل جاؤں۔ میں نے پھر ایسا ہی کیا اور ایک طرف سے آگے بڑھی اور اس دائرے سے نکلتی چلی گئی۔

میرے حواس بحال ہوئے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بلکہ میں ایک کمرے میں تھی جہاں بہت سارے لوگ خاموشی سے کام میں مصروف تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک درمیان سے دائیں طرف بالکل ڈھانچے تھے، ان پر ذرا سا بھی گوشت نہیں تھا۔ ان کی ہڈیوں میں سے پار دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف ان پر گوشت تھا۔ ان کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا، ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ان کے سامنے ہڈیوں کا انبار لگا ہوا تھا اور وہ انہیں جوڑ رہے تھے۔ انہوں نے میرے وہاں ہونے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں وہاں سے کہیں باہر نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہی ڈھانچہ میرے سامنے آ گیا، وہ بھیانک آواز میں ہنستے ہوئے بولا۔

"اب بتاؤ تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟"

"نہیں...... نہیں...... میں یہاں نہیں رہنا چاہتی...... میں...... میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" میں نے بمشکل کہا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں کی اور چند لوگوں کو حکم دیا۔

"اسے بھی اپنے جیسا بنا کر ادھر رکھ لو۔" اس نے کہا اور دھواں ہو کر لمحوں میں غائب ہو گیا۔

اس کے حکم پر چند لوگ اٹھ گئے اور میری طرف

بڑھے۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔ میں ڈر کر بھاگی۔ تبھی میرا پاؤں ایک کیل پر پڑا اور میں درد کی شدت سے بے حال ہو گئی۔ لہو میرے پاؤں سے نکل اُبلنے لگا۔ خون دیکھ کر وہ سارے ڈھانچہ نما انسان اپنی جگہ رک گئے پھر چیخ مار کر پلٹے ہی تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو اسی درخت کے ساتھ لگے ہوئے پایا۔ میرے ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ بلاشبہ سارا اسٹاف جا چکا تھا۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ نجانے کتنے ہی لمحے لگے مجھے حواسوں میں آتے ہوئے۔ میں جہاں خوف زدہ انداز میں ہر طرف دیکھ رہی تھی، وہاں اپنے بچ جانے پر خوش بھی تھی۔ میں نے جان بچ جانے پر شکر ادا کیا اور فوراً ہی کار پارکنگ کی طرف بڑھی۔ تاکہ جتنی جلدی ہو سکے میں وہاں سے نکل جاؤں۔ میں پارکنگ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ میری نگاہ اپنے آفس کی عمارت پر پڑی۔ اس وقت میں بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو دبایا تھا جب میں نے دیکھا کہ دیواروں کے ساتھ وہ گھوسٹ یوں چمٹے ہوئے ہیں جیسے چمگادڑیں چھت کے ساتھ لٹکی ہوتی ہیں۔ اس دھویں کے سے مرغولوں میں فقط آنکھوں ہی سے پہچان ہو رہی تھی۔ میں انہیں گن نہیں سکی کیونکہ میری ساری توجہ اپنی کار تک جانے پر لگ گئی تھی۔

میں پتہ نہیں کس طرح اپنے گھر تک پہنچی تھی۔ میں جس وقت ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھی تو میری ماں نے غور سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! خیر تو ہے؟ یہ تمہارا رنگ کیوں اتنا پیلا ہو رہا ہے؟"

"پتہ نہیں اماں! میں کچھ نہیں جانتی' مجھے بس سونا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تو اماں پھر حیرت سے بولیں۔

"بات کیا ہے بتاؤ تو سہی، تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟ رات بھی تم اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی بیٹھی سو گئی تھیں۔"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"کیا...... کیا...... میں کمپیوٹر کے سامنے کام کرتے ہوئے سو گئی تھی؟"

"تو اور کیا، وہ تو میں نے بند کیا اور تمہیں اٹھ کر بیڈ پر لیٹنے کو کہا۔" یہ کہہ کر وہ حیرت سے بولیں۔

"بتاؤ...... ت ہے، تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟"

"نہیں اماں! کچھ نہیں بس کام کی تھکن کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے بس آرام کرنا ہے۔ رات کے کھانے پر باتیں ہوں گی۔ پلیز اماں۔" میں نے منت بھرے انداز میں کہا اور اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ جہاں لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ مجھے پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں پڑی ہوں۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سوچا یہی کوئی نو یا دس بجے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا، صبح کے چار بج رہے تھے۔ کسی نے بھی مجھے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ میں سکون سے سوئی رہی تھی۔ اس وقت میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ میں بیڈ پر ہی ٹانگیں سیدھی کر کے لیٹ گئی۔ اگرچہ میں یاد نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا، لیکن میں اس پر سوچنا چاہتی تھی۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ سب نیند میں نہیں تھا۔ ابھی میں سو کر اٹھی تھی تو نیند کی حالت میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں کام کرتے ہوئے سو جاؤں یا نیند کی حالت میں آفس سے نکلوں۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک میری نگاہ اپنے پاؤں پر پڑی جو خون آلود تھا، میرے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی ہے۔ میں بے حد خوف زدہ ہو گئی۔ ایسا ہونا ناممکن تھا۔ پاؤں خون آلود بھی ہو اور اس میں چاہے معمولی سا

سوراخ بھی ہو اور اس میں تکلیف نہ ہو۔ اس وقت میرے ہوش اڑ گئے جب میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے پاؤں کو دبا کر بھی دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں خوف کے مارے پھر منہ سر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی مگر مجھے نیند نہ آئی۔ اسی الجھن میں صبح ہوگئی۔

میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچی تو اماں نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج تم آفس سے چھٹی کرلو بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ چھوڑ و ایسی نوکری کو جس میں بندے کو اپنا بھی ہوش نہ رہے۔ پتہ ہے رات جب میں تمہیں کھانے کے لیے بلانے گئی تھی تو تم اس قدر گہری نیند میں تھیں کہ میرے جگانے پر بھی نہیں جاگی...... اللہ معاف کرے اتنا کام...... آفس کیا ہوا بوچڑ خانہ ہوگیا۔''

''نہیں اماں! میں آفس تو جاؤں گی۔ ادھورا کام مکمل تو کرنا ہی ہوگا۔'' میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''ایک دن نہ جانے سے کیا ہو جائے۔ چہرہ دیکھا ہے اپنا؟'' اماں نے تنک کر کہا۔

''میں نوکری چھوڑ دوں گی' جلدی چھٹی لے کر آ جاؤں گی لیکن ایک بار جانا تو ہوگا۔'' میں نے بضد ہوتے ہوئے کہا تو اماں نے بھی اپنی ضد چھوڑ دی۔ میں نے ناشتا کیا اور گھر سے باہر آگئی۔ میں نے عادت کے مطابق کار میں بیٹھتے ہوئے سیل فون پر وقت دیکھنا چاہا تو وہ بند تھا۔ میں نے اسے آن کردیا۔ اگرچہ میرا اپنا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں آفس جاؤں لیکن میں نے رات ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ میں ہر حال میں الوینہ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اور میں نے اسے مذاق سمجھ کر خواہ مخواہ یہ بلا اپنے سر ڈال لی تھی۔ اب میں اس سے مل کر اس بلا سے چھٹکارا پانے کا کوئی حل سوچنا چاہ رہی تھی اور اس کے لیے مجھے ایک بار ہی آفس ضرور جانا تھا۔ ورنہ میرا قطعاً جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس عمارت میں داخل ہوں۔

اس وقت میں مال روڈ پر نہر کنارے جا رہی تھی۔ ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھا۔ میں بھی کوئی اتنی زیادہ اسپیڈ میں کار نہیں چلا رہی تھی۔ تب اچانک نہ جانے کیا ہوا، ایک دم سے ساری سڑک صاف ہوگئی۔ کوئی بھی گاڑی سڑک پر نہیں تھی۔ تا حد نگاہ نہ کوئی گاڑی اور نہ کوئی بندہ، یوں جیسے پھونک مار کر سب کچھ صاف کردیا گیا ہو۔ میں حیران تھی کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے، تبھی میرے ہوش اڑ گئے جب کافی آگے سے سڑک میں دراڑ پڑی اور اگلی طرف سے سڑک اوپر کو اٹھ گئی۔ میں نے پورے زور سے بریک لگائے، مگر گاڑی نہیں رُکی۔ وہ اسی رفتار سے اس گڑھے میں جا گری۔ تب میرا کار پر کوئی کنٹرول نہیں رہا۔ مجھے لگا کار فضا میں تیر رہی ہے اور پھر تیرتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہر طرف اندھیرا ہے لیکن نیلی، پیلی، سبز اور سرخ روشنیاں سامنے سے یوں پڑ رہی تھیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی تھیں اور کبھی الگ الگ ہو جاتیں۔ پھر وہ سارا دھندلا منظر صاف ہونے لگا۔ میں اس وقت ایک بہت بڑی شاہراہ پر تھی۔ جس طرح کوئی انڈر گراؤنڈ ٹرین یا سپر ہائی وے ہو۔ میرے ہر طرف زن زن کرتی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اچانک ایک بہت بڑا اسٹیڈیم آ گیا۔ جہاں پر میری کار رک گئی۔ جیسے ہی میں گاڑی سے باہر آنا چاہا کار کھلی اور دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ میں سیٹ سے اٹھ کر باہر آگئی۔ تبھی ہر طرف بیٹھے ہوئے لوگ دکھائی دیئے۔ وہ کوئی عجیب سی مخلوق تھی۔ ان کی جسامت انسانوں کے جیسی تھی لیکن ان کے چہرے ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ میں ابھی انہیں دیکھ ہی رہی تھی کہ لمبے کوٹ میں ملبوس وہ ڈھانچہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر اپنی

کریہہ اور کرخت آواز میں بولا۔

''تم کب تک ہم سے بچ کر رہو گی۔ ایک دن تم بھی ہماری دنیا میں آ جاؤ گی' ہماری دنیا میں آنے پر جتنی دیر لگاؤ گی' تمہیں اتنی ہی سخت سزا دی جائے گی' آج اگر آ جاؤ تو تمہیں معافی مل جائے گی ورنہ نہیں۔''

''میں اگر تمہاری دنیا میں نہ آنا چاہوں تو......'' میں کافی حد تک خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اب ایسا ممکن نہیں رہا' وہ دیکھو پہچانتی ہو اسے؟'' اس نے اپنی دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں تیز روشنیوں میں نہائی ہوئی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے بھی ایک لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا تو اسے دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ وہ الوینہ تھی۔ اس کا سارا چہرہ کٹا پھٹا ہوا تھا۔ سارا چہرہ ہلکے سبز رنگ کا اور ہونٹوں پر سرخی کی بجائے تازہ لہو تھا، جیسے وہ ابھی کچا گوشت کھا کر آئی ہو۔ اس نے شعلہ بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور تیز اور کرخت آواز میں بولی۔

''تمہارا انجام بہت بھیانک ہونے والا ہے...... تم نے مجھے بھی اپنے ساتھ ڈبو دیا' میں نے تو چاہا تھا کہ تجھے اپنے ساتھ اس دنیا میں لے آؤں...... لیکن تم اکیلے ہی آنا چاہتی تھی' اب بھگتو...... وہ دیکھو مرا ہوا ہاتھی' جس پر چوہے دوڑ رہے ہیں۔ چلو پہلے اس کا گوشت کھاؤ پھر تجھے سزا سنائی جائے گی۔''

میں نے کافی فاصلے پر ایک مرے ہوئے ہاتھی کو دیکھا۔ اس پر سیکڑوں کی تعداد میں چوہے پھدک رہے تھے۔ وہ سارے چوہے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ کوئی بھی سیر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کراہت بھرے لہجے میں انکار کردیا تو ڈھانچے کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔ وہ اپنی کریہہ اور کرخت آواز میں بولا۔

''تم نے انکار کر کے ہمارا اصول توڑ دیا ہے' یہ گوشت تمہیں ہر حال میں کھانا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے دھاڑ ماری تو وہ سارے چوہے ایک دم رک گئے اور وہیں کھڑے کھڑے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک دم سے وہ سارے میری طرف بھاگ اٹھے۔ میرے پاس صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں بھاگ جاتی یا پھر ان کا مقابلہ کرتی۔ میں دونوں کام نہیں کرسکتی تھی۔ باوجود کوشش کے میں وہاں سے ہل بھی نہ سکی۔ وہیں جمی رہی۔ میرے سامنے الوینہ اور وہ ڈھانچہ کریہہ انداز میں ہنسنے لگے۔ چوہے میرے بالکل قریب آ چکے تھے۔ میری مزاحمت دم توڑ گئی۔ میں نے اپنا آپ ان کے کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ جیسے ہی پہلا چوہا میرے بدن پر رینگنے لگا، میں بے ہوش ہوگئی۔ پھر مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں مجھے نہیں پتہ چلا کہ میں کہاں پر ہوں۔ میرے ذہن میں رنگ برنگی روشنیاں، ہاتھی، ڈھانچہ، چوہے اور الوینہ تھی۔ پھر ایک دم سے سب کچھ گڈمڈ ہوگیا۔ دھیمی دھیمی روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس میں سفید رنگ نمایاں تھا۔ پھر جب یہ ساری دھند چھٹی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اسپتال میں ہوں۔ میری اماں اور ابا کے ساتھ بھائی بھی موجود تھا۔ فطری طور پر میرے منہ سے نکلا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''تم اسپتال کے کمرے میں ہو۔'' بھائی نے نرمی سے بتایا تو ابا کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔

''میں یہاں کیسے آئی؟ میں تو...... میں تو...... آفس......'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا تو سب کچھ میرے ذہن میں تازہ ہوگیا۔

''گولی مارو آفس کو' یہ منحوس مارا آفس ہی تو لے ڈوبا ہے۔'' اماں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا، تاہم بھائی نے بتایا۔

''دیکھنے والوں کی گواہی کے مطابق تم نے ڈرائیونگ کے سارے سابقہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش میں اپنی گاڑی کو نہر میں ڈال دیا۔ تمہارے لیے

تارکول کی سڑک کم پڑ گئی تھی نا' تم نے سوچا کہ نہر میں کار چلاؤ گی۔"

"کیا میں نہر میں گر گئی تھی۔" میں نے حیرت سے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ ذرا سی دیر میں ڈاکٹر کے ساتھ نرسیں بھی آ گئیں۔ چیک اپ کے بعد انہوں نے حالت تسلی بخش قرار دیتے ہوئے کہا۔

"مریض کو آرام کی ضرورت ہے۔ پلیز اس سے کم سے کم باتیں کی جائیں، انہیں آرام کرنے دیا جائے۔"

ڈاکٹر کے مشورے کے بعد اماں اور ابا نے یہی سوچا کہ دن کے وقت بھائی ادھر رہے اور رات کے وقت اماں آ جائیں۔ سو اماں اور ابا دونوں گھر چلے گئے اور میں نیند میں کھو گئی۔

سہ پہر کے بعد میری آنکھ کھلی تو بھائی کمرے میں نہیں تھا بلکہ میری سامنے کی کرسی پر الوینہ موجود تھی۔ مجھے جاگتا دیکھ کر بولی۔

"شکر ہے خدا کا تم بچ گئیں۔"

"لیکن میرے ساتھ کیا ہوا اور میں کس اذیت سے گزر......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"میں جانتی ہوں' میں بھی یہ سب بھگت چکی ہوں۔"

"پھر بھی تم نے مجھے......" میں نے سخت غصے میں اس کی طرف دیکھ کر کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"اس سے پہلے کہ تمہارا بھائی آ جائے' میری بات غور سے سنو۔" یہ کہہ کر اس نے کرسی قریب کی اور کہتی چلی گئی۔ "یہ سچ ہے کہ جن، بھوت یا گھوسٹ کی نشان دہی کرنے والا سوفٹ ویئر موجود ہے لیکن جس سائیٹ سے میں نے اسے ڈاؤن لوڈ کیا وہ کچھ ایسے لوگوں کی سائیٹ تھی جو ہیکرز ہیں اور لوگوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سافٹ ویئر میں ایسا وائرس داخل کر دیا جو سیدھا دماغ کے خلیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

"ایسا کیا......؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"جی...... اور سنو، تم نے جب وہ کاپی کر لیا تو میرے کمپیوٹر سے وہ ویسے ہی خراب ہو گیا۔ یاد ہے تم نے چائے پی تھی۔ میرے خیال میں اس دوران تم نے کاپی کیا تھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ کہنے لگی۔ "یہ مجھے اس لیے پتہ چلا کہ اس کے فوراً بعد میرے ساتھ ہونے والے سارے پرابلم ختم ہو گئے۔ تم چونکہ ٹھیک ٹھاک تھیں۔ کسی قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ سو میں بھی خاموش رہی کہ اب تجھے کیا بتاؤں۔ اب تمہارے حادثے کا سن کر میں آئی ہوں تو آتے ہی تمہارا سیل فون دیکھا جو نہیں ملا' شاید نہر میں کہیں پڑا ہو خیر' میں نے اس سوفٹ ویئر کا اینٹی وائرس تلاش کر لیا ہے' وہ تمہارے کمپیوٹر میں۔"

"لعنت بھیجو اس پر...... میں سب صاف کر دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا، میرے پاؤں پر کیل چبھ جانے کا نشان تھا۔ اگر یہ میرا محض دماغی خلل تھا وہ کیسے پڑ سکتا ہے؟ میں نے جلدی سے اپنا پاؤں دیکھا تا کہ الوینہ کو دکھا سکوں۔ وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ اتنے میں بھائی آ گیا۔ الوینہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا بھائی! میں اب چلتی ہوں پھر آؤں گی۔ یہ سی ڈی چھوڑے جا رہی ہوں۔ اسے دے دیجیے گا۔"

میں نے سکون سے آنکھیں بند رکھیں۔ میں اب اس بارے میں سننا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

ثناء عارف...... گوجرانوالہ

جواب:۔ آیات شفاء 21 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کریں گھر کے تمام افراد پئیں صبح نہار منہ روزانہ۔

کاروبار کے لیے:۔ بعد نماز عشاء 111 مرتبہ سورۃ قریش اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

سعدیہ صدیق...... شورکوٹ

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ آل عمران آیت نمبر 38 روزانہ 101 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں پھر۔

ثناء عشرت...... سہالہ

جواب:۔ نیم کے پتوں کا رس نکال کر پورے جسم پر لگائیں۔ دس منٹ بعد غسل کر لیں۔ ہفتہ میں تین مرتبہ۔

رشتہ کے لیے:۔ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز فجر دعا بھی کریں۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے۔

ثناء عشرت...... راولپنڈی

جواب:۔ اللہ سے مانگیں اور خود بھی کوشش کریں۔ ہر نماز کے بعد سورۃ اخلاص 11 مرتبہ۔

ماریہ عظیم...... واہ کینٹ

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ وظیفہ شروع کر دیں اور نتیجہ آنے تک جاری رکھیں ان شاء اللہ کامیابی ہو گی۔ دعا بھی کریں۔

ثمازیہ

جواب:۔ مسئلہ ا:۔ قسم کی اہمیت کے متعلق عالم سے رجوع کریں۔ وظیفہ جاری رکھیں۔

مسئلہ ۲:۔ سورۃ قریش 111 اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ اچھی اور جلد نوکری کے لیے دعا کریں اور کچھ نہ پڑھیں۔

تحریم...... جھڈو

جواب:۔ ا:۔ آیات شفاء صبح و شام 7،7 مرتبہ پڑھ کر دم کریں اور پانی بھی پئیں۔

۲:۔ بچی جب سو جائے تو ماتھے اور سینے پر انگلی (شہادت) سے (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) لکھ دیا کریں۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

بشریٰ ملک...... فیصل آباد

جواب:۔ مسئلہ ا:۔ کوئی حل نکالیں۔

۲:۔ مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد 7،7 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھا کریں۔

م ع...... مانگٹ

جواب:۔ فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر "یا قوی" 11 مرتبہ پڑھا کریں۔ قوت حافظہ کے لیے۔

بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔

معاشی مسائل اور گھر بکنے کے لیے دعا کریں۔

شمائلہ کرن...... چھوٹا گھسیٹ پورہ

جواب:۔ آپ نے اپنے والد کا نام تو لکھا نہیں خط میں؟ استخارہ کر لیں۔

معاشی حالات کے لیے سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں پھر۔

کومل رباب...... لاہور

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ شمس 41 مرتبہ پانی پر پڑھ کر دم کریں۔ صبح نہار منہ گھر کے تمام افراد کو

پلائیں۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود پڑھیں۔
نیت بھی ہو کہ فرمانبردار بن جائیں۔

کومل......لاہور

جواب:۔ "یامانع" ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ۔ اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔
معنی ذہن میں ہو اور تصور ہو کہ واپس لوٹ رہا ہے۔

ثمیرا اصغر......چھوٹا گھسیٹ پورہ

جواب:۔ اللہ آپ کی والدہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔
سورۃ شمس 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔
پانی پر دم کر کے والد کو پلایا کریں۔ روزانہ کسی بھی وقت۔
نیت: جو مقصد ہے۔

سلمیٰ بتول......راولپنڈی

جواب:۔ مسئلہ ا:۔ سورۃ قریش 111 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔
مسئلہ ۲:۔ سورۃ بینہ (پارہ 30)۔ صبح وشام 7،7 مرتبہ پانی پر پڑھ کر پئیں۔ دم بھی کریں۔ اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔ "یا سلام" کا ورد رکھیں۔
مسئلہ ۳:۔ فجر اور عصر کی نماز کے بعد ایک تسبیح استغفار، ایک تسبیح درود شریف۔ توبہ کریں اللہ سے رجوع کریں۔
"یا مصور" عشاء کی نماز کے بعد 101 مرتبہ اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف روزانہ۔ روزہ کھولتے وقت 21 مرتبہ پڑھ کر دم کر دیں۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دعا بھی کریں۔

K.A......لاہور

جواب:۔ سورۃ والضحیٰ فجر اور عشاء کی نماز کے بعد 21،21 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ (پہلے استخارہ کرلیں)۔

علینہ نواز......سرگودھا

جواب:۔ "یا فتاح" ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ دعا کریں۔

نگہت شاہین......ضلع ساہیوال

جواب:۔ رشتے تو اللہ بناتا ہے۔ سورۃ اخلاص پڑھیں۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ، دعا کریں۔
خرم شہزاد جس کمپنی سے ویزا لگوا رہے ہیں وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ کسی دوسرے سے رابطہ کریں ویزے کے لیے۔

ج......گوجرانوالہ

جواب:۔ "یا لطیف" 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ تصور ماموں کا رکھیں اور مقصد ذہن میں ہو۔
مسئلہ ۲:۔ روزگار کے لیے۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔

روبینہ یاسمین......کراچی

جواب:۔ فجر والا وظیفہ جاری رکھیں۔ کبھی دیر ہوتی ہے لیکن مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔
فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین ایک مرتبہ اور ایک مرتبہ سورۃ مزمل پڑھا کریں۔ دعا بھی کیا کریں۔ کوئی مسئلہ اٹکے گا نہیں۔
مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد سورۃ الفلق، سورۃ الناس 19،19 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ سورۃ عبس پڑھنا بند کر دیں۔ بہن کے لیے بھی دعا کیا کریں۔

عبدالرحمن......میانوالی

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ عبس 3 مرتبہ۔ پانی پر دم کر کے گھر کے تمام افراد کو پلائیں۔

افشاں......اوکاڑہ

جواب:۔ آپ کے رشتے کے لیے یہ دونوں لڑکے ٹھیک نہیں۔
بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔
ہر نماز کے بعد سورۃ فلق، سورۃ الناس 9،9 مرتبہ۔ بندش ختم ہو جائے گی دعا بھی کریں۔

آمنہ پروین......اسلام آباد

جواب:۔ مسئلہ ا، ۳:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر دعا کریں۔
مسئلہ نمبر ۲:۔ ہر نماز کے بعد سورۃ قریش 21 مرتبہ درود شریف 3،3 مرتبہ اول وآخر بھائی خود پڑھیں۔

سمعیہ......سیالکوٹ

جواب:۔ مسئلہ نمبر ا:۔ حکیمی علاج کروائیں۔
مسئلہ نمبر ۲:۔ فکشفنا عن...... حدید (سورۃ ق آیت 22)۔ 101 مرتبہ اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔ عشاء کی نماز کے بعد ایک گلاس پانی پر دم کرلیں۔ صبح آنکھیں دھوئیں پانی مٹی میں جائے روزانہ۔

ثوبیہ ناہید......فیصل آباد

جواب:۔ مسئلہ ا:۔ بعد نماز فجر سورۃ یٰسین 3 مرتبہ۔
بعد نماز عشاء "یا مذل" 101 مرتبہ۔ اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔ معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں کہ اللہ اس کو اس کے مقصد میں ذلیل وخوار کر رہا ہے۔ دعا بھی کریں۔

ع۔ر......میانوالی

جواب:۔ بعد نماز عصر روزانہ ایک تسبیح استغفار، ایک تسبیح درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔

ک۔ب......میانوالی

جواب:۔ مسئلہ ا:۔ روزانہ 41 مرتبہ سورۃ شمس پڑھ کر پانی پر پھونکیں۔ بھائی کو پانی پلائیں۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ نیت ہو کہ فرمانبردار بن جائے۔ ذمہ داری کا احساس ہو۔
مسئلہ ۲:۔ سرسوں کا (کڑوا تیل) پر 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر دم کریں۔ روزانہ رات کو مالش کریں۔ صبح غسل کرلیں۔

فرزانہ......سکھر

جواب:۔ ا:۔ میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے؟
۲:۔ سورۃ قریش 21 مرتبہ ہر نماز کے بعد اول وآخر 7،7 مرتبہ درود شریف۔
۳:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 روزانہ 101 مرتبہ پڑھیں۔ بعد نماز عشاء اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ اگر جسمانی مسئلہ ہے تو علاج کروائیں۔
۴:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں۔ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے اول وآخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔

بنت سلیم......نواب شاہ

جواب:۔ رشتوں کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔
مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد سورۃ الفلق، سورۃ الناس 19،19 مرتبہ۔
نیت: بندش کے توڑ کے لیے۔

ناہید یوسف......لاہور

جواب:۔ صدقہ دیں اور یہ وظائف جو میں دے رہا ہوں ہمیشہ جاری رکھیں۔ روزگار بھی ہوگا اور صحت بھی اچھی رہے گی۔ ہر ماہ صدقہ دیتی رہا کریں۔ پچھلے وظائف بند کردیں۔ یہ وظائف آپ دونوں نے کرنے ہیں۔

فجر اور مغرب کی نماز کے بعد۔ سورۃ الفلق، سورۃ الناس 21,21 مرتبہ۔ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں اور پانی پر دم کریں کارخانہ میں چھڑکیں اثرات کے لیے۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ روزگار کے لیے دعا بھی کریں۔

محمد عاقب......میر پور خاص

جواب:۔ استخارہ کا طریقہ عالم سے پوچھ لیں۔ "یا فتاح" امتحان میں کامیابی کے لیے۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔

"یا قوی" فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں 11 مرتبہ۔

شمع......کراچی

جواب:۔ رشتے کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد سورۃ الفلق، سورۃ الناس 19,19 مرتبہ۔

نیت: رکاوٹ دور ہو۔

نازیہ مختار......فیصل آباد

جواب:۔ آپ زیادہ سوچنا چھوڑ دیں اور حقیقت سے منہ نہ چرایا کریں۔

بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔

نوکری کے لیے:۔ سورۃ قریش 111 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

روزانہ ایک تسبیح استغفار ایک تسبیح درود شریف پڑھا کریں۔ دعا کریں اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے نومبر 2013ء

نام .... والدہ کا نام .... گھر کا مکمل پتا ....

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں ....

خوشبو سخن

عمر اسرار

غزل

ناکام محبت میں تو ہونا بھی یہی تھا
ہے مجھ کو خبر آپ کا منشاء بھی یہی تھا
ہے یہ بھی حقیقت کہ محبت نہیں چھپتی
تم پردہ نہ رکھ پاؤ گے خدشہ بھی یہی تھا
دل توڑنے والے کبھی جوڑا نہیں کرتے
شکوہ بھی یہی تھا میرا دعویٰ بھی یہی تھا
ہر درد کو سینے سے یوں ہنس ہنس کر لگایا
یارب تیرے بندوں کا اشارہ بھی یہی تھا
ناقدری چاہت کا گلہ کیا کریں ان سے
ایوان محبت کا تقاضا بھی یہی تھا
وہ چھوڑ گیا بیچ میں منجدھار میں لا کر
قطرہ بھی وہی تھا میرا دریا بھی وہی تھا
حالات کی تلخی پہ نہ گھبراؤ غزل تم
ہم درد کے ماروں کا نصیبہ بھی یہی تھا

سلمٰی غزل......گلشن اقبال، کراچی

بنت حوا

اے بنت حوا
کچھ تو سوچ ذرا
کیوں خود کو یوں عام کر رہی ہو
عزت اپنی نیلام کر رہی ہو
یہ ابن آدم
تجھے فریب دے رہے ہیں
تیری چاہت سمیٹ رہے ہیں
اپنی ہوس بجھا رہے ہیں
تجھے پامال کر رہے ہیں
بنت حوا
کیوں اپنی وفائیں سونپ رہی ہوں
زہر خود میں سمو رہی ہو
اس کھیل میں شامل ہو کر
مقام اپنا گنوا رہی ہو
بنت حوا سنبھل ذرا
سنہرے جذبے جو تو ان پر
لٹا رہی ہے
یہ حق ہیں کسی اور کا
جو تو ان کو نواز رہی ہے
یہ ابن آدم تجھ سے کھیلتے ہیں
محبت تیری سمیٹ کر
شکار اگلا تلاشتے ہیں
اے بنت حوا
خالی ہاتھ خالی دامن
ویران آنکھوں اور ویرانی دل کے ساتھ
روح کی شکستگی لیے
پچھتائے گی عمر بھر
سو
اے بنت حوا سنبھل جا
کچھ تو سوچ ذرا

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

دل کو ویران کر گئے شاید
خواب سارے بکھر گئے شاید
ایک سناٹا رہ گزر میں ہے
قافلے سب گزر گئے شاید
جس طرف دیکھیے قیامت ہے
نیک انسان مر گئے شاید
ٹیس اٹھی نہیں ہے مدت سے

زخم سب دل کے بھر گئے شاید
خوش بوئے گل نہیں چمن میں جمال
پھول سارے بکھر گئے شاید
سمیع جمال......کراچی

غزل

تیرے وہم و گمان سے اترے
جیسے ہم آسمان سے اترے
آشیاں تھا نہ ڈال تھی نہ شجر
جب پرندے اڑان سے اترے
لاکھ غافل ہوں بندگی سے مگر
یاد دل میں اذان سے اترے
ہیں جواں بیٹیاں بھی غربت بھی
قرض کیسے کسان سے اترے
ساتھ سایہ بھی نہ رہے شاید
گر دل مہربان سے اترے
بے رخی کرتی ہے جگر کو فگار
درد دل میں بیان سے اترے
تھی زمیں خوں سے سرخ جنگل کی
جب شکاری مچان سے اترے
لے نہ ڈوبے مجھے کہیں نیر
پانی نیچے نشان سے اترے
نیر رضاوی

غزل

بن ترے میں کچھ بھی نہیں
جیون سارا جل تھل ہے
ہجر زدوں کا حال لکھوں تو
دل بھی بوجھل بوجھل ہے
سختی موسم کی شدت کیا
ہم نے اوڑھا آنچل ہے
تجھ سے غافل کب رہتا ہوں
جسم و جاں میں ہر پل ہے
سونپ کر اپنا حسن سراپا
آنکھ سے اب کیوں اوجھل ہے
دور ہوں کتنے لیکن پھر بھی
دل دھڑکن تو مسلسل ہے
ظریف احسن سمجھتا ہے
دل دونوں کا پاگل ہے
ظریف احسن......کراچی

غزل

ہم رہیں خندہ جبینوں کی طرح
ہوں انگوٹھی میں نگینوں کی طرح
پیار کی فصلیں اگائیں دوستو
دل ہوئے بنجر زمینوں کی طرح
اس طرح ہو زندگی پر اختیار
درد ہوں دل میں دفینوں کی طرح
کیا عجب ہے اس مشینی دور میں
ہوگئے ہیں ہم مشینوں کی طرح
نام روشن کیجیے اسلاف کا
اچھے لائق جانشینوں کی طرح
زندگی میں پا گئے اعلیٰ مقام
جو رہے صحرا نشینوں کی طرح
کس لیے آپس میں لڑتے ہیں قمر
ہم مسلماں بھی کمینوں کی طرح
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

آگ دل میں لگا کے چھوڑ گیا
ایک محشر اٹھا کے چھوڑ گیا
جو بنایا تھا آرزوؤں کا
وہ نشمین جلا کے چھوڑ گیا
جرم کیا ہے سمجھ نہیں آیا
دل کی دنیا مٹا کے چھوڑ گیا
وہ میری پر خلوص چاہت کو
اک تماشا بنا کے چھوڑ گیا
سامنا کیا کرے گا وہ رانا
جو مجھے آزما کے چھوڑ گیا
قدیر رانا......راولپنڈی

گیت

جب رات کا مخمل گرھن سے جلنے لگے تو جنگل روتے ہیں
مرے ہم نشیں تری جدائی میں تھکن ہونے لگے تو جنگل روتے ہیں
کبھی رستے وصل کے جاتے ہیں تری طرف
ہائے پگڈنڈی کی بانوری بھی چلی ہے تری طرف
جو مہکتی ناگن سے کوئی جوگی پیار کرنے لگے تو جنگل روتے ہیں
مرے ہم نشیں تری جدائی سے تھکن ہونے لگے تو جنگل روتے ہیں
اک نگاہ کی جستجو میں زندگی ہوئی بے حال
اک تنہائی کی خوش فکری سے محبتوں کے جال
سرِ شام آنکھوں میں یوں ہجر کی نمی اترنے لگے تو جنگل روتے ہیں
مرے ہم نشیں تری جدائی سے تھکن ہونے لگے تو جنگل روتے ہیں
نگر نگر پھرتا ہے عشق قرب کے جنوں میں
رقیب نہیں ہم رکاب ہے اماوس کے سکوں میں
پھر کہیں تاریکیوں کے پڑاؤ میں کوئی پوشاک بدلنے لگے تو جنگل روتے ہیں
مرے ہم نشیں تری جدائی سے تھکن ہونے لگے تو جنگل روتے ہیں
سید عبداللہ شاہد......حیدرآباد

غزل

شجر سارے جنگل کے کٹے ہیں
گھونسلے پرندوں کے آ گرے ہیں
شکاری کی نظر سے بچ کر
پرندے درختوں میں جا چھپے ہیں
دکھ تو صرف بات کا ہے
مرے اپنے سارے جدا ہوئے ہیں
بربادیٔ چمن ہوئی ہے یہاں کیسے
رگ و گل حیران کھڑے ہیں
میر کارواں جو کہتا ہے
اہل چمن اب جا کے بیٹھے ہیں
رہبروں کو روکو اگر روک سکتے ہو
لوگ اب سوئے مقتل چلے ہیں
جن کی خاطر خواہشیں ترک کی اپنی
وہی آخر ہم سے آ کر لڑے ہیں
وسیم اختر......راولپنڈی

غزل

آنکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشاں نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہرباں نہیں ہوتے
تیری دید میں کئی زخم پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسمان نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیاں نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

کاش میرے بس میں ہو!!

کاش میرے بس میں ہو
تیرے غم سمیٹ لوں
تیری ساری اداسیاں
تیرے سارے آنسو
اپنی آنکھوں میں
جذب کرلوں
تم کو نہ کبھی اداس ہونے دوں
دوں اتنی خوشیاں تمہیں
کبھی نہ رونے دوں
کہ زمانے کی تلخیاں
نہ تیرے پاس بڑھیں
تو جس کو چاہے وہ
ہمیشہ تیرے آس پاس رہیں
جیون میں
تیرے آنگن میں
دل میں دھڑکن میں
روشنی سی رہے
خدا کرے کوئی
کبھی کمی نہ رہے
تیری معصوم آنکھوں میں
تھوڑی سی نمی نہ رہے
کاش میں ایسا کرسکوں
کاش میرے بس میں ہو
تیرے غم......

عبدالمالک کیف

غزل

میرے شہر میں ایک ندی سی بنی کھڑی ہے
لگتا ہے آج پھر یہاں بارش پڑی ہے
اٹھ رہے ہیں لوگ گر گر کر ہر گلی میں
کہنے کو تو ہر گلی کشادہ بڑی ہے
کس حکمراں کو ڈھونڈوں کوئی راہنما نہیں ملتا
پہلے ووٹ تھا میری طاقت اب کون سی چھڑی ہے
روتی ہے قوم جب بھی اس آبی سزا کا رونا
وہ کہتے ہیں یونہی سمجھو یہ کاغان اور مری ہے
الٹا پڑا ہے آج پھر کوئی مظلوم اس گڑھے میں
راہگیر ہیں محو تماشا گویا کوئی رنگین پھلجڑی ہے
تم خود ہی کمر کس لو یا مجھ کو قتل کردو
کچھ کرو اس ندی کا یہ تو سر پر آچڑھی ہے
خواب غفلت کے مارے ہم سب کچھ ہی کھو چکے ہیں
اٹھنا نہیں ہے اب بھی میری قوم ضد پر اڑی ہے
تم ڈوب بھی جاؤ تو کچھ مضائقہ نہیں فاروق
تیرے وطن کے حکمرانوں کی بستی تو ہری بھری ہے

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس

غزل

دور نزدیک، نگاہوں سے جہاں بھی دیکھوں
اپنے ہی شہر کے تاریک مکاں بھی دیکھوں
میری بے لوث محبت کو مٹانے والو!
ہر قدم اپنی محبت کے نشان بھی دیکھوں
غیر تو غیر ہے اپنا نظر آتا نہیں
اس بھری دنیا میں چاہے میں جہاں بھی دیکھوں
لوگ آسانی سے ماضی کو بھلا دیتے ہیں
اور میں اپنے ہی ماضی کو عیاں بھی دیکھوں
تلخیاں بیتے دنوں کی بھی بھلاتے ہوں گے
اور میں حال میں ماضی کو رواں بھی دیکھوں
دل میں جو آگ ہے چہرے پہ نمایاں ہے سحاب
میں تصور کی نگاہوں سے دھواں بھی دیکھوں

(صلاح الدین سحاب، پشاور صدر)

ذوق آگہی

عفان احمد

صومالیہ میں پاک فوج کا کردار

صومالیہ میں سوا کروڑ آبادی ہے اور اٹھانوے فیصد مسلمان ہیں، نہایت پختہ قسم کے۔ ان کی پختگی کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ پورے چالیس سال تک عیسائی مشنریاں وہاں کام کرتی رہی ہیں اور چالیس سالوں میں ایک آدمی بھی عیسائی نہیں بنا سکے۔ امریکا نے اپنے پادریوں کی سرزنش کی کہ ہم نے تم پر اتنا روپیہ خرچ کیا ہے تم نے چالیس سالوں میں ایک آدمی بھی عیسائی نہیں بنایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق مغربی ممالک اب وہاں سے اپنی مشنریاں نکال رہے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ اب وہاں دوسرے طریقے سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہاں تیل کے کنویں اتنے ہیں کہ اگر سارے نکل آئیں تو سعودیہ سے بھی وہاں تیل زیادہ ہے، صومالیہ کے ساتھ سوڈان لگتا ہے۔ سوڈان کے حکمران نے بڑے احسن طریقے سے تھوڑی تھوڑی کر کے اسلامی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ کل تک جو بھوکے مرتے تھے اب کافی حد تک گندم میں خود کفیل ہوگئے ہیں۔ امریکا چونکہ اسلام سے خائف ہے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اقوام متحدہ کو استعمال کر رہا ہے۔ اب وہاں سات ہزار پاکستانی فوج بھیجی گئی ہے، اپنوں کے ساتھ لڑنے کے لیے۔ شروع شروع میں چار پانچ امریکی فوجی ہلاک ہوئے ہیں اور بس۔ اب پاکستانی فوجی آگے آگئے ہیں اور بھارت کے فوجیوں کو اسپتال پر لگایا ہوا ہے، وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں اور پاکستانی فوجی لڑتے ہیں۔ صومالیہ کے فوجی بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور پاکستانی فوجی بھی نمازیں پڑھ کر ان پر حملہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں پاکستانیو! تم ہمارے ساتھ کیوں لڑتے ہو؟ تم ہمیں امریکا کے ساتھ لڑنے دو، ہم اس کے ساتھ نمٹ لیں گے مگر پاکستانی فوج امریکا کے ہاتھوں استعمال ہو رہی ہے۔

ذخیرۃ الجنان، ج:۱۳، ص:۷۷

انتخاب: سید عاقب علی...... نواب شاہ

انسان بچ سکتا ہے

تکبر سے سلام کے ذریعے
مصیبت سے صدقے کے ذریعے
بیماری سے دعا کے ذریعے
شیطان سے علم کے ذریعے
گناہ سے اللہ کے خوف کے ذریعے

شجاع جعفری...... تلہ گنگ

مہکتی کلیاں

❁ دو چیزیں جس سے تم اپنے رب کو راضی کرو۔ وہ کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت ہے۔ (حدیث نبوی)

❁ صبیح الکلام شیریں زبان اور فصیح البیان ہونا دنیا کی بہترین چیزوں میں سے ہے۔ (بوعلی سینا)

❁ مہمان کے آگے تھوڑا کھانا رکھنا بے مروتی ہے اور حد سے زیادہ رکھنا تکبر ہے۔ (امام غزالی)

❁ نافرمان بیٹے کا وجود سانپ کے زہر سے زیادہ مہلک ہے۔ (شیکسپیئر)

❁ میں خوش رہتا ہوں کیونکہ میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ (آئن سٹائن)

❁ جو کام برائے خدا کرو اس میں بندوں کا خوف نہ کرو۔ (لقمان حکیم)

◈ افعال خراب پر ندامت نہ کرنا ایک دوسری خرابی ہے۔ (سقراط)

ریاض بٹ...... حسن ابدال

سات چیزیں

علامہ سیوطیؒ کے مطابق یہ سات چیزیں انسان کو ذلیل کردیتی ہیں۔

۱:۔ کسی دعوت میں بن بلائے جانا۔
۲:۔ کسی مجلس میں اتنے رتبے سے بالاتر بیٹھنا۔
۳:۔ مہمان بن کر میزبان پر حکم چلانا۔
۴:۔ دوسروں کی باتوں میں بغیر وجہ دخل دینا۔
۵:۔ ان لوگوں سے خطاب کرنا جو سننا نہ چاہتے ہوں۔
۶:۔ بدچلن سے دوستی کرنا۔
۷:۔ سنگ دل اور حریص دولتمند سے مدد مانگنا۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

جسمانی آرائش

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے۔ جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کرلیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھولیتا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص کے سر پر بال اور داڑھی کے بال ہوں اس کو چاہیئے کہ ان کو اچھی طرح رکھے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

مرسلہ: جبران محبوب...... کراچی

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں ضائع کردیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی، چین میں چینی، انگلستان میں انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جاکر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال و پستی اور نالائقی کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوادیتے ہیں۔

سفیان اشرف...... اوکاڑہ

ذرا مسکرائیے

ایک سکھ نے تین سوئمنگ پول بنوائے گرم پانی کا' ٹھنڈے پانی کا اور ایک خالی۔

دوسرے سکھ نے گرم پانی اور ٹھنڈے پانی والے

سوئمنگ پول بنوانے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔

جب سردی لگے گی تو گرم میں نہاؤں گا اور جب گرمی لگے گی تو ٹھنڈے میں۔ دوسرے سکھ نے پھر پوچھا۔

مگر یہ خالی سوئمنگ پول کس لیے ہے۔

وہ بولا۔ یار! کبھی کبھی نہانے کو دل نہیں بھی چاہتا۔

تنویر...... لاہور

دو ہیروئنچی بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔

ایک بولا۔ میں نے کل سمندر سے ڈھائی ٹن وزنی مچھلی پکڑی۔

دوسرا بولا۔ میں نے کل سمندر میں ڈور ڈالی تو جلتی ہوئی لالٹین نکلی۔

پہلا بولا۔ نہیں تو جھوٹ کہتا ہے۔

دوسرا بولا۔ تو اپنی مچھلی کا وزن کم کردے میں اپنی لالٹین بجھادوں گا۔

احمد علی...... ملیر کراچی

تین چیزیں

تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔
رحم' کرم' دعا
تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔
موت' وقت' گاہک
تین چیزیں بھائی کو بھائی کا دشمن بناتی ہیں۔
زن' زر' زمین
تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔
کھانا' دولت' عورت
تین چیزیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔
سچائی' فرائض' موت
تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔
چوری' چغلی' جھوٹ
تین شخص تین چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔
صابر' مصیبت پر۔ بہادر' مقابلے پر۔ بھائی' ضرورت پر

کوثر جہاں...... راولپنڈی

لعنت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھ طرح کے لوگ ہیں میں نے ان پر لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا۔
(۲) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔
(۳) زبردستی مسلط ہونے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے۔
(۴) اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا۔
(۵) میری اولاد سے اس چیز کو حلال جاننے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔
(۶) میری سنت کو ترک کردینے والا۔

مرسلہ: اسرار علی...... کراچی

انمول موتی

● پیٹ سے بڑھ کر کوئی بدترین برتن نہیں۔ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)
● تلوار کا وار جسم کو زخمی کرتا ہے۔ زبان کا وار روح کو۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
● آدمی کی قابلیت زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔ (حضرت علیؓ)
● ہر شخص سچا دوست تو تلاش کرتا ہے خود سچا بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ (حکیم لقمانؒ)
● وطن کی حفاظت اپنی جان کی حفاظت سے ضروری ہے۔ (صلاح الدین ایوبیؒ)

● دنیا کی فکر کرنا دل کی تاریکی ہے اور آخرت کی فکر کرنا دل کی روشنی ہے۔
● جنت کا راستہ علم ہے۔
● بخیل ہمیشہ ذلیل رہتا ہے۔

نوید اسلم...... منچن آباد

ہڈی کی تاریخ

ہڈی کا نام بادام کے لیے قدیم آرامی لفظ LUS سے ماخوذ ہے۔ روایت ہے کہ ایک بار ایک قدیم بائبل شہنشاہ ہیدریان نے اپنے ایک ماہر روحانیات ربی جوشوا ابن چانن سے پوچھا تھا کہ "خدا آنے والی دنیا میں لوگوں کو کس طرح دوبارہ مجسم کرے گا۔" تو ابن چانن نے جواب دیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی میں موجود LUS ہڈی ہے اس کے پاس اس ہڈی کا نمونہ موجود تھا۔ جو پانی میں ڈالنے سے نرم نہ ہوتی اور آگ میں جلتی بھی نہیں تھی اور ہتھوڑے کی ضرب سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔ عربوں نے اس ہڈی کو الفرہران کا نام دیا تھا۔ 1543ء میں ویسائس نامی ایک سائنسدان نے ثابت کیا کہ انسان میں اس قسم کی کوئی ہڈی موجود نہیں۔

ماخوذ۔ "موت کی تاریخ"

انتخاب: محمد یعقوب' ڈیرہ غازی خان

باتیں دلوں سے کرو

زندگی لمحوں کا کھیل ہے اور لمحے گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ ایک مقررہ وقت پر ہم سب نے اس دنیا فانی کو چھوڑ جانا ہے پھر بھی ہم اس دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے پرائے کا کوئی ہوش ہی نہیں آخر کیوں ہم اس فانی دنیا کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ آئیں اس بابرکت مہینے میں اس بات پر غور کریں ہمارے ارد گرد ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جن کو شاید ہماری وجہ سے کوئی پریشانی ہو۔ آپ سب ایک لمحے کے لیے اس بات کو ضرور سوچیں محسوس کریں۔ آخر یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ ہم سب نے اپنے رب کریم کے ہاں جانا ہے ہمارا رب غفور رو رحیم ہے۔ وہ ہمیں اپنے فضل و کرم اور رحمت سے بخش دے گا۔ (انشاء اللہ) ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ہمیں ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کر دینا چاہئے۔ ہم اگر دوسروں کا خیال کریں گے تو کوئی ہمارا خیال کرے گا۔ امید ہے کہ آپ میری ان باتوں کو بے معنی نہیں جانیں گے۔ (میری کوئی بات اگر بری لگی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں)

کاشف نصیر گوبل...... منظور آباد لیہ

تنگ آمد

خاوند: موڑھے پر کیوں بیٹھی ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔
بیوی: نہیں میں آپ کی برابری نہیں کر سکتی۔ آپ سے نیچے ہی رہنا چاہتی ہوں۔
خاوند: اگر میں موڑھے پر بیٹھ گیا؟
بیوی: میں چوکی پر بیٹھ جاؤں گی۔
خاوند: اگر میں چوکی پر بیٹھ گیا؟
بیوی: تو میں زمین پر بیٹھ جاؤں گی۔
خاوند: اگر میں زمین پر بیٹھ گیا؟
بیوی: تو میں زمین میں گڑھا کر کے بیٹھ جاؤں گی۔
خاوند: اور اگر میں گڑھے میں بیٹھ گیا؟
بیوی: (چڑ کر) تو میں آپ کے اوپر مٹی ڈال دوں گی۔

سمیرا خان...... ملیر کراچی

⌘

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ "جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا" آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

صبح صبح کے اس شور سے آس پاس کے لوگ بھی جاگ گئے اور دروازے' کھڑکیاں کھول کر دیکھنے لگے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سن کر چاچی کو ذرا سکون تو ہوا کہ دروازے پر تھانے دار ہے لیکن وہ اس بات سے فکر مند بھی ہو گئی کہ تھانے دار اس وقت کس لیے آیا ہے۔ پھر بھی اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چاچی کو دیکھ کر تھانے دار نے کہا۔

"گھر میں کوئی مرد ہو تو اسے فوراً جگاؤ۔"

چاچی پوچھ نہ سکی کہ کیا کام ہے تھانے دار کا حکم سن کر بولی۔ "موہن تو بیوی کے ساتھ سسرال گیا ہے رام' شیام اور میرا بیٹا چھت پر سو رہے ہیں۔"

انسپکٹر جلدی سے بولا۔ "ارے اماں...... جو بھی ہے اسے جلدی سے حاضر کرو۔"

چاچی اب گھبرائی۔ "ان سے کوئی قصور ہو گیا ہے کیا؟" انسپکٹر نے اس کو اس انداز سے گھورا کہ وہ جواب سننے کے لیے نہ رک سکی اور جلدی سے چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ انسپکٹر اور تھانے دار نیچے کھڑے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد انہیں ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ چاچی رو رو کر بین کر رہی تھی۔

"ارے میں لٹ گئی' کسی نے میرے بیٹے اور دونوں بھتیجوں کو مار ڈالا۔"

بڑھیا کے بین سن کر تھانے دار اور انسپکٹر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لپک کر چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ چھت پر تین لاشیں پڑی تھیں۔ رام اور شیام رات کو رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر سو گئے تھے مگر اس وقت ان سارے رنگوں میں خون کا سرخ رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ زمین پر بھی خون جم گیا تھا۔ رام کی آنکھوں کے دیدے پھٹے تھے اور منہ کھلا رہ گیا تھا۔ شیام کا ایک ہاتھ اب تک چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ منظر ایسا تھا کہ ایک بار تو دشمن کا بھی دل دہل

جائے۔ چاچی اپنے بیٹے بدھی سنگھ کی لاش سے ایسے لپٹ گئی جیسے اس طرح اس کا بیٹا ابدی نیند سے جاگ جائے گا۔ چاچی کی دلدوز چیخوں اور بین کی آوازوں سے برابر والے گھر میں جگت کی ماں بھی پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اب اسے پتا چلا کہ جگت صرف اس کے ہی ارمانوں کو کچل کر نہیں گیا ہے بلکہ ایک دوسری ماں کی زندگی کو بھی ویران کر گیا ہے۔

ذرا سی دیر میں پورے گاؤں کے لوگ ویرو کے گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ سب ہی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قتل کس کس کو کیا گیا ہے۔ یہ پوچھنے کی کسی کو ضرورت نہیں تھی کہ قتل کیا کس نے ہے کیونکہ سب کو پتا تھا کہ اگر جگت زندہ ہے تو وہ واپس آئے گا اور قیامت برپا کر دے گا۔ وہ کہاں سے آیا' کب آیا اس کے ساتھ کون تھا اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کسی نے تو یہ بھی کہا کہ اگر جگت کو پتا چل گیا ہے کہ موہن ویرو کے ساتھ سسرال گیا ہوا ہے تو وہ پیچھے جا کر اس کا بھی وہیں کام تمام کر دے گا۔

کسی نے مسلح پولیس دستے کو دیکھ کر طنز سے کہا۔

''یہ لوگ تو ہمیشہ کام پورا ہو جانے کے بعد ہی تماشہ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔''

اس کے جواب میں دوسرے نے کہا۔

''ان کی بات کیا کرتے ہو' خود ہم لوگ اتنے قریب ہونے کے باوجود کام ہو جانے کے بعد ہی تماشہ دیکھنے جمع ہوئے ہیں نا۔''

ایسی باتوں سے بحث بڑھ گئی۔ اگر پولیس موجود نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ معاملہ ہاتھا پائی تک چلا جاتا۔ لوگ بار بار جگت کے گھر کے دوازے کی جانب نگاہ کرتے لیکن وہ دروازہ اب تک نہیں کھلا تھا۔ پانچ آدمیوں کو بلا کر تھانے دار نے مشیر نامہ تیار کیا۔ چاچی کو چار پانچ عورتوں نے پکڑ کر ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ وہ اب بھی بین کر کے سر پیٹ رہی تھی۔

انسپکٹر نے دو پولیس والوں کو خان پور روانہ کیا تاکہ سنہا صاحب کو آتے ہی یہاں لایا جائے۔ چار چھ پولیس والوں کو قاتلوں کے تعاقب میں روانہ کیا گیا دو کو دھرم پور بھیجا گیا تاکہ جگت کے نانا سے کوئی اطلاع مل سکے تو لے آئیں۔

تینوں لاشوں کو نیچے لا کر صحن میں رکھا گیا۔ اب مزید کارروائی کے لیے ان لاشوں کو اسپتال لے جانا باقی تھا۔ مرنے والوں کے رشتہ دار سوچ رہے تھے کہ موہن کو اس واقعہ کی اطلاع کے لیے کسی کو بھیجا جائے یا نہیں؟ کسی نے کہا کہ وہ ویرو کے ساتھ صبح واپس آنے کو کہہ گیا ہے چنانچہ یہ بری خبر راستے میں سنانے سے بہتر ہے کہ اسے واپس آ کر ہی اس واقعے کی اطلاع ملے۔

دو گھنٹے کے بعد موہن اور ویرو کو واپس لانے والی گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی۔ لوگ کھڑکیوں سے سر نکال کر انہیں دیکھنے لگے۔ لوگوں کی نظروں سے ہمدردی کے جذبات ظاہر تھے۔ موہن سنگھ ان نظروں کی حرارت سے چونک گیا۔ اسے لگا کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے۔ ورنہ سب لوگ اس طرح اسے نہ گھورتے۔ رام اور شیام نے کوئی حرکت کی ہو گی۔ کیا پتا کسی عورت کو چھیڑ دیا ہو۔ گاؤں والوں کی نظریں دیکھ کر ویرو کا دل بھی دھڑکا۔ وہ یہاں سے جاتے ہوئے یہ خوشخبری سن کر گئی تھی کہ جگت زندہ ہے کہیں وہ پکڑا تو نہیں گیا؟

ذرا دیر بعد گاڑی جب گھر کے پاس آ کر رکی تو لوگوں کو گھر کے پاس جمع دیکھ کر دونوں کو یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے۔ دو تین آدمیوں نے آگے بڑھ کر موہن کو گاڑی سے اتارا۔

''کیا ہو گیا ہے' لوگ کیوں جمع ہیں؟'' موہن اب

پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''ذرا دل کو مضبوط رکھنا موہن سنگھ بڑا افسوسناک واقعہ ہو گیا۔''

موہن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ اندر گھر میں داخل ہوا مگر دہلیز پر قدم رکھتے ہی رکھتے ہی موہن نے صحن میں تین لاشیں سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی دیکھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پاؤں وہیں جم کر رہ گئے۔ منہ تو کھلا لیکن چیخ نہ نکل سکی۔ آنکھیں پھٹ گئیں لیکن آنسو نہ نکلے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سینے کو ایسے دبا لیا جیسے یوں نہ کیا تو دل اچھل کر جسم سے باہر آ جائے گا۔

ویرو بھی رونے لگی تھی لیکن موہن کو بے حس و حرکت پا کر ویرو کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ سب کو لگا کہ کہیں موہن بھی وہیں ڈھیر نہ ہو جائے۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر گاؤں والوں نے لاشوں کے چہروں سے کپڑے ہٹا دیے۔ دونوں بھائیوں کی شکلیں دیکھ کر موہن دوڑا اور چارپائیوں پر پڑے بھائیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ویرو اندر جا کر چاچی سے لپٹ کر رونے لگی۔

پہلے تو چاچی نے اسے سینے سے لگا کر بین کیے لیکن پھر اس نے اچانک ویرو کو دھکا دے کر دور ہٹایا اور بولی۔

''ڈھونگ رہنے دے تجھے پتا چل گیا تھا کہ جگت یہ کام کرنے کے لیے آئے گا۔ جانے سے پہلے تو اس کی ماں سے ملنے گئی اور اس لیے اپنے میاں کو موت سے بچانے کے لیے لے کر میکے چلی گئی' نیچ...... حرافہ...... کتیا۔''

چاچی کے بدلتے رویہ سے ویرو ششدر رہ گئی۔ اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ گالیاں اور الزام اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ وہ دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی مگر باہر کھڑے ہوئے مرد چاچی کے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گئے۔

یکا یک موہن سنگھ کا سوگ بھی غصے میں بدل گیا۔ چاچی نے جو کہا تھا وہ صحیح تھا یا غلط بہرحال اس وقت موہن کو خاموش رہنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ وہ اٹھا اور ویرو کے پاس جا کر اسے روئی کی دھنکنے لگا۔ گالیاں دے کر بولا۔

''ناگن' تیری ہی وجہ سے یہ دن آئے ہیں۔ ایک کے بعد ایک میرے سارے بھائی مارے گئے لیکن تو نے اس کے گھر جانا نہ چھوڑا۔''

موہن کی دیوانگی دیکھ کر دو آدمیوں نے اسے سمجھایا کہ یہ وقت جھگڑا کرنے کا نہیں ہے تھانے دار صاحب لاشوں کو لے جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہنگامہ کرنے سے اور بدنامی ہو گی۔

موہن لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر ویرو کو چھوڑ کر باہر آیا۔ تھانے دار اور انسپکٹر لاشیں لے گئے۔ گاؤں بھر میں صبح سے دوپہر تک ایک عجیب ویرانی سی چھائی رہی۔ مگر کب تک' دوپہر کے قریب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہونے لگے تو اسی وقت پتا چلا کہ جگت کے باپو اور نانا آ گئے ہیں۔ جگت کی ماں کے چند رشتہ دار صبح ہی سے اس کے گھر میں جمع ہو گئے تھے لیکن ماں جی نے ان میں سے کسی سے بات نہ کی تھی۔ سامنے والے گھر سے آنے والے بین کی آوازیں سن سن کر ماں جی کی آنکھیں بھی موسلا دھار برس رہی تھیں۔ ان آنسوؤں کے راستے جگت کی ماں کے صدمات بھی ڈھل رہے تھے۔

شوہر اور باپ کو دیکھ کر اس کے آنسو رک گئے۔ سب کا خیال تھا کہ باپو اور نانا ابھی پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے لیکن نانا نے کہا۔

''بیٹی سوہن تو کہہ رہا تھا کہ تم اب اچھی ہو' مگر

تمہاری حالت تو عجیب ہوگئی ہے۔ اور یہ کیا ہوا؟ چوٹ کیسی ہے یہ؟" نانا پیشانی کی چوٹ کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"کچھ نہیں' رات کو ٹھوکر لگ گئی تھی۔" یہ کہہ کر ماں جی نے نانا کے قدموں کو چھونا چاہا لیکن اس قوت وہاں سے اٹھنے کی وقت ان میں نہ تھی۔ نانا نے خود قریب آ کر ماں جی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

"بیٹی تو آرام کرلے میں شام تک رکوں گا۔"

شام کے قریب سپرنٹنڈنٹ سنہا بھی آ گیا۔ لاہور سے خان پور کے سفر کے دوران وہ اس خوش فہمی میں رہا کہ لاہور سے جو پیغام اس نے بھیجا ہے اس کا نتیجہ اچھا نکلا ہوگا لیکن تھانے میں قدم رکھتے ہی اسے تینوں کے قتل کی اطلاع ملی۔ سنہا کو بالکل توقع نہ تھی کہ جگت فوج سے فرار ہوتے ہی ایسا وار کر جائے گا خبر سن کر اس کو غصہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی وہ چلایا۔

"بدمعاش ایک ساتھ تین قتل کر کے فرار ہوگیا اور سارا گاؤں سوتا رہا؟ پولیس کہاں مرگئی تھی۔ تھانے دار کو کیا ہوگیا تھا؟ میں سب کو ڈس مس کرادوں گا اور اس جاٹ کے بچے کو چھٹی کا دودھ نہ یاد دلایا تو میرا نام بھی شیو نارائن سنہا نہیں۔"

رتیا پہنچ کر اس نے سب سے پہلے تھانے دار سے کہا۔

"جب میں نے تم کو اس گاؤں میں ٹرانسفر کرایا تو اس وقت میرا خیال تھا کہ تم کام کے آدمی ہو لیکن تم نے تو میری بے عزتی کرائی ہے میں پوچھتا ہوں رات کے وقت جب یہ واقعہ ہوا تو تم کیا کر رہے تھے؟ نشے میں تھے یا بیوی کے......!"

تھانے دار نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"صاحب! میری یہ ایک غلطی معاف کردیجیے۔ اصل میں رات کو چوکیدار نے مجھے غلط اطلاع دی تھی۔ میرے خیال میں اس کو فوراً برطرف کردینا چاہیے۔"

"برطرف کرنے کے لیے تو مجھے اب کافی لمبی لسٹ تیار کرنی پڑے گی۔ سنہا دہاڑ کر بولا۔

یہاں سے فراغت پا کر سنہا موہن سنگھ کو دلاسہ دینے گیا۔ اس کا بیان بھی لینا تھا۔ جگت اور اس کے ساتھیوں کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت تو تھا نہیں۔ موہن نے بیان دیا کہ جگت نے پرانی عداوت کی بنا پر یہ قتل کیے ہیں۔"

وہاں سے سنہا اور تھانے دار جگت کے گھر گئے۔ سنہا کا خیال تھا کہ جگت کی ماں کا بیان کچھ زیادہ معاون ثابت ہوگا لیکن گھر میں جگت کے باپو اور نانا کو دیکھ کر ہی سنہا کا چہرہ اتر گیا کیونکہ اگر بڑھیا اکیلی ہوتی تو وہ من پسند بیان حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ مگر اب بیان اپنی مرضی کا لینا مشکل تھا۔ نانا نے سنہا اور تھانے دار کا استقبال کیا۔

"آیئے......!"

ماں جی نے بھی آنکھیں کھول کر سنہا کی طرف ایک نظر دیکھا جس پر سنہا نے ماں جی سے پوچھا۔

"یہ پیشانی پر زخم کیسے لگا ماں جی؟"

جواب نانا نے دیا۔

"طبیعت ناساز ہے۔"

سنہا نے نانا کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر ماں جی سے پوچھا۔

"یہ پیشانی پر زخم کیسے لگا ماں جی......؟"

"رات کو پانی پینے کے لیے اٹھی تھی ٹھوکر لگ گئی۔ ویسے معمولی زخم ہے۔" پھر نانا نے ہی جواب دیا۔

سنہا کو اب برا لگا۔ "محترم! آپ بیچ میں نہ بولیں تو بہتر ہے' مجھے ماں جی کی زبانی واقعات معلوم کرنے ہیں۔ گزشتہ رات ہونے والے قتل آپ ہی کے جگت نے کیے ہیں یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگیا ہوگا۔"

"ہمیں کیا معلوم جناب' ہم لوگ تو ابھی ابھی دوپہر میں یہاں آئے ہیں۔" نانا نے بڑی نرمی سے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "ویسے قاتل کو کسی نے دیکھا ہے؟"

اب سنہا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بات سنی ان سنی کر کے ماں جی سے سوال کیا۔ "کل رات جگت اور فوج سے فرار ہونے والے اس کے ساتھی یہاں کس وقت آئے تھے ماں جی؟"

سوال سن کر ماں جی پہلے شوہر کی طرف اور پھر اپنے باپو کی طرف نگاہ کی۔ نانا نے اشارے سے بتایا کہ جواب گول مول دینا۔ ماں جی کو جھوٹ بولنے سے نفرت تھی لیکن اس وقت باپو سامنے ہی بیٹھے تھے اور پھر بولنے میں غلطی ہوجانے سے جگت پر بھی مصیبت آنے کا خطرہ تھا۔ اس نے کہا۔

"صاحب باپو نے جو کچھ کہا سچ ہے رات ٹھوکر لگنے سے میں گری اور بے ہوش ہوگئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ صبح کو مجھے چارپائی پر کس نے لٹایا۔"

"ماں جی' میں نے یہ نہیں معلوم کیا کہ آپ کیسے گری تھیں مجھے تو یہ بتایئے کہ جگت رات کو کس وقت آیا تھا اور اس کے ساتھ کون کون تھا؟ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو صرف رپورٹ تیار کرنے کے لیے ایسے سوالات کررہے ہیں۔"

"ضرور پوچھو صاحب۔" ماں جی نے کہا۔

"ماں جی صبح جب آپ ہوش میں آئیں تو آپ نے میرے انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ "جگت بیٹے میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" کیا یہ بات صحیح ہے۔"

ماں جی نے ذرا سا سوچا پھر کہا۔

"بھائی اگر میں ہوش میں ہوتی تو کیا انسپکٹر صاحب کو بیٹا کہتی؟" جواب زوردار تھا۔ سنہا کو بھی بڑھیا کا جواب سن کر چکر سے آ گئے لیکن ماں جی سنہا کو ناراض بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بولیں۔

"بیٹے کی جدائی میں کس ماں کو نیند آتی ہے اور جب کبھی نیند آ جاتی ہے تو بیٹے ہی کے خواب نظر آتے ہیں ممکن ہے میں نے خواب میں جگت کو دیکھا ہو اور وہ الفاظ انسپکٹر صاحب سے کہہ دیے ہوں۔"

"ماں جی' بات کو اس طرح مت ٹالیے۔" سنہا کا لہجہ اب افسروں کا ہوتا جارہا تھا۔

"تھانے دار نے صبح آپ کے گھر میں لسی کے چار پیالے بھی دیکھے تھے۔"

"ممکن ہے اگر کوئی میری بے ہوشی کے دوران آ کر لسی پی گیا ہو تو مجھے کیا پتا؟"

سنہا کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ وہ غصہ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک پولیس والا زور زور سے سانسیں لیتا ہوا اندر داخل ہوا اور بولا۔ "صاحب...... صاحب۔"

سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک تو وہ دوڑ کر آیا تھا اس لیے اس کی سانس پھول گئی تھی دوسرے وہ یہاں آ کر اس الجھن میں پڑ گیا کہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان بات کروں یا نہیں؟

اسے چپ ہوتا دیکھ کر سنہا غصے سے بولا۔

"جلدی بول کیا بات ہے؟"

سپاہی سنہا کے زور سے بولنے سے اور بھی بوکھلا گیا۔ جلدی سے بولا۔ "صاحب ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ سنت گڑھ میں حکم سنگھ کو بھی قتل کردیا گیا ہے۔"

سنہا اور تھانے دار یہ سن کر دنگ رہ گئے۔ جگت کے باپو اور نانا نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا۔ سنہا نے تھانے دار سے پوچھا۔

"حکم سنگھ سنت گڑھ میں تھا؟"

"ہاں جناب' ہنومان سے ڈر کر وہاں سے گیا تھا۔"

"ہنومان؟" سنہا نے کہا۔ "اس کے گھر جا کر تفتیش کی؟"

"جی وہ بھی گزشتہ رات گم ہوگیا ہے۔ اب تک کہیں نظر نہیں آیا۔" تھانے دار نے کہا۔

حکم کے قتل کی اطلاع لانے والے سپاہی کو ابھی کچھ اور بھی کہنا تھا۔ اس نے سنہا کے قریب جا کر دھیمے سے کہا۔

"صاحب! جگت نے آپ کے لیے پیغام بھیجا ہے۔"

"کیا...؟"

"یہی کہ ہم پانچ آدمی آج سے قانون کے باغی ہیں۔ سب کے سر پر ایک ایک قتل کا الزام ہے اب ہمیں موت کی کوئی پروا نہیں اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہو تو بیوی بچوں کو لے کر پنجاب چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ.....!"

"ورنہ کیا؟" سنہا بپھرے ہوئے لہجہ میں گرجا۔

"ورنہ سامنا ہونے پر آپ کے خلاف بھی بندوق ہی استعمال کی جائے گی۔"

یہ سنتے ہی سنہا کھڑا ہوگیا اور گردن اکڑا کر جگت کے نانا اور باپ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا بیٹا اب مجھے بھی دھمکی دے رہا ہے۔ اسے پتا نہیں کہ اس جیسے کتنے لوگوں کو میں نے اپنے پیروں تلے کچل کر رکھ دیا ہے۔"

نانا کو سنہا کی بات بہت بری لگی۔ جی میں ایک مرتبہ تو آیا کہ کہہ دیں کہ طاقت کا گھمنڈ مت کر سنہا ورنہ عزت اور جان دونوں سے جائے گا۔ مگر اس وقت وہ غصے کو پی کر چپ ہوگئے۔

تھانے دار کو یہ سن کر بڑا اطمینان ہوگیا تھا کہ حکم کو رتیا میں نہیں بلکہ کسی دوسرے گاؤں میں قتل کیا گیا ہے اس طرح اب وہ اکیلا سنہا کے عتاب میں نہیں آسکتا اور سنہا بھی آخر کتنوں کو برطرف کرے گا؟

سنہا اور تھانے دار کے جانے کے بعد ماں جی نے کہا۔

"جگت نے اب خون کی ہولی شروع کر دی ہے اسے کسی کی جان لیتے ہوئے کیا ذرا بھی رحم نہ آتا ہوگا؟"

نانا نے بیٹی کو دلاسا دیا۔

"بیٹی تو دل چھوٹا نہ کر۔ ابھی تو نے سنا نہیں کہ سامنے والے گھر کے تینوں قتل جگت کے ساتھیوں نے کیے ہیں اور حکم کو ہنومان نے مارا ہے جگت نے نہیں۔"

مگر ماں جی کو ان الفاظ سے سکون نہیں ملا وہ بولیں۔ "تم کچھ بھی کہو باپو مگر جگت جو کچھ کر رہا ہے پاپ ہے اور بھگوان اسے معاف نہیں کرے گا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

جگت کے باپو نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا بھاگوان! اب آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟"

"جو کچھ ہو چکا اس پر نہیں بلکہ اب جو کچھ ہونے والا ہے مجھے اس پر رونا آتا ہے۔ ہمارے خاندان کی یہ آخری سنتان (اولاد) ہے اگر یہ دیا بھی بجھ گیا تو اس گھر میں ہمیشہ کے لیے اندھیرا ہو جائے گا۔" ماں جی نے کہا۔

"ایسے الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہے بیٹی۔" نانا بولے۔

"باپو میری تمام امیدیں مٹ گئیں۔" ماں نے کہا پھر وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔

"جگت کے باپو! تم اب سمدھی کے پاس جا کر جگت کا رشتہ واپس لے لو بے چاری چندن کور کی زندگی کیوں برباد کی جائے؟ میرے نصیب ہی میں بہو کا سکھ نہ ہوگا۔" پھر اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "جاؤ جیسی بھگوان کی مرضی۔"

اور دوسرے روز صبح کے اخباروں میں چار آدمیوں کے قتل کی خبریں اس قسم کی جلی سرخیوں

کے ساتھ چھپیں۔

"پنجاب میں دوسرا جگا ڈاکو پیدا ہوگیا۔"

☆☆☆

جیپ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ پیچھے گھوڑی بھی اسی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ جگت کو کافی عرصے کے بعد اپنی پیاری مانک پر سواری کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے وہ بھی بے حد خوش تھا۔ جگت اس بات پر نازاں بھی تھا کہ قدرت اس کا پورا ساتھ دے رہی ہے۔ سارے کام آسانی سے انجام پاتے جا رہے ہیں۔ ہنومان سے بھی عجیب اتفاق سے ملاقات ہوگئی تھی۔ البتہ اسے اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ ویرو سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن ایک طرح سے یہ بھی بہتر ہی ہوا کیونکہ وہ ویرو کی نظروں کے سامنے پھر کسی کو قتل نہ کر سکتا۔ جس عورت نے اس کی خاطر بے شمار ظلم سہے، جس نے زندگی کی حفاظت کا تعویذ اپنے میاں کے بدلے اس کے گلے میں ڈال دیا جس نے عین موقع پر زیورات دے کر اس کی مشکل آسان کر دی کیا وہ اس کے سہاگ کو اجاڑ سکتا؟ اور کیا اس کے ساتھی موہن سنگھ کو زندہ چھوڑ کر جانے پر رضامند ہوتے؟ اس نے اپنے ساتھیوں سے اب تک ویرو کی بات نہیں کی تھی۔ پھر نانا بھی موہن کو زندہ چھوڑنے پر کتنے ناراض ہوتے۔ یہی ساری باتیں اس کے ذہن میں چکر لگا رہی تھیں جگت آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ ویرو کا نہ ملنا ہی بہتر ہوا۔

جیپ میں بیٹھا ہوا ہنومان اس وقت حکم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہولی منانے کے لیے حکم سنگھ کی خالہ رتیا آئی تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جسے خالہ نے سنت گڑھ میں حکم کے لیے پسند کیا تھا اور اب وہ بہنوئی کو دکھانے کے لیے لڑکی کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ ہنومان کو بھی کہیں سے اس کا پتا چل گیا تھا اور اب یہ بھی پتا چلا تھا کہ وہ جس کی تلاش میں ہے وہ سنت گڑھ میں اپنے کالو کا ہوٹل چلا کر مزے کر رہا ہے۔ اسی وقت ہنومان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حکم کو اس کی سگائی سے پہلے ہی ختم کر دے گا اور ایسے میں اس کی ملاقات جگت سے بھی ہوگئی۔ اب اس کا کام اور آسان ہوگیا تھا۔

جیپ تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک جیپ چلانے والے ہشیار سنگھ سے ہنومان نے پوچھا۔

"ہشیار سنت گڑھ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

"سنت گڑھ تو دوسری سمت ہے کیوں؟ وہاں کیا کام ہے؟"

"میرا شکار حکم سنگھ وہیں ہے اگر یہ کام کر لیا تو سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔"

"یار اب ذرا آرام کی بات کر۔" بچن نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "چوبیس گھنٹے سے جیپ میں بیٹھے بیٹھے اب تو جسم بھی دکھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر نیند کریں گے تھوڑا نشہ پانی کریں گے ایک آدھ مرغی کھائیں گے پھر دوسرے کام کی بات ہوگی۔"

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ سب نانک پور پہنچے۔ کرپال اس علاقے سے واقف تھا۔ اس گاؤں میں گرونانک کے گردوارے کا بہت شہرہ تھا۔ گاؤں میں یاتری لوگوں کے لیے جو سرائے تھی اسی میں جگت کی اس ٹولی نے بھی قیام کیا۔ جاتے ہی سب کے سب سو گئے اور چار پانچ گھنٹے تک بے سدھ سوتے رہے۔ مگر ہنومان کو نیند نہیں آئی وہ دوسرے ساتھیوں کو میٹھی نیند میں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شاید حکم کو قتل کرنے کے بعد وہ بھی ایسی ہی میٹھی نیند سو سکے گا۔

صبح ہوئی تو کھانے کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ بچن نے مرغی کی فرمائش کی۔ کرپال نے کہا۔

"یہاں ایک دیوی کا مندر بھی ہے عقیدت مند

اس کی منت مانتے ہیں اور منت پوری ہونے پر بکرا پیش کرتے ہیں۔ جگت کی بھی منت آج پوری ہوئی ہے کیا خیال ہے آج دیوی کے پرساد سے پیٹ نہ بھرا جائے؟"

بات سب ہی کے دل کو لگی۔ طے یہ ہوا کہ ہنومان مندر میں جائے۔ فوج سے فرار ہوتے وقت جو ساٹھ ستر روپے ساتھ لے کر چلے تھے وہ ان کے پاس موجود تھے آنے والے دنوں کا خیال ہی نہ تھا۔

ہنومان گھوڑی لے کر روانہ ہوگیا۔ باقی چار ساتھیوں نے اگلے پروگرام کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ جگت نے کہا۔ "سب سے پہلے تو ہمیں اس جیپ سے جان چھڑانی چاہیے۔ جیپ کے بجائے اب ہمیں چار گھوڑوں کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ہنومان کو حکم کے قتل کا جو فریضہ انجام دینا ہے وہ آج شام تک ادا کرلینا چاہیے۔ اس کے بعد رات کسی جنگل میں بسر کی جائے۔ ہنومان کے لیے ایک رائفل کا بندوبست کرنا بھی ضروری ہے۔ حکم کے قتل کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ایک ڈکیتی بھی کی جائے تاکہ پولیس کو اوپر تلے کئی جھٹکے محسوس ہوں اور ہمیں بھی کارتوس کے لیے پیسے ملیں۔ پھر کسی ایک مقام پر بارہ گھنٹے سے زیادہ ہم نہیں رکیں گے۔ ہر جگہ ہمیں ایسے آدمیوں کو تلاش کرنا ہوگا جو ہمیں آسرا دے سکیں۔ اگر دھمکی اور ڈرانے سے کام نکل جاتا ہو تو قتل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر کوئی بے وفائی کرے یا پولیس کا پیارا بننے کی کوشش کرے تو اسے ڈھیر کرنے میں دیر بھی نہیں کرنی ہے۔ بس یہ یاد رہے کہ پولیس ہماری دشمن' مالدار ہمارے شکار اور غریب عوام ہمارے دوست ہیں۔" جگت ذرا رکا اور سب کے چہرے پر نظر دوڑاتے ہوئے پھر بولا۔

"کسی کو ان باتوں پر اعتراض تو نہیں ہے۔"

"ہمیں منظور ہے۔" سب نے کہا۔

پھر کرپال بولا۔

"میرے باپ کی زمین چھیننے والے جاگیردار سے انتقام لینے کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔"

"کرپال' اب وہ صرف تمہارا دشمن نہیں ہے وہ ہماری پوری ٹولی کا شکار ہوگا۔" جگت نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو اس کی بھی ہم اچھی طرح خبر لیں گے۔"

بچن نے کہا۔ "میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اس کے باپ نے اس کی شادی کہیں اور کردی مجھے اس کا بہت صدمہ ہے۔" بچن کی بات سن کر جگت کو ویریا دآ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کل کو یہی سوال اس کے سامنے بھی آسکتا ہے چنانچہ آج جو اصول بنایا جائے گا اس پر خود اسے بھی عمل کرنا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

"بچن! یہ ایک نازک جذباتی مسئلہ ہے کسی عورت سے زبردستی کرنا ناانصافی ہے ہم پولیس کے قانون کی کھل کر خلاف ورزی کریں گے لیکن قدرت کے قانون کا ہمیں پاس رکھنا ہوگا ورنہ ہم اپنی راہ سے بھٹک جائیں گے اور زیادہ عرصہ اپنی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکیں گے۔"

اس کے باوجود بچن مطمئن نظر نہ آیا تو جگت نے کہا۔

"ہاں اگر لڑکی اپنے شوہر سے ناخوش ہو اور اب بھی تمہیں پیار کرتی ہو تو میں خود جاکر اسے اپنے ساتھ لاؤں گا اور تمہارے گھر میں بٹھادوں گا۔" یہ سن کر بچن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اب جگت ہوشیار سے مخاطب ہوا۔ "ہشیار' تمہیں کچھ نہیں کہنا؟"

"بھئی میں تو باپ سے لڑ کر آیا ہوں اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔" ہشیار نے ایسے کہا جیسے اسے

اس بات کا سخت افسوس ہے کہ اس کی کسی سے عداوت نہیں ہے۔

"بھیا یہاں تو تمہیں ہی جھکنا ہوگا۔ باپو سے معافی مانگ کر ان کی آشیرباد حاصل کرنی چاہیے۔" جگت نے کہا۔ جگت کی اس معاملہ فہمی نے ساتھیوں کے دل میں جگت کی قدر کچھ اور بڑھادی اور انہیں اس پر فخر محسوس ہوا کہ ان کا سردار جگت جیسا شخص ہے۔

اتنے میں ہنومان' مندر سے واپس آگیا۔ وہ بکرے کا سر تو دیوی کے قدموں میں ڈال آیا تھا لیکن باقی بکرا ساتھ لے کر آیا تھا۔ کرپال نے فوراً اس کے پکانے کا بندوبست کیا۔ آتے ہوئے ہنومان شراب کی کچھ بوتلیں بھی ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ دوبارہ نہ جانا پڑے۔ اب ہنومان کو جگت نے دوسرا کام بتایا۔

"ہمیں اس جیپ کو چھٹی دینی چاہیے لیکن نہ ہم اسے راستے میں چھوڑیں گے اور نہ ہی کسی کو مفت دیں گے۔ سنت گڑھ جانے کے لیے دوسری گاڑی درکار ہے اب کوئی ترکیب سوچو ویسے مجھے پتا ہے کہ تمہارا دماغ زیادہ کام نہیں کرتا لیکن کند ذہن رہنا بھی کام نہیں آئے گا۔"

یہ سن کر ہنومان نے اپنی پیشانی پر ایک مکا مارا اور بولا۔ "مجھے تمہارے طعنے سے بچنے کے لیے کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ ذرا کھلی ہوا میں جاکر چکر لگاتا ہوں شاید کوئی ترکیب آجائے دماغ میں۔" یہ کہہ کر ہنستا ہوا ہنومان چلا گیا اور جب ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو سب ساتھی نہا دھو کر تیار ہوچکے تھے۔ فوجی لباس کو ایک روز اور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔

ہنومان نے آتے ہی کہا۔ "جگت' میرا دماغ کچھ کچھ کام کرنے لگا ہے۔ گاؤں میں ایک سردار جی موٹر ریپئرنگ کا کام کرتا ہے اس کے پاس ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس سے جیپ کے بجائے وہ گاڑی نہ لے لی جائے۔"

جگت ہنسا۔ "ہنومان تو نے بات تو اچھی سوچی ہے لیکن بھیا اس طرح گاڑیاں بدلنا آسان تو نہیں۔ فوجی گاڑی کون لے گا؟ اور اگر کسی کو شبہ ہوگیا تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر بھی تو نے جگہ ڈھونڈی ہے تو میں بھی کوئی راستا نکالوں گا۔ چل کھانا کھا کر نکلتے ہیں۔"

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر جب وہ سرائے سے نکلے تو سورج سر پر آچکا تھا۔ ہلکی گرم ہوا گرمیوں کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ہنومان گھوڑی پر سب سے آگے روانہ ہوگیا تھا جگت نے چلتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ تمہارے پیچھے چل رہے ہیں۔ سردار جی گیراج کے پاس جیپ رکے تب بھی تم آہستہ آہستہ گھوڑی چلاتے رہنا۔"

گیراج کے قریب جاکر جیپ رکوائی اور ہشیار کے کان میں کچھ کہہ کر گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔

"کیا حال ہے سردار جی؟"

"آیئے سرکار آیئے۔" سردار جی نے فوجی گاہک کا استقبال کیا۔

"ایک گیلن پیٹرول چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے گیراج کے کونے میں فورڈ گاڑی جگت نے دیکھ لی۔ سردار جی نے فوراً اپنے لڑکے کو ایک گیلن پیٹرول جیپ میں ڈالنے کا حکم دیا۔ اتنی دیر میں جگت فورڈ گاڑی کا معائنہ کرچکا تھا۔ اس نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔ "سردار جی! کیا اس گاؤں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس موٹر گاڑیاں ہیں؟"

"نہیں سرکار' گاؤں میں ایک ہی گاڑی ہے لیکن یہ بھی اب جا رہی ہے جاگیردار صاحب نے دو سال پہلے خریدی تھی لیکن اب ان کی حالت پتلی ہوگئی ہے اس لیے بیچنے کو کہتے ہیں کیونکہ یہاں اکثر مالدار

یاتری آتے رہتے ہیں اس لیے ان کا خیال ہے کہ ان میں کوئی گاہک مل جائے گا۔" یہ باتیں کرتے ہوئے سردار جی سوچنے لگا کہ شاید یہ لوگ گاہک بن جائیں۔ چنانچہ اس نے گاڑی کی تعریفیں بھی شروع کردیں۔

"ایک دم چالو ہے تیس میل دیتی ہے دو سال میں ایک مرتبہ بھی مرمت کی ضرورت نہیں پڑی۔"

"اچھا' تب تو گاڑی اچھی ہے ہمارے کرنل صاحب اس وقت ایک اچھی گاڑی کی تلاش میں ہیں میں ان سے بات کروں گا۔" جگت نے اس کا حوصلہ بڑھانے کو کہا۔

سردار جی خوش ہوگیا۔ یہ سنتے ہی لڑکے کو فوراً لسی کے چار گلاس لانے کو کہا۔ جگت نے ہشیار کو بلا کر گاڑی کی مشین چیک کرنے کی ہدایت کی۔

"اگر کرنل صاحب یہاں نہ آسکیں تو میں گاڑی کو آپ کہیے تو وہاں لے آؤں گا۔" سردار جی نے سودا پکا کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔

"نہیں فی الحال تو وہ چھٹی پر ہیں اور سنت گڑھ ہی میں ہیں خود آکر دیکھ جائیں گے۔" جگت نے کہا۔ "ہم ان سے ہی ملنے کے لیے جارہے ہیں۔ میں بات کرلوں گا لیکن دام مناسب ہونے چاہیے۔"

"ارے سرکار یہ بھی کہنے کی بات ہے اپنے کو تو سو پچاس روپے دلالی مل جائے ہم تو بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کا فائدہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔" سردار جی نے سب کو لسی کے گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

لسی پینے کے بعد پیٹرول کے پیسے دے کر وہ چاروں گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ہشیار جیپ اسٹارٹ کررہا تھا کہ جگت نے ایک نوکیلی سلاخ ٹائر میں لگا دی۔ جیپ ذرا ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک دھما کا سنائی دیا دھما کا سن کر سردار جی دوڑا دوڑا آیا۔

"مصیبت ہوگئی سردار جی۔" جگت نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں ابھی پنکچر لگائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر سرار جی وہیل کے پاس بیٹھ گیا۔

"لیکن ہمیں فوراً کرنل صاحب کے پاس پہنچنا تھا اب ہم ذرا سا بھی وقت نہیں گنوا سکتے۔"

سردار جی نے ذرا دیر کچھ دیر سوچا پھر خوش ہوکر بولے۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ فورڈ گاڑی لے جائیے اس طرح آپ گاڑی کرنل صاحب کو دکھا بھی سکیں گے اور اس میں سفر کرنے سے آپ کو گاڑی کی حالت کا بھی پتا چل جائے گا۔" جگت نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بات تو صحیح ہے اگر کرنل صاحب مان گئے تو ہم ان کو اسی گاڑی میں ساتھ لے آئیں گے تاکہ اگر سودا ہوجائے گا تو آپ کا بھی کام ہوجائے گا۔"

سردار جی نے لڑکے کو گاڑی صاف کرنے کا حکم دیا اور اس میں دو گیلن پیٹرول بھی ڈلوا دیا پھر چابی جگت کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک آپ واپس آئیں گے جیپ ایک دم ریڈی ملے گی۔"

چاروں دوست کھلی فورڈ میں بیٹھ گئے اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ سردار جی گاڑی کو جاتے ہوئے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھا کہ اب تو سودا ہوا ہی سمجھو۔

ہنومان گھوڑی پر آگے جارہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا۔ اس نے جب چاروں ساتھیوں کو نئی گاڑی میں دیکھا تو وہ بھی خوش ہوگیا کہ جگت کچھ نہ کچھ کام کر آیا ہے اور جب گاڑی' گھوڑی کے پاس پہنچی تو جگت نے ہنومان سے مذاقاً کہا۔ "تو نئے مسافر' سنت گڑھ کا راستا کون سا ہے؟"

ہنومان گھوڑی سے کود کو نیچے آ گیا اور بولا۔ "یار تو دنیا کے تمام راستوں سے واقف ہے آخر سردار جی سے گاڑی لے ہی آیا۔"

اب جگت مانک پر سوار ہوگیا اور بولا۔ "دوست گاڑی کے بدلے جیپ اسے دے آئے ہیں۔ شام تک تو وہ بے چارہ ہمارا بڑے شوق سے انتظار کرے گا پھر اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام۔"

اس کے بعد موٹر آگے بڑھ گئی۔ چاروں ساتھی سنت گڑھ کے پاس پہنچ کر جگت کا انتظار کرنے لگے۔ جگت نے آکر گھوڑی ہنومان کے حوالے کی۔ راستے میں اس نے حکم کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ اس نے ہنومان سے کہا۔

"جا ہنومان' چھپ کر معلوم کرکے آ کہ حکم ہوٹل میں ہے یا نہیں اور ہے تو کس جگہ بیٹھا ہے؟"

ہنومان گیا اور ذرا سی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "جگت! وہ ہوٹل میں غلے پر بیٹھا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ اپنے خالو کے غلے سے بھی پیسے اڑا لیتا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" جگت نے کہا۔ "تو جا کر اسے کسی نہ کسی طرح ہوٹل سے باہر نکال لا۔ آگے کا کام ہم لوگ کرلیں گے لیکن دیکھنا کسی کو پتا نہ چلے کہ ہم سب ساتھ ہیں۔"

ہنومان وہاں رکا اور مسکین صورت بنا کر بولا۔ "یار اسے باہر لانے کی ترکیب بھی بتا دو نا تاکہ کام جلدی ہوجائے۔"

جگت ہنسا۔ اس نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہنومان کو دیتے ہوئے کہا۔

"لے جا کر اس کی ریز گاری مانگنا تمہیں دیکھ کر وہ ضرور بھڑکے گا۔ اس وقت یہ ڈانگ لے کر اس کے سامنے کھڑے ہوجانا اور اندر مت جانے دینا۔ ہم تمہیں دو چار گالیاں بھی دیں تو برا مت ماننا۔"

ہنومان خوش ہو کر بولا۔ "یار تیرا دماغ بھی کمال ہے۔ ترکیبوں کا خزانہ بھرا پڑا ہے اس میں۔"

ہنومان غلے پر بیٹھے حکم کی نظر بچا کر ہوٹل میں داخل ہوگیا اور ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا اس کی پیٹھ حکم کی طرف تھی۔ اس نے دیکھا حکم کے برابر میں ایک اندھا بیٹھا تھا۔ ہنومان نے اندازہ لگایا کہ وہی اس کا خالو ہوگا۔ اس نے سوچا حرامی اندھے خالو کا مال کھا کر تگڑا ہورہا ہے۔"

لسی پینے کے بعد ہنومان تھڑے پر بیٹھ گیا اور پانچ کا نوٹ رکھا۔ حکم سنگھ نے گاہک کو دیکھے بغیر کہا۔

"ارے بھائی ابھی اتنا بیوپار کہاں ہوا ہے' کھلے پیسے دو۔" یہ کہہ کر اس نے نظر اٹھائی اور گاہک کو دیکھا تو دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔

حکم کی حالت پر ہنومان پہلے تو ہنسا اور پھر حکم کو گھور کر دیکھنے لگا۔ حکم کو ان نظروں میں اپنی موت نظر آئی۔ اس نے آس پاس نگاہ کی۔ ہنومان کے ہاتھ میں برچھی والی ڈانگ دیکھ کر وہ لرز رہا تھا۔ ہنومان بھی جان بوجھ کر ذرا فاصلے پر کھڑا تھا تاکہ حکم کو بھاگنے کا راستا مل جائے دوسرے ہی لمحے حکم تھڑے سے کود کو بھاگنے لگا۔ ہنومان بھی اس کے پیچھے بھاگا لیکن حکم سنگھ باہر نکلتے ہی دو فوجیوں سے ٹکرایا۔ انہوں نے اسے روکا اور ہنومان کو دیکھ کر ایک فوجی نے بندوق تان لی۔ ہنومان وہیں رک گیا۔

حکم نے فوراً کہا۔ "بچائیے' مجھے بچائیے یہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"دیکھے ہیں بڑے مارنے والے۔" بچن نے کہا اور ہنومان کو دو گالیاں دیں۔

کرپال نے حکم کو اپنی فورڈ گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "چل بیٹھ جا ہم تجھے گھر چھوڑ آتے ہیں۔"

حکم کے بیٹھتے ہی ہشیار نے موٹر دوڑادی۔ پیچھے ایک طرف کرپال اور دوسری طرف بچن اور بیچ میں حکم تھا۔ ہنومان گھوڑی پر پیچھے چلا آرہا تھا۔ دوپہر ہوگئی تھی اس لیے سڑک پر زیادہ لوگ نہ تھے۔ جو تھے بھی تو ان کی سمجھ میں بات آنے سے پہلے ہی موٹر اور گھوڑی دونوں ان کی نظروں سے غائب ہوچکے تھے۔

حکم گھبرا کر بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ ہنومان کو پیچھے آتا دیکھ کر وہ پھر روہانسا ہوکر بولا۔ ''فوجی بھائیو مجھے بچالینا وہ مجھے مارنے کے لیے اب تک تعاقب کررہا ہے۔''

آگے بیٹھے ہوئے جگت نے کہا۔ ''کوئی پرانی دشمنی معلوم ہوتی ہے۔''

''اس بدمعاش اور اس کے ایک مفرور مجرم دوست کی باتوں میں آکر میں بھی پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی تھی لیکن وہ یہاں تک آپہنچا۔ اس کا وہ نامرد دوست کسی کو قتل کرکے فرار ہوگیا ہے اور یہ بدمعاش جیل کی ہوا کھانے کے بعد بھی نہ سنبھلا۔''

حکم کے منہ سے آخری الفاظ نکلتے ہی جگت نے ایک تھپڑ گھما کر اس کے منہ پر جڑ دیا۔

''کتے، نامرد کسے کہتا ہے؟''

زوردار تھپڑ اور جگت کے چہرے نے حکم کو دن میں تارے دکھادیے۔ ''جگت تو؟'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں میں، تیری موت۔'' جگت نے بندوق کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔ گاڑی ابھی دوڑ رہی تھی۔ حکم کو آگے اور پیچھے دونوں طرف موت نظر آرہی اس نے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت شروع کردی۔ ''جگت مجھے معاف کردے میں تیرا غلام بن کر رہوں گا۔''

''مجھے غلام کی نہیں دوست کی ضرورت ہے اور تو ہمارا بے وفا دوست ثابت ہوا ہے۔'' جگت کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن اس نے گولی اس لیے نہیں چلائی کہ یہ ہنومان کا شکار تھا۔

تھوڑا سا اور آگے جاکر جگت نے کار رکوائی اور حکم کو گاڑی سے نیچے اتر جانے کا حکم دیا حکم خوش ہوگیا اب اسے بچنے کی امید ہوگئی تھی۔ فوراً گاڑی سے اترا اور اترتے ہی تیز قدموں سے دوڑنے لگا۔ ہنومان جب گاڑی کے قریب سے گزرا تو جگت نے پکار کر کہا۔

''ہنومان! اسے زیادہ اذیت مت دینا۔''

ادھر حکم اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا لیکن مانک کی رفتار کے آگے اس کی کیا وقعت تھی؟ دوڑتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گھوڑی پر ملک الموت نظر آیا مانک سر پر پہنچ چکی تھی۔

ہنومان نے گھوڑی کی لگام کھینچی اور گھوڑی اپنی اگلی دو ٹانگیں اونچی کرکے رک گئی۔ حکم اپنی موت کو اس قدر قریب دیکھ کر کانپ گیا۔ ہنومان نے برچھی کی ڈانگ بلند کی اور آن کی آن میں برچھی حکم کے شانے کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ وہ وہیں پیٹ کے بل گرا۔ ہنومان نے اسے لات مار کر سیدھا کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے پیٹ میں برچھی گھونپ دی اور جب برچھی نکالی تو خون کا زبردست فوارہ سا بلند ہوا۔ دوسرے ساتھیوں کو لیے اتنے میں کار بھی وہاں آگئی۔ ہنومان نے برچھی کو گاڑی کے پہیے سے صاف کیا اور گھوڑی پر سوار ہوگیا دونوں چل پڑے۔

گھوڑی اور موٹر تیزی سے منزل طے کررہے تھے۔ ذرا آگے جاکر جگت نے ایک پولیس والے کو آتے دیکھا تو اس نے کار رکوائی اور پولیس والے سے کہا۔

''ارے او یہ راستا کس طرف جاتا ہے۔''

پولیس والے کو یہ لہجہ سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن فوجی افسروں کو دیکھ کر غصہ پی گیا اور بولا۔

''صاحب تھوڑا آگے جاکر یہ راستا دو راستوں

میں بٹ جائے گا۔ ایک راستہ جنگل کی طرف جاتا ہے اور دورانا نک پوری کی طرف۔''

جگت نے یہ سننے کے بعد کہا۔ ''اچھا اب غور سے سنو یہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک لاش پڑی ہے۔ ہمارے بہادر ساتھی ہنومان نے حکم سنگھ کو قتل کیا ہے۔ اندھے ہوٹل والے کو اس کے بھانجے کے قتل کی اطلاع دے دینا اور پھر شیخوپورہ کے پولیس افسر سنہا کو اطلاع دینا کہ ''جگت کی ٹولی'' نے چوبیس گھنٹے میں یہ چوتھا قتل کیا ہے اگر سنہا کو زندگی پیاری ہو تو پنجاب چھوڑ کر چلا جائے ورنہ گالیاں اور گولیاں کھانے کے لیے تیار رہے۔''

پولیس والے کو جب یہ علم ہوا کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے تو وہ کانپ گیا اور آنکھیں بند کرکے گاؤں کی طرف ایسے بھاگا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

سپاہی کی حالت پر پانچوں دوست کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جگت نے ہشیار سے کہا۔ ''چلو گاڑی دوڑا دو آج کی رات جنگل میں گزاریں گے۔''

دوسرے ہی لمحے گاڑی جگت اور اس کے ساتھیوں کو لے کر جنگل میں داخل ہوگئی۔ دن ڈھل چکا تھا دونوں طرف اگی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر گاڑی سے آگے چلتا رہا اور جب اندھیرا بڑھ گیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ جنگل میں بہت دور نکل آئے ہیں سب دوست رک گئے ہنومان کو بھیجا گیا کہ آس پاس کوئی آبادی ہو تو اس کا پتا لگا کر جلدی آئے۔ باقی دوست ستانے لگے اور ہنومان جب تھوڑی دیر بعد واپس لوٹا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ آتے ہی اس نے خبر دی کہ یہاں سے تھوڑی دور بنجاروں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور اس وقت آگ روشن کرکے کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ جگت نے ہنومان کی بات سنی تو بولا۔

''بہت اچھے تو آج کی رات ہم ان کے مہمان بنیں گے۔''

جگت یہ کہہ کر گاڑی میں سوار ہوگیا اور آناً فاناً یہ لوگ ہنومان کے بتائے ہوئے پتا پر جا پہنچے۔ بنجاروں نے فوجی جوانوں کو دیکھا تو بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں بچن کی مرغی کھانے کی خواہش بھی آسانی سے پوری ہوگئی۔ کھانا جب ختم ہوا تو بنجاروں نے ناچ گانے کی محفل جمادی۔ ان دوستوں کے علاوہ صرف بنجاروں کے قافلے میں عورتیں اور بچے ملا کر تقریباً ساٹھ ستر آدمی تھے۔ یہ محفل رات گئے تک جمی رہی۔ اس کے بعد یہ تھکے ہارے دوست اپنے اپنے بستروں پر جاکر ایسے سوئے کہ پانچ چھ گھنٹے بعد آنکھ کھلی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ مستعد نظر آرہے تھے۔ ضروریات سے جلدی جلدی فراغت پاکر انہوں نے بنجاروں کے سردار کو بلایا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولے۔

''مہمان نوازی کا شکریہ مگر جاتے جاتے ایک حقیقت تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی فوجی افسر نہیں ہے پہلے کبھی تھے اب ہم سب ڈاکو ہیں۔''

سردار مہمانوں کا یہ جملہ سن کر چونکا اور افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ ''یارو! اگر پہلے پتا چل جاتا کہ تم لوگ فوجی نہیں ڈاکو ہو تو اس سے زیادہ خاطر کرتا۔''

''خیر پھر کبھی ملاقات ہونے پر کسر نکال دینا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ قریب میں کہیں سواری کے اچھے گھوڑے مل سکتے ہیں؟''

سردار جگت کی بات سن کو بولا۔ ''ہمارے پاس چند ٹٹو ہیں لیکن وہ تمہارے کام نہیں آئیں گے ورنہ لے جانا چاہو تو خوشی سے لے جاؤ، رہی گھوڑوں کی بات تو جنگل پار کرکے ایک چھوٹا سا بنگلہ نظر آئے گا۔ اس کا مالک کبھی کبھی آب و ہوا تبدیل کرنے کے لیے وہاں

آتا ہے۔ اسے گھوڑے پالنے کا بہت شوق ہے اور وہاں گھوڑے بھی اچھے ہیں۔ اب تک ان پر ہماری نظر تھی مگر تمہیں ہم سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اب تم ان گھوڑوں کو لے جاسکتے ہو۔" اس کے بعد سردار سب سے باری باری گلے ملا اور بولا۔ "ڈاکے ڈالو گے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہو گے اس لیے ہماری ملاقات کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی کبھی بھی ہمارا مہمان بننے میں خطرہ محسوس نہ کرنا۔ اپنے ہوتے ہوئے ہم تم پر کبھی بھی آنچ نہ آنے دیں گے۔"

بنجاروں کے سردار کی باتیں سن کر پانچوں دوست روانہ ہونے کے لیے اپنی اپنی سواریوں پر بیٹھ گئے۔ ہشیار نے ابھی گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ سردار کو کچھ یاد آگیا اور اس نے آواز دے کر جانے والوں کو روکا اور کہا۔ "دوستو جب جنگل پار اس بنگلے سے گھوڑے لینے پہنچو تو ایک بات کا ضرور خیال رکھنا کہ اس زمیندار کے ہاں بہت خطرناک شکاری کتے ہیں بھونکنا نہ شروع کردیں ان سے خبردار رہنا۔"

جگت کو بوڑھے سردار کی بات سن کر اس کی دوستی پر اعتماد سا ہوگیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"بابا کتوں وغیرہ کی کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ ہم زمیندار کو جگا کر اس سے گھوڑے چھینیں گے چوری نہیں کریں گے۔"

سردار نے جگت کی بات سنی تو اس کی دلیری کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "ارے شاباش جوانو بہادری اسی کا نام ہے۔" بوڑھا سردار اسی طرح کی باتیں کرتا رہا اور پانچوں دوستوں کو جاتا دیکھتا رہا۔ آن کی آن میں جگت کی یہ ٹولی بنجاروں کے پڑاؤ سے دور ہوتی گئی اور آخر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔



جگت کے پروگرام کے تحت اوپر تلے مختلف جگہوں پر کئی وارداتیں ہوئیں جس نے شیخوپورہ کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیا۔

حکم سنگھ کے قتل کی اطلاع ملتے ہی سنہا فوراً وہاں پہنچا اور وہاں تفتیش کرنے پر یہ سن کر حیران رہ گیا کہ جگت ڈاکو اور اس کے ساتھی جیپ کی بجائے کار میں آئے تھے۔ اب سنہا کے سامنے یہ سوال تھا کہ انہوں نے جیپ کا کیا' کیا؟ اور کار کہاں سے حاصل کی؟ سنہا نے ایک پولیس پارٹی ڈاکوؤں کے تعاقب کے لیے فوراً روانہ کردی تھی۔ اس پارٹی نے دوسری صبح اطلاع دی کہ فوجی جیپ نانک پورے سے مل گئی ہے۔ سنہا کو کچھ سلجھتی ہوئی نظر آنے لگی۔ پولیس نے نانک پور کے موٹر گیراج کے مالک سردار جی کو دھر لیا تھا۔ سردار جی نے شام کار کا انتظار کیا اور پوری رات بے چینی سے گزاری تھی۔ صبح ہی صبح فوجیوں کی جگہ پولیس پہنچی اور جیپ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ سردار جی کو بھی حراست میں لے لیا۔ ابھی صبح کا واقعہ تازہ ہی تھا کہ دوپہر کو ڈوگرا کے زمیندار نے شکایت کی ڈاکو رات کو اسے بندوقیں دکھا کر چار گھوڑے اور ایک رائفل چھین لے گئے ہیں اور ایک پرانی کار اس کے بنگلے پر چھوڑ گئے ہیں۔

ذہین' سخت مزاج اور شعلہ نوا سنہا بھی جگت کی ان تیز تیز چالوں سے چکرا کر رہ گیا۔ شیخوپورہ اب تک سنہا کی دھاک اور رعب داب ہی کی وجہ سے ڈاکوؤں کی دستبرد سے آزاد تھا۔ پنجاب میں دو جگا ڈاکو موجود تھے۔ ایک منٹگمری کا جگا اور دوسرا لاہور کا لیکن شیخوپورہ میں کوئی واردات کرنے کی ان میں سے کسی نے ہمت نہیں کی تھی لیکن اسی ضلع میں پیدا ہونے والے جگت سنگھ جگا نے سنہا کے علاقے ہی میں وارداتیں کیں اور پر سے دھمکیاں بھی دیتا جارہا تھا۔

شروع میں سنہا کا خیال تھا کہ وہ ایک بڑی پولیس پارٹی کے ذریعے جگا کو زیر کرلے گا اسی زعم میں وہ سکھ رجمنٹ کے کرنل خوشونت سے کہہ بھی آیا تھا کہ "جگت قتل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوا تھا اس لیے وہ پہلے پولیس کا مجرم ہے اس کے بعد فوج کا۔ میں اسے مع ساتھیوں کے گرفتار کرکے سزا دلواؤں گا۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں فوج کی طرف سے سزا تجویز کردیں لیکن پہلا حق ہمارا ہوگا۔"

لیکن اب سنہا کو احساس ہورہا تھا کہ جس کام کو وہ اتنا آسان سمجھا تھا وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جگت اتنے کم عرصے میں طوفان بن کر چھا جائے گا اور سارے علاقے میں اس کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ جگت اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت اچانک نمودار ہوتے اور واردات کرکے ایسے غائب ہوجاتے جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئے ہوں۔ جب پولیس جائے واردات پر پہنچتی تو کوئی بھی بیان یا گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا حتیٰ کہ لٹنے والا تک یہی کہتا۔

"چھوڑیے صاحب جانے دیجیے' جو گیا سو گیا اب کوئی بات ہوئی اور وہ دوبارہ آگیا تو جان کے بھی لالے پڑجائیں گے۔"

جگت نے پہلا بڑا ڈاکہ اپنے ساتھی کرپال کے باپ کی زمین ہتھیانے والے زمیندار کے ہاں ڈالا۔ اس نے دوپہر کے وقت آرام کرتے ہوئے زمیندار کو جگایا اور کرپال کے باپ کی زمین کے کاغذات نکلوائے جو زمین گروی رکھنے کے سلسلے میں زمیندار نے بنائے تھے۔ جگت نے ان کاغذات کو اسی وقت وہیں جلادیا پھر مڑ کر زمیندار کو دیکھا تو وہ منہ زور مغرور زمیندار کانپتے ہوئے بولا۔

"اب کے معاف کردو جگت سنگھ جی پھر کبھی کرپال جی کے پتا کی زمین پر قدم بھی رکھوں تو باپ کا نہ سمجھنا۔"

جگت نے بات سنی اور زمیندار کے موٹے پیٹ پر بندوق رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن تو نے اب تک اس غریب کو اذیتیں دیں اس کا کیا ہوگا؟"

"اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا مائی باپ۔"

زمیندار بری طرح کانپ رہا تھا۔

"نہیں' اس طرح سودا نہیں پٹ سکتا۔ تو نے ایک غریب کو قرض دے کر اور سود در سود لگا کر اس کی زمین ہتھیالی۔ اتنے سال تک اس زمین کی فصل کی ساری رقم تیری اسی تجوری میں جاتی رہی ہے۔ اس کمائی کو بھی سود کے ساتھ وصول کرنا چاہتا ہوں اور یہ سود ساہوکار کا سود نہیں ہے ایک ڈاکو کا سود ہے۔"

جگت نے یہ کہا اور زمیندار سے تجوری کھلوا کر بہت سا نقد روپیہ اور زیورات کا ایک بڑا بکس نکال لیا۔ اس کے بعد جگت اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہوکر ذرا سی دیر میں غائب ہوگئے۔

سنہا کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس کی حیرانی اور بڑھ گئی کہ اتنا سخت دل اور منہ زور زمیندار بھی اپنے ہاں کے ڈاکے کی خبر دینے پولیس تھانے تک نہ آیا بلکہ پولیس کو خود اس کے گھر جانا پڑا۔ اصل بات یہ تھی کہ زمیندار جگت کی ہمت' شجاعت اور بے باکی دیکھ کر اتنا سہم گیا تھا کہ اس نے سوچا کہ پولیس کو رپورٹ کرنے سے کہیں جگت سارے خاندان ہی کو نہ ختم کردے۔

پولیس ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک سمت سے دوسری سمت تک جگت اور اس کی ٹولی کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ سنہا کا حکم تھا کہ اگر اس سے کہیں سامنا ہوجائے تو ماردینا یا مرجانا۔ اس کے ساتھ ساتھ سنہا اس وقت کا بھی منتظر تھا جب جگت رتیا گاؤں آئے اور اسے یہیں گھیر لیا جائے۔ سنہا کا خیال تھا کہ جگت کبھی نہ کبھی ضرور ماں باپ سے ملنے گھر آئے گا۔

چیت کا مہینہ گزر کر بیساکھی شروع ہو چکا تھا۔ بیساکھ کی گرمیوں نے ویرو کے دل میں ڈوبی ہوئی محبت کی چنگاریوں میں ایک مرتبہ پھر آگ بھر دی۔ اب سے پورے ایک سال پہلے اسی بیساکھ کے مہینے میں اس نے پہلی مرتبہ جگت کو دیکھا تھا اور ساون کا مہینہ آتے آتے اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ اس مختصر سے تین مہینے کے عرصے میں جگت کو اس نے طرح طرح سے پرکھ لیا تھا اور سوچنے لگی تھی کہ اس کے لیے جگت جیسا مرد ہونا چاہیے تھا۔

ویرو کا میاں موہن سنگھ اسے اب اور زیادہ مارنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چار چوٹ کی مار ویرو کے دل سے ضرور جگت کے خیال کو نکال دے گی مگر جیسے جیسے ظلم بڑھتے گئے ویرو کے دل میں جگت کا پیار بھی بڑھتا گیا۔ وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی۔ اس کا دل بار بار اس سے کہتا۔

"کچھ بھی ہو اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔"

ویرو پر ستم بڑھتے گئے چاچی اس کی جانی دشمن بن چکی تھی ایسا لگتا تھا جیسے ویرو ہی اس کے بیٹے بدھی سنگھ کی قاتل ہو۔ روز ہی وہ کوئی نہ کوئی قصور تلاش کر کے ویرو کو نئے نئے طعنے سنا دیتی۔ اس کے ماں باپ کو ایسی ایسی گالیاں سناتی کہ پاس پڑوس کے لوگ بھی کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ ویرو یہ سب کچھ سنتی مگر خاموش رہتی۔ کچھ دنوں تک اسی طرح دکھ اور تکلیف اٹھا اٹھا کر زندگی گزارتی رہی لیکن اب چاچی نے چند دنوں سے اس پر ایک اور نیا الزام تھوپنا شروع کیا تھا۔

"ویرو بانجھ ہے۔"

یہ بات...... یہ الزام ویرو کسی طور برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ جب یہ بات سنتی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ چاچی کی زبان کاٹ کر پھینک دے۔ ویرو کو چاچی کی وہ باتیں بھی اب تک یاد تھیں جب وہ اپنے بیٹے کے لیے ویرو کی بہن کا رشتہ مانگتے ہوئے خوشامدیں کیا کرتی تھیں اور اب دیکھتے ہی دیکھتے پرائے گھر کی مالکن بن کر مالکن ہی کو بانجھ ہونے کا طعنہ دینے لگی تھی۔ ویرو کے دل میں اکثر یہ خیال آیا کہ چاچی سے کہہ دے۔ "تیرے بھتیجے میں ہی دم نہ ہو تو بیوی کیا کرے گی؟" مگر پھر خاموش ہو جاتی کہ بات کچھ اور طول پکڑ جائے گی۔

ویرو کا شوہر موہن سنگھ بھی زندگی سے مایوس سا ہو گیا تھا۔ برابر کے تین جوان بھائیوں کی موت نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اب اسے بار بار خیال آتا کہ شاید وہ بھی کسی دن اسی طرح زندگی کی بازی ہار جائے گا۔ جگت کے خوف سے اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ دن میں بھی گھر سے باہر جاتے ہوئے اسے موت کا ہی کھٹکا لگا رہتا۔ جان کے خوف سے ہی وہ کام سے اچاٹ ہو گیا تھا آخر اس نے کھیت ٹھیکے پر دے دیے تاکہ کچھ نہ کچھ تو آمدنی کا ذریعہ بنا رہے۔ بیٹھے بیٹھے پیسا آنا شروع ہوا تو نئے نئے شغل سوجھے۔ گاؤں کے چار پانچ جواریوں سے یارانہ ہو گیا ان میں تین بالکل لفنگے تھے دو لڑکے کہنے کو تو اچھے گھروں کے تھے مگر لچھن ان کے بھی ان لفنگوں سے کم نہیں تھے۔ یہ پانچوں کے پانچوں روزانہ دوپہر میں موہن کے گھر آ جاتے اور رات تک تاش کے پتوں اور شراب سے دل بہلایا کرتے۔ بڑی بڑی بازیاں جمتیں، ٹھٹھول ہوتے ویرو یہ سب کچھ بھی دیکھتی مگر کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ موہن کے یہ نئے دوست آتے جاتے ویرو پر بھی میلی نگاہ ڈالتے اور اکثر ان کے ٹھٹھول میں چھت پر گونجتے قہقہوں کے بیچ ویرو اپنا نام بھی ان کے بے حیائی کی باتوں میں سنتی۔ کئی بار اس نے ان لوگوں کے طعنے بھی

سنے۔ وہ موہن سے کہتے۔

"یار موہن سنگھ گھر میں حسن کی دیوی ہے آمدنی بھی اچھی خاصی بندھی بندھائی آتی ہے۔ لیکن گھر کے وارث کا اب تک پتا نہیں کیا ویرو قریب نہیں آنے دیتی یا پھر تم ہی......؟" بات یہاں تک پہنچتی۔ نیچے ویرو شرم سے پانی پانی ہو جاتی اور اوپر سے قہقہوں کی برساتیں ہونے لگتیں۔ ویرو کو کبھی پانی یا لسی کے گلاس دینے یا خالی گلاس واپس لینے اوپر جانا پڑتا تو چوہدری کا بیٹا رنبیر سنگھ اسے ایسے گھورتا جیسے آنکھوں کے راستے اسے کچا ہی اپنے اندر اتار لے گا۔ کبھی کبھی ویرو کو دیکھتے ہی لچر اور آوارہ سے گیت کا ٹکڑا بھی گنگنانے لگتا کہ شاید ویرو اس طرح متوجہ ہو جائے۔ ایک بار گلاس لیتے ہوئے اس نے ویرو کی انگلی دبا دی۔ بس اس دن سے ویرو اوپر جانے سے کترانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان لوگوں کے دل میں اس کے لیے میل ہی میل بھرا ہے۔ وہ اب چاچی کو اوپر بھیجنے لگی۔ رنبیر بھی کچھ حالات کو جان گیا اس نے بڑی چالاکی سے کام لے کر اب چاچی کو رام کرنا شروع کر دیا۔ ایک بار ویرو نے بھی چاچی اور رنبیر کو کھڑے گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا اور اس دن رنبیر کہیں سے ناس کی ایک ڈبیہ بوڑھی چاچی کے لیے لایا اور ڈبیا تھماتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے لیے خاص طور سے یہ ناس کی ڈبیہ امرتسر سے منگوائی ہے۔ جب ختم ہو جائے تو بتا دینا اور منگوا دوں گا۔" اور چاچی نے رنبیر سے ڈبیہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھ ابھاگن کا اب کون ہے تم نے میرا اتنا خیال کیا بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

اس کے بعد چاچی اور رنبیر میں اکثر کھسر پھسر ہوتی رہی۔ کچھ ہی دن بعد چاچی کھل کر ویرو سے کہنے لگی۔ "سن ویرو! میں اب یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا بھتیجا لاوارث رہے اگر اس سال بھی گھر میں پالنا نہ بندھا تو موہن کے لیے دوسری بہو لے آؤں گی۔"

چاچی کی بات سن کر ویرو کا دل تو چاہا کہ کہہ دے ایک نہیں دس اور لے آؤ میرے اوپر کیا فرق پڑتا ہے یا اس گھر کا وارث وہ کہاں سے لے لائے گی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گئی لیکن میاں سے رات کو بولی۔

"دیکھو جی چاچی اب تمہارے لیے دوسری دلہن لانے والی ہے۔ ذرا زیورات وغیرہ تیار رکھنا۔"

موہن کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ اسے پتا تک نہیں تھا کہ چاچی ویرو سے اس انداز کی بکواس کرتی رہی ہے۔ اس نے ویرو سے کہا۔ "ویرو تو چاچی کی باتوں پر توجہ نہ دیا کر بکنے دے جو بکتی رہتی ہے۔"

ویرو میاں کی یہ بات سن کر چاہتی تو چپ بھی ہو سکتی تھی مگر اس طرح بات ادھوری چھوڑنا اسے ٹھیک نہ لگا اس نے میاں سے کہا۔ "بار بار آج کل وہ مجھے بانجھ ہونے کا طعنہ دیتی رہتی ہے اس سے کہہ دو کہ میرے لیے ایسے بول منہ سے نہ نکالا کرے۔"

اب موہن بھی خفا ہو گیا اور غصے سے بولا۔ "ہر بات کو بڑھا چڑھا کر گھر کو سر پر اٹھا لینے کی عادت مجھے پسند نہیں ہے۔ کیا اب اس بات پر بھی میں چاچی سے جھگڑا کروں؟ ارے تم بانجھ نہ ہوتیں تو وہ کیوں کہتی اب کہتی ہے تو غلط تھوڑی کہتی ہے؟"

ویرو نے موہن سے ایسی بات سنی تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ بولی۔ "تم بھی مجھ سے یہ کہہ سکتے ہو کیا؟ چلو عورت ماں نہ بن سکے تو یہ اس کا قصور ہوا لیکن مرد اگر باپ نہ بن سکے تو؟"

ویرو نے جو جملہ کہا تھا اسے سن کر موہن بھنا گیا۔ چیخ کر بولا۔

"اب ایسی باتوں سے تو مجھے گاؤں میں بدنام کرنا

چاہتی ہے؟ حرام زادی خود اس قابل نہیں ہے اور الزام مجھ پر رکھتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ویرو کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر ویرو کا غصہ سے سرخ چہرہ اور شعلے برساتی آنکھیں دیکھ کر اس کا ہاتھ وہیں رہ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ تھپڑ جو اس وقت ویرو کے لیے اٹھا ہے ویرو کبھی برداشت نہیں کرے گی اور پھر جانے کیا ہوجائے وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چاچی وہاں آن ٹپکی اور چاچی کو دیکھ کر دونوں ہی خاموش ہوگئے۔



چولہے سے اڑنے والی چنگاریوں پر نظریں جمائے جگت کی ماں سوچوں میں گم تھی۔ صبح شام میاں کو روٹیاں پکا پکا کر کھلانے کے علاوہ اب اسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چولہے کی انہی چنگاریوں کی مانند جگت کی یاد اچانک اس کے دل میں جب بھی جاگتی تو وہ آنسو بہا بہا کر ان چنگاریوں کو خاموش کردیا کرتی لیکن جتنا بیٹے کو بھولنے کی کوشش کرتی وہ اور یاد آجاتا۔ جب سوہن سنگھ سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے تو اکثر اسے لگتا جیسے جگت بھی سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا ہو۔ کبھی وہ نیند سے اچانک جاگ جاتی اور چھت پر لگے کڑوں کو گھورنے لگتی۔ اسے یاد آتا کہ جگت جب چھوٹا تھا چھت کے انہی کڑوں میں اس کا جھولا بندھا رہتا تھا۔ وہ اسے جھولا جھلا جھلا کر اور لوریاں سنا سنا کر سلایا کرتی۔ آج وہی لاڈوں کا پالا بیٹا جانے کہاں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ کیا اسے رات کو سکون سے نیند آجاتی ہوگی؟ کیا اسے ماں باپ بالکل یاد نہ آتے ہوں گے؟ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے رات آنکھوں میں کٹ جایا کرتی۔

دن کے وقت جب وہ گھر میں اکیلی ہوتی بار بار اس کی نگاہ دروازے کی طرف جاتی۔ اسی دروازے کی طرف جہاں سے آخری مرتبہ اس نے جگت کو گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ آدھی رات کا وہ وقت اسے کبھی نہ بھولتا۔ وہ سوچتی اب جگت شاید کبھی واپس نہیں آئے گا اور پھر وہ دل ہی دل میں طے کرتی کہ اگر وہ آیا تو بھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھوں گی۔ لیکن یہ سب سوچنے کے بعد بھی اگر دروازے پر ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا کہ کہیں جگت ہی نہ آگیا ہو۔

سوہن سنگھ باہر سے آکر روز ہی جگت کے بارے میں نئی نئی خبریں سناتے۔ آج اس نے فلاں گاؤں میں ڈاکہ ڈالا۔ آج فلاں کسان کو اس کی زمین واپس دلا دی۔ فلاں گاؤں میں پولیس کے آدمی تمام رات راستے روکے پڑے تھے لیکن جگت سب کو چکمہ دے کر نکل گیا۔ پولیس اب جگت کی گرفتاری پر انعام کا اعلان کرنے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جگت کی ماں یہ خبریں سنتی مگر اسے صرف ان خبروں سے اتنی ہی دلچسپی تھی کہ ان خبروں سے جگت کے زندہ ہونے کی خبریں اسے ملتی رہتی تھیں کیونکہ اسے ہر لمحے یہ خوف کھائے جاتا کہ کسی دن اچانک سنوں گی کہ جگت پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ پولیس سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ بھگوان سے دعا مانگا کرتی۔

"ہے بھگوان، بس یہی خبر سننے کے لیے مجھے زندہ نہ رکھنا۔"

اس وقت وہ سوہن سنگھ کا انتظار کرتے ہوئے توے سے پراٹھے اتار رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اپنا آج فیصلہ میاں کو جلد سے جلد سنا کر انہیں مجبور کردے گی وہ فوراً دودھیا گاؤں جائیں اور چندن کور سے جگت کی منگنی کی بات مسترد آئیں۔ بیٹے نے تو پہلے ہی

کتنوں کی زندگیاں اجاڑ دی ہیں اب اس معصوم چندن کور کی زندگی جگت کے ساتھ کیوں تباہ کی جائے؟

سوہن سنگھ باہر سے آئے۔ جگت کی ماں نے ہاتھ منہ دھویا اور پھر کھانا پروس دیا۔ سوہن سنگھ جب کھانا کھا چکے تو جگت کی ماں نے کہا۔ "آج سمدھی کے یہاں ضرور چلے جانا۔"

ویسے شاید کوئی دن ایسا جاتا ہو جب جگت کی ماں ان سے یہ بات نہ کہتی ہو۔ اس لیے سوہن سنگھ نے روز کی طرح بات ٹالنے کے لیے کہا۔ "کل چلا جاؤں گا۔ جلدی کیا ہے؟"

"کل کل کر کے تم نے کتنے دن گزار دیے۔ بیساکھی بھی آگیا ایک بات جب ہونی ہے تو طے ہو ہی جائے تاکہ اس بے چاری کا کہیں اور ٹھکانہ ہوجائے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہم خود ہی اس کا کوئی دوسرا اچھا سا رشتہ کروادیں تو بہتر ہو بھگوان اسے سکھی رکھے۔"

سوہن سنگھ نے یہ بات سنی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں چپ دیکھ کر جگت کی ماں نے اپنے نئے فیصلے کا اعلان کردیا۔ "آج شام تک تم سمدھی کے یہاں نہیں گئے تو مجھ پر اناج کا دانہ حرام ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں پانی لیا سوہن سنگھ ششدر رہ گئے۔ آج کئی سال بعد ان کی بھی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے مگر انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی میں شام کو روانہ ہوجاؤں گا۔"

جگت سے چندن کور کی منگنی بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ دونوں کے باپ پولیس میں رہے تھے اور نوکری کے دنوں میں ایک زمانے تک دونوں ہی دو برابر برابر کے گاؤں میں صوبے دار رہے تھے۔ جس وقت کی یہ بات ہے اس وقت جگت کی عمر چھ سات برس کی اور چندن کور کی دو ڈھائی سال کی تھی۔ چندن کور کے باپ اپنے علاقے میں کئی سال سے تعینات تھے لیکن جگت کے باپ سوہن سنگھ ان کے برابر والے گاؤں میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ دن جیسے جیسے گزرتے گئے ان دونوں گھروں میں تعلقات بڑھتے گئے اور ان تعلقات کو مزید بڑھانے کے لیے دونوں بزرگوں نے چندن اور جگت کی منگنی کردی۔ پھر سوہن سنگھ وہاں سے رٹیا آگئے۔ جگت بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ اس کے بعد خاندان کے حالات کے تحت جگت نانا کے گھر پلا بڑھا اور جب وہ اپنے گھر واپس لوٹا اور چندن کے باپ کو اس کی واپسی کی اطلاع ملی تو انہوں نے سوہن سنگھ سے کہلوایا کہ لڑکی اب شادی کے قابل ہوگئی ہے۔ بارات لے کر آؤ تو اس کے ہاتھ پیلے کردیں لیکن قسمت تو کچھ اور ہی کھیل کھیل رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ چندن کے ہاتھ پیلے ہوتے جگت نے انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ لال کرلیے سوہن سنگھ کے سمدھی نے جب یہ سنا تو خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

اس وقت گھر سے روانہ ہو کر پژمردہ دل کے ساتھ جب سوہن سنگھ دودھیا گاؤں میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک بہت بڑا بوجھ بھی تھا جس کی بنا پر ان کا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا۔ یہ تھی ان کے شانے پر لٹکی ہوئی وہ پوٹلی جس میں جگت اور چندن کے شگون کے چاندی کے پانچ روپے، چاول، بادام، کشمش اور پانچ ٹکڑے سپاری کے بندھے تھے۔ جگت کی ماں نے اتنے سالوں تک ان چیزوں کو بڑے شوق اور چاؤ سے سنبھال کر رکھا تھا اس کا خیال تھا کہ اس پوٹلی میں ہماری آنے والی نسلوں کا بیج ہے لیکن حالات ایسے بدلے کہ سوہن سنگھ آج وہی پوٹلی واپس کرنے آئے تھے۔

بشن سنگھ صوبیدار کا گھر سامنے آگیا۔ سوہن سنگھ کو

آتا دیکھ کر چندن کور جو اس وقت بھینس کا دودھ دوھ رہی تھی کھڑی ہوگئی۔ دوپٹا سنبھالا اور دوڑ کر گھر میں جا کر چلائی۔

''باپو! رتیا سے تایا جی آئے ہیں۔''

بشن سنگھ بیٹی کی یہ بات سنتے ہی جلدی سے کھڑے ہوگئے۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر نئی چادر ڈالی اور پھر لنگڑاتے ہوئے جلدی جلدی باہر نکلے اور سوہن سنگھ کو آنگن میں ہی گلے لگالیا' بولے۔

''پہلے سے کہلوایا ہوتا تو گاڑی بھجوا دیتا۔''

سوہن سنگھ نے بشن کے ملنے اور اس طرح کے جملے سننے کے بعد محسوس کیا کہ بشن کی گرم جوشی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بشن کو حیرانی سے نکالنے کے لیے بولے۔

''کئی روز سے آنے کی کوشش کررہا تھا لیکن آنہ سکا۔ مگر آج تمہاری سمدھن نے اصرار کرکے مجھے مجبور کرہی دیا۔''

''بھابھی کیسی ہیں؟'' بشن نے فوراً پوچھا۔ سوہن سنگھ' بشن سے عمر میں بڑے تھے اس لیے بشن' جگت کی ماں کو بھابھی کہہ کر پکارتا تھا اور اسی لیے چندن کور ہمیشہ سے سوہن سنگھ کو تایا جی کہتی تھی۔ سمدھیانے طے ہوجانے کے بعد بھی دونوں گھروں کا تعلق رشتہ داری سے زیادہ دوستی کے بل بوتے پر قائم تھا۔

باتیں ہورہی تھیں کہ چندن کور نے آکر سوہن سنگھ کے قدم چھوئے اور تایا جی کے پیار کرنے کے بعد ان کے لیے لسی لینے اندر چلی گئی۔ مگر اندر پہنچ کر بھی اس کے کان باپو اور تایا جی کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ باپو باہر تایا جی سے پوچھ رہے تھے۔

''کہیئے ہمارے داماد کے بارے میں کیا خیر خبر ہے؟''

سوہن سنگھ' بشن کی بات سن کر چونکے اور ذرا رک کر بولے۔

''جو خبریں باہر سے آتی ہیں وہی ہم بھی سن لیتے ہیں۔''

''ہاں باہر کی خبریں تو ہم بھی رکھتے ہیں۔ ہماری چندن' جگت کی روز نئی نئی خبریں لاتی ہے۔ جب کنوئیں سے پانی بھر کر لوٹتی ہے تو وہ ساری باتیں جو اس کی ملنے والیوں نے سنائی ہوتی ہیں' ہمیں آکر بتاتی ہے کہ آج کہاں ڈاکہ پڑا' کسے لوٹا' آج کس کسان کے لیے زمیندار کو دھمکی دی۔''

سوہن' بشن سنگھ کی باتیں غور سے سن رہے تھے کہ بشن یہ باتیں کہیں طنز میں تو نہیں سنا رہا۔ لیکن بشن کے لہجے میں کہیں بھی طنز مترشح نہیں تھا۔ اتنے میں اندر سے آکر چندن کور نے لسی کے بڑے بڑے پیالے ان کے سامنے رکھے۔ سوہن سنگھ نے کافی عرصے بعد چندن کور کو دیکھا تھا۔ اب وہ چھوٹی سی چندن نہیں رہی تھی ایک بھرپور لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جو کسی کا بھی گھر بسانے کے قابل ہو۔ اس کے رخساروں پر گلاب کھلے ہوئے تھے۔ چندن کور کو جاتا دیکھ کو سوہن سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری انہیں ایسا لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی شے انہیں کاٹے دے رہی ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹے جارہے تھے۔ ایسے محبت بھرے گھر سے آخر وہ کیسے رشتہ توڑ دینے کی بات کریں گے یہ بات ان کی سمجھ میں کسی طور نہیں آرہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ہمت کرکے شانے پر لٹکی ہوئی پوٹلی اتاری اور چندن کے باپ کے سامنے رکھ دی۔

''کیا لے آئے بھائی جان؟ کیا میری بیٹی کے لیے ساس نے کوئی تحفہ بھجوایا ہے؟'' بشن نے ہنستے ہوئے یہ جملہ زور سے کہا اور باپ کی آواز سن کر چندن کے جاتے ہوئے قدم کمرے کے دروازے پر رک گئے۔ وہ دروازے کی آڑ لے کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے کے گلاب کچھ اور سرخ ہوگئے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

بشن نے بڑے شوق سے پوٹلی کھولی لیکن پوٹلی کے کھولتے ہی وہ گم صم ہوگیا۔ چندن کے کانوں میں جب کچھ دیر تک باپ کی آواز نہ آئی تو اس نے دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا مگر پوٹلی کے اندر کیا تھا یہ اسے نظر نہ آیا۔ مجبوراً اس نے اپنی توجہ باہر سے آنے والی آوازوں پر لگادی۔ چند ہی لمحوں بعد باہر سے چندن کے باپو کی آواز سنائی دی۔

''سوہن سنگھ جی...... یہ سب کیا ہے؟''

سوہن سنگھ گردن جھکائے جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ بشن سے آنکھ ملانے کی ان میں ہمت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بشن تمہاری بھابی نے شگون واپس کردیے ہیں۔''

سوہن سنگھ کا جملہ سن کر بشن کی جو حالت ہوئی تو ہوئی مگر اندر چندن کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور ڈولتے ہوئے دل کو تھام لیا۔ اس کے قدم وہیں رکے رہے۔ شاید اس لیے کہ اب باپو کیا پوچھتے ہیں مگر ان کی آواز نہ آئی۔ پھر سوہن سنگھ نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''دیکھو بشن سنگھ' میں جانتا ہوں تمہیں یہ بات بری لگی ہوگی۔ لگنی بھی چاہیے مگر تمہاری یہ شرافت ہی تھی جواب تک اپنی زبان کا پاس کیا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو جگت کے ڈاکو بنتے ہی منگنی توڑ دیتا لیکن ہمارا رشتہ دوستی کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا چندن تمہاری ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔ جگت کی ماں کو گھر میں بہو لانے کا کتنا ارمان تھا؟'' یہ کہتے کہتے سوہن سنگھ کی آواز رندھ گئی۔ وہ ذرا رک کر کھانسے پھر آواز کے ساتھ ساتھ اپنی پگڑی سے چہرہ پونچھنے کے بہانے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔

''ہمارا ایک ہی بیٹا زندہ رہ گیا ہے اس کے بیاہ کا کیا کیا ارمان ہمیں نہ ہوگا لیکن اس نے جو راستا اختیار کرلیا اس کا انجام بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔''

بشن' سوہن سنگھ کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی کبھی ایسے خیالات آکر اسے بھی پریشان کرجاتے تھے۔ مگر پھر بھی منگنی توڑنے کا خیال اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ آخر اس نے سوہن سنگھ سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا شگون واپس کرنے کے لیے جگت نے کہلوایا ہے؟''

''نہیں' اسے تو اس چیز کا خیال تک نہیں آیا ہوگا۔ اس لیے کہ ایک مرتبہ جانے کے بعد پھر وہ ہم سے ملنے تک نہیں آیا لیکن تمہاری بھابھی کہتی ہے کہ اب گھر میں بہو لانے سے کیا حاصل؟ کسی معصوم کو بیوہ بنانے کے لیے ہم اس گھر کی بہو کیوں بنائیں۔ اس معصوم کی اس میں کیا خطا؟''

سوہن سنگھ کی بات اور جگت کی ماں کا یہ جذبہ سن کر بشن اور چندن دونوں کانپ گئے۔ ذرا دیر خاموش رہی پھر سوہن سنگھ نے کہا۔

''جگت کی ماں نے قسم کھائی تھی کہ اگر آج میں شگون واپس کرکے نہ آیا تو آج سے اس پر دانہ پانی حرام ہے۔ میں یہاں اس مقصد سے آنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا لیکن جگت کی ماں نہیں مانی۔ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ میں یہاں دو تین دن رک کر واپس لوٹوں اور اس عرصے میں چندن کے لیے کہیں اور اچھا رشتا تلاش کرکے بات پکی کرآؤں۔''

سوہن سنگھ کی باتیں سن کر بشن آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ پوٹلی ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ چندن کور تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں

اتنی ہی دیر میں سرخ ہوگئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ آتے ہی اس نے پکارا۔

"ٹھہرو باپو۔" پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے دوپٹا ٹھیک سے اوڑھ کر وہ سوہن سنگھ کے روبرو آ گئی اور ہمت کر کے بولی۔

"تایا جی! اب چندن کو آپ کے گھر کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں چاہیے۔ جس ساس نے میرا اتنا انتظار کیا اور اتنا خیال کیا ہے مجھے بھی ان کے بڑھاپے کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ ٹھیک ہے مجھے شوہر کا پیار اور سکھ نہ ملے تو نہ سہی لیکن آپ کو اور ماں جی کو بھی ان کے بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔" یہ کہہ کر چندن نے شگون کی پوٹلی اٹھا کر سوہن سنگھ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کے بیٹے کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس سے کہلوا دیجیے کہ جب بھی فرصت ملے گھوڑی پر چڑھ کر ایک بار میرے پاس آ جائے۔ میں اس کے گلے میں مالا پہنا دوں گی۔ پھر چاہے وہ اسی وقت جہاں جانا چاہے چلا جائے۔ مگر یہ میرا فیصلہ ہے کہ بہو بن کر رہوں یا بیوہ رہوں گی اسی کے گھر میں۔"

چندن نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں یہ سب کچھ کہا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ دونوں بوڑھے اس کنواری مٹیاری کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔



جگت کے باپو سوہن سنگھ جب منگنی توڑنے کی بات کرنے کے لیے رتیا سے چلے تھے تو گھر سے نکلتے ہوئے کئی مرتبہ ان کے ضمیر نے انہیں ٹوکا تھا کہ یہ بات وہ دودھیا گاؤں جا کر لڑکی کے باپ بشن سنگھ صوبے دار سے کیسے کر سکیں گے؟ مگر دوسری طرف جگت کی ماں کی قسم نے انہیں مجبور کر دیا تھا وہ وہاں سے چل پڑے اور پورا راستا بھاری قدموں سے اپنے جسم کو کھینچ کھینچ کر انہوں نے طے کیا۔ انہیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ لڑکے کے نہیں خود لڑکی کے باپ ہوں۔ دودھیا گاؤں پہنچ کر ان کی نظریں اور جھک گئیں۔ بشن سنگھ سے دوران گفتگو بھی وہ ہنسنا تو کجا مسکرا کر بھی بات نہیں کر پائے تھے۔ جس کی بات کے لیے وہ یہاں تک آئے تھے اس کی فیصلہ کن باتیں سن کر خود سوہن سنگھ کے دل کا بوجھ بھی کم ہو گیا تھا۔ انہیں اب ایسا لگتا تھا جیسے چندن کور کے منہ میں ان کا دل بول رہا تھا۔

بشن سنگھ کے ہاں دودھیا گاؤں میں ایک رات ٹھہرنے کے بعد دوسرے دن جب وہ گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو اب سر فخر سے اونچا تھا۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں بار بار مونچھوں تک پہنچ کر اس کے کونے مروڑنے لگتیں۔ انہوں نے جاٹ جوان تو کئی دیکھے تھے جاٹوں کی ہٹ کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن کسی قانون سے باغی لڑکے کی منگیتر کو اپنے ہونے والے شوہر اور سسرال کے لیے زندگی کی بازی لگانے کی ہٹ کل ہی دیکھی تھی۔

انہیں یاد تھا کہ اس لمحے جب چندن کور اپنا فیصلہ سنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کیسا جلال تھا اس کی آنسوؤں کی آگ سے سرخ سرخ آنکھیں دور تک مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ چندن کور نے جو کچھ کہا ہے وہ اسے کر کے بھی دکھا دے گی۔ یہی باتیں تھیں جن کے بعد انہیں یہ مکمل اعتماد ہو گیا تھا کہ اب یہ باتیں جگت کی ماں سنے گی تو اس کا مردہ دل بھی خوشی سے بھر جائے گا۔ اب وہ یا جگت کوئی بھی چندن کے فیصلہ کو رد کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

بشن سے کہہ سن کر اور چندن کے سر پر ہاتھ رکھ کر جب سوہن سنگھ دروازے سے باہر نکلنے لگے تو چندن نے جھک کر ان کے قدموں کو چھوا اور جلدی سے رسی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہونے والے سسر کو

دیتے ہوئے بولی۔

"تایا جی یہ میری کلائی کا ناپ ہے۔ ماں جی سے کہیے گا سوبھاگیہ نشانی کے طور پر دو کنگن بنوا کر ابھی سے رکھ لیں موقع پر کام آئیں گے۔ کیا جانے کب انہیں میرے گھر آنے کا موقع مل جائے اور اس کی فوری ضرورت پڑے۔ پھر اس وقت پریشانی اٹھانی پڑے گی۔" چندن نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا پھر خود ہی شرما گئی اور تیزی سے اپنے چہرے کے گرد دوپٹے کی آڑ کر کے کھڑی ہو گئی۔ جگت کے باپو نے لاج سے دوہری ہوتی چندن کو دیکھا اور رسی کا ٹکڑا احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے دعا دی۔

"سدا سہاگن رہو بیٹی۔"

سوہن سنگھ گھر سے باہر چلے۔ چندن کے باپو انہیں کافی دور تک چھوڑنے ساتھ ساتھ آئے۔ راستے میں سوہن سنگھ کو مخاطب کر کے بشن نے کہا۔

"رتیا کی طرف جانے والا کوئی گاڑی بان مل جائے تو تمہیں اس کی گاڑی میں بٹھا دوں گا۔"

سوہن سنگھ نے کہا۔

"تم دونوں باپ بیٹی نے میری اور میرے خاندان کی جو عزت رکھی ہے اسے ہم لوگ کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے بشن سنگھ کہ ہمارا خاندان آگے چل پڑے گا۔ میں جاتے ہی کسی صورت بھی جگت کو چندن کا یہ پیغام بھجوا دوں گا کہ وہ ایک بار گھوڑی پر چڑھ کر تمہارے دروازے تک آئے تا کہ ہم بہو کو تمہارے ہاں سے الوداع کرا لیں۔"

سوہن سنگھ کی یہ بات سنتے ہی بشن کی آنکھیں بھر آئیں۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں کہ اتنے میں ایک گاڑی اُدھر سے گزری۔ گاڑی والے نے بشن کو دیکھتے ہی سلام کیا اور کہا۔

"کہاں کے ارادے ہیں صوبے دار جی رتیا جا رہا ہوں۔ اُدھر چلنا ہو تو لے چلوں؟"

بشن یہ سنتے ہی خوش ہو گئے۔ سلام کا جواب دیا اور گاڑی والے سے کہا۔

"نہیں، میں تو نہیں میرے بڑے بھائی رتیا جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں تک پہنچا دو تو مہربانی ہوگی۔"

گاڑی والے نے خوشی خوشی سوہن سنگھ کو گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی اور سوہن سنگھ بشن سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھے گاڑی چل پڑی۔ راستا کٹتا جا رہا تھا مگر سوہن سنگھ کا ذہن دودھیا ہی میں پڑا ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ چاہے میرے بیٹے کی بارات اس دھوم دھام سے نہ چڑھ سکے جیسی جاٹوں میں ہوتی ہے چاہے میں دوست احباب کو مدعو نہ کر سکوں کہ دیکھو لو میرے گھر بھی بہو آ گئی ہے اور دیکھنا اب بہت جلد اس گھر میں پالنا بھی بندھ جائے گا۔ بہت جلد کوئی مجھے دادا جی کہہ کر بھی پکارا کرے گا۔"

سوہن سنگھ اپنے میں گم یہی سوچے جا رہے تھے کہ گاڑی کو جھٹکا سا لگا اور وہ جاگتی آنکھوں جو سپنا دیکھ رہے تھے۔ اس سے چونک پڑے۔ گاڑی بان نے ان سے پوچھا۔

"کیوں بھئی، نیند آ رہی ہے کیا؟"

سوہن سنگھ گاڑی والے کی بات پر جھینپ سے گئے لیکن پھر مسکرا کر بولے۔

"ہاں، منع کرتے کرتے بھی بشن سنگھ نے اتنا کھلا دیا کہ اب نیند آ رہی ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ ہم آپس میں باتیں کرتے چلیں گے تو رتیا تک راستا آسانی سے کٹ جائے گا۔ مگر آپ تھکے ہوئے ہوں تو کوئی بات نہیں آرام کر لیجیے۔" گاڑی بان نے سوہن سنگھ سے کہنے کو تو یہ کہا مگر فوراً ہی ایک سوال بھی کر ڈالا۔

”آپ رتیا کے رہنے والے ہیں تو پھر یقینی طور پر آپ نے جگت سنگھ جگا کو دیکھا ہوگا۔ میرا مطلب ہے جگا ڈاکو کو تو آپ ضرور جانتے ہوں گے۔“

سوہن سنگھ گاڑی بان کے اس سوال پر چونک سے گئے اور الجھن میں پڑ گئے کہ کیا جواب دیا جائے۔ کیونکہ انہیں یہ بھی خیال آیا تھا کہ کیا پتا گاڑی بان مجھے پہچان کر مضحکہ اڑانے کے لیے اس طرح کے سوالات نہ کر رہا ہوں۔ انہیں چپ دیکھ کر گاڑی والا پھر بولا۔

”جگا کا نام سن کر آپ چپ کیوں ہو گئے؟ میں نے تو آپ سے پوچھا تھا کہ آپ جگت سنگھ جگا ہی کے گاؤں رتیا کے رہنے والے ہیں اس لیے اس کے بارے میں آپ سے کچھ معلومات حاصل ہوں گی۔ آج کل تو اس کے نام سے مالداروں اور ظالموں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔“ سوہن سنگھ، گاڑی بان کا یہ جملہ سن کر بھی سوچتے رہے کہ جگت کے بارے میں کوئی بات کی جائے یا نہیں؟ تو گاڑی بان ان کی خاموشی کا کچھ اور ہی مطلب سمجھا۔ ان کی طرف غور سے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ کندھے پر جو پوٹلی ہے اس میں کچھ مال وغیرہ ہے جو جگا کا نام سن کر گھبرا گئے ہو مگر سنا ہے وہ ہر ایک پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔“

یہ بات سن کر سوہن سنگھ ہنسنے لگے اور ان کا جی بے ساختہ چاہا کہ وہ گاڑی بان سے کہیں۔

”تو جس کی باتیں کر رہا ہے وہ تو میرا بیٹا ہے مجھے اس سے کیا خوف ہو سکتا ہے۔“ مگر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس شخص کو یہ بتائے بغیر اندھیرے میں رکھ کر ہی بات کی جائے تو بہتر ہوگا۔ پتا تو چلے دوسرے گاؤں والے جگا کو کیا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

”میرے پاس کوئی مال وال نہیں ہے بھائی۔ مجھ جیسے کسان آدمی کو جگا کا ڈر کیوں ہوگا۔ وہ غریبوں کو تنگ تھوڑی کرتا ہے۔“

گاڑی بان کو سوہن سنگھ کا جواب سن کر کچھ مزہ آیا اور وہ سمجھ گیا کہ بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ بولا۔

”ہاں یہ ہوئی نا بات، اچھا یہ بتائیے آپ نے تو جگا کو دیکھا ہی ہوگا۔ دیکھنے میں کیسا ہے؟ سنتے ہیں ابھی صرف بیس بائیس سال کا ہی لڑکا ہے۔“ سوہن سنگھ کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کوئی ان کے بیٹے کی باتیں ان سے کر تو رہا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ جس کی باتیں کی جا رہی ہیں وہ انہی کا بیٹا ہے۔ جگت کے بارے میں گاڑی بان کے تجسس اور بے چینی کو دیکھ کر سوہن سنگھ کا دل خوشی سے جھوم سا گیا اور فرط محبت سے ان کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹے کی شکل آ گئی تھی۔ وہ فرط جذبات میں بولے۔

”ہاں، بیس اکیس سال کا ہی ہے۔ لیکن دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے کم از کم پچیس سال کا ہوگا۔ ہلکی ہلکی مونچھ داڑھی ہے۔ آنکھیں میری آنکھوں سے بھی چھوٹی، ناک ذرا چپٹی، پتلے پتلے ہونٹ، گٹھیلا کسرتی جسم بس یوں سمجھو کہ پہلی نظر دیکھنے سے پنجاب کے دیہات کا کوئی گھریلو قسم کا جوان لگتا ہے۔ ڈاکو ہر گز نہیں لگتا۔ اسے ایک مرتبہ دیکھ لو گے تو پھر کبھی اس کی صورت بھلا نہیں سکو گے۔“ سوہن سنگھ جس روانی اور جس جذباتی لہجے میں جگت کی باتیں کر رہے تھے اس نے گاڑی بان کو گم صم کر دیا وہ گاڑی کو راستے ہی میں چھوڑ کر خود مڑ کر سوہن سنگھ کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔

سوہن سنگھ کی نظروں کے سامنے بیٹے کی شکل آ گئی تھی اور وہ فرط جذبات سے بولے جا رہے تھے۔ انہوں نے جگت کا حلیہ جس طرح بیان کیا تھا اس نے گاڑی بان کو بالکل گم صم کر دیا۔ اب بھی بار بار اس کے کانوں میں سوہن سنگھ کے یہی لفظ گونج رہے تھے۔

”ایک نظر دیکھنے سے پنجاب کے دیہات کا کوئی گھریلو جوان لگتا ہے ڈاکو ہر گز نہیں لگتا۔“

گاڑی بان نے جب دیکھا کہ اب سوہن سنگھ خاموش ہو گئے ہیں تو کچھ اور باتیں سننے کے اشتیاق میں اس نے جگت کی باتیں شروع کر دیں بولا۔

”ڈاکو ہے تو کیا ہوا؟ اس کے خاندانی ہونے پر شبہ تھوڑی کیا جا سکتا ہے۔ ارے لوگ تو اس کی بڑائی اور شرافت کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔“

گاڑی بان کی یہ بات سن کر سوہن سنگھ کا سینہ فخر سے پھول گیا اور وہ سب کچھ بھول کر اسی کھوئے ہوئے انداز میں جیسے جگت سے مخاطب ہو کر بولے۔

”شاباش بیٹے، تو نے خاندان کا نام نیچا نہیں ہونے دیا۔ جب تیری ماں یہ سنے گی تو اس کا غصہ بھی رفع ہو جائے گا۔“

گاڑی بان نے سوہن سنگھ کو اس طرح آپ ہی آپ باتیں کرتے سنا تو چونکا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ سوچ رہا تھا کہ آخر سوہن سنگھ نے اس وقت یہ کیا کہا ہے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ سوہن سنگھ جاگتی آنکھوں جو خواب دیکھ رہے تھے اس سے چونکے اور دوسرے ہی لمحے گاڑی بان کو اپنی طرف اس طرح گھورتے دیکھ کر سمجھ گئے کہ جس بات کو وہ چھپانا چاہتے تھے وہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل چکی ہے۔ گاڑی بان نے سوہن سنگھ کو اپنی طرف متوجہ پایا تو پوچھا۔

”تو کیا آپ جگا کے رشتہ دار ہیں مہاراج۔“

اب بات چھپانا فضول تھا۔ سوہن سنگھ کو کہنا ہی پڑا۔

”ہاں، میں نے تم سے یہ بات اب تک جان بوجھ کر چھپائی تھی جگت میرا سگا بیٹا ہے۔“

گاڑی بان نے یہ سنا تو حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اچھل پڑا۔

”آپ جگا کے باپو ہیں؟ یہ تو میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسا آدمی میری گاڑی میں بیٹھا ہے۔ میں نے باتوں میں بڑی دیر لگا دی ابھی پہنچاتا ہوں آپ کو۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کو اور تیز دوڑایا۔ اسے اب خود ہی اپنے اس بات پر ہنسی آ رہی تھی جو اس نے چند لمحے پہلے سوہن سنگھ سے کہی تھی۔

”کیا آپ کے پاس کچھ مال پانی ہے جو جگا کا نام سن کر آپ فکر میں پڑ گئے ہیں۔“

رتیا کے قریب پہنچ کر گاڑی بان نے کہا۔

”مہاراج، میری باتوں کا برا نہ مانیے گا آپ کو پہچانتا نہیں تھا اس لیے جو جی میں آئی بکتا چلا گیا۔“

اس کے بعد گاڑی بان نے بہت اصرار کیا کہ وہ سوہن سنگھ کو گھر تک پہنچا دے لیکن سوہن سنگھ یہ کہہ کر گاڑی سے اتر گئے۔

”نہیں بھائی تم نے پہلے ہی کافی تکلیف کی ہے اگر گھر تک چھوڑنے چلے گئے تو پولیس کی نظروں میں آ جاؤ گے اور پھر وہ تمہیں بلاوجہ تنگ کریں گے۔“ یہ کہہ کر سوہن سنگھ نے جیب سے اٹھنی نکالی اور گاڑی بان کو تھماتے ہوئے بولے۔

”یہ یہاں تک لانے کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ اس کی مٹھائی لے کر بچوں کو کھلا دینا۔“

سوہن سنگھ گاڑی سے اتر گئے اور گاڑی بان جاتے ہوئے مڑ مڑ کر عقیدت اور احترام کی نظروں سے سوہن سنگھ کو دیکھتا رہا۔



قرب و جوار کے علاقے میں جگا کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اس کا نام سنتے ہی ظالم زمیندار، سود خور اور اجارہ داروں کے دل کانپ جاتے۔ ایسے لوگوں نے نقدی اور زیورات گھر میں رکھنے ہی چھوڑ دیے۔ غریبوں کو تنگ کرنے والے کنجوس مالدار اب نرم

پڑنے لگے تھے۔ قرض اور سود کے مارے ہوئے کسانوں کی زمین چھینتے ہوئے زمینداروں کو اب سوچنا پڑتا کہ اگر جگا کو اس بات کا علم ہوگیا تو نا صرف یہ کہ وہ کسان کو زمین واپس کرادے گا بلکہ ہماری دولت بھی لوٹ لے جائے گا۔ جن باتوں سے مالدار ڈرتے تھے انہی کی وجہ سے غریب لوگ جگا کی عزت کرتے تھے۔ اسی خلوص کی بنا پر لوگ ہمیشہ اسے جگت سنگھ جگا کے مکمل نام سے یاد کرتے۔ وہ کہتے کہ اب تک ہمارے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی تو کورٹ کچہری میں برسوں کے بعد کہیں شنوائی ہوتی لیکن اب تو جگا کو خبر ہوئی اور چند ہی دنوں میں فیصلہ ہوجاتا ہے۔

کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں جگا اور اس کے ساتھیوں کو آسرا دینے والے نہ ہوں۔ جس رات وہ کسی گاؤں میں آتا' سناٹا سا چھا جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ جگا کہاں چھپا ہے۔ لوگ کہتے۔

"جب جگا ہمارے گاؤں میں ہو تو اسے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ گاؤں کی عزت جائے گی۔"

ویسے اب چند جعل ساز بھی جگا کے نام سے فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ کبھی کبھی جگا کے نام پر چھوٹی موٹی چوریاں بھی ہوجاتیں۔ دو چار دفعہ تو جگت نے اس قسم کی وارداتوں پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ ان واقعات کی وجہ سے اس کا نام بدنام ہو رہا ہے چنانچہ ایک دفعہ اپنے نام سے واردات کرنے والے گروہ کو پکڑ کر ایسی عبرتناک سزا دی کہ زمین کانپ گئی۔

جگت کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے کئی پیشکشیں بھی ہوئیں۔ جگت پیش کش کرنے والے کو بلاتا اور اس کو کسوٹی پر پرکھتا۔ اگر آدمی مناسب اور معقول معلوم ہوتا تو وہ کہتا۔

"پہلے تو چھ مہینے ہمارے لیے اطلاعات پہنچانے کا کام کرو۔ قرب و جوار کے گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے کے لائق مقامات کے پتے بتاتے رہو اور پولیس پر نگاہ رکھ کر ہمیں رپورٹ دو اگر اس کسوٹی میں کامیاب ہوئے تو ہم تمہیں اپنے گروہ میں شامل کرلیں گے۔"

اس نے اس قسم کے پندرہ آدمی شیخوپورہ میں ہر جگہ متعین کر رکھے تھے جو آگے چل کر اس کے گروہ میں شامل ہونے کے خواہش مند تھے۔

جگت ہر اقدام بڑی ہوشیاری سے کرتا۔ وہ ان لوگوں پر بھروسہ کرنے سے پہلے ان کی ایمانداری کو پوری طرح پرکھ لیتا۔ جگت کو علم تھا کہ ڈاکو بننے والے لوگ تھوڑی سی کامیابی کے بعد ہی بہک جاتے ہیں اور ان میں بے پروائی آجاتی ہے۔ اس وجہ سے ان کا انجام خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے غلط اطلاع دینے والے پر جگت ذرہ برابر رحم نہ کرتا۔

نئے کارتوس' ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدنے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔ جگت کو اندازہ تھا کہ جب بھی پولیس سے مڈبھیڑ ہوئی کارتوس اور ہتھیار بڑی تعداد میں درکار ہوں گے۔ چند پستولوں کی بھی ضرورت تھی کیونکہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے نشانہ بازی کرنے کے لیے رائفل سے پستول زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ تین چار ہزار روپے کی فوری ضرورت تھی۔

انہی دنوں اسے اطلاع ملی کہ مادھو پور کے ایک کنجوس سکھ کے گھر سے کافی مال مل سکتا ہے۔ جگت نے اچانک اس کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ہنومان کو بھیجا گیا لیکن سکھ سے ملاقات نہ ہوسکی چنانچہ بغیر اطلاع کے ڈاکہ ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ پانچ گھڑ سوار اس سکھ کے گھر کے پاس گھوڑوں سے اترے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا تو ہنومان نے روٹی کا ٹکڑا پھینک کر اسے خاموش کردیا۔ جگت

نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اندر سے کوئی جواب نہ آیا جگت نے دھیمے سے کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

پھر بھی جواب نہ آیا اتنی دیر میں بچن نے گھر کے آس پاس گھوم کر جائزہ لے لیا۔ اس نے جگت سے کہا۔

"اگر وہ واقعی بڑا کنجوس ہے تو اس وقت دروازہ کھولنے کا خطرہ کبھی مول نہ لے گا۔ میرا خیال ہے ہم دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جائیں۔"

ہنومان نے اپنے گھوڑے کو دیوار کے پاس کھڑا کیا۔ بچن اس پر چڑھ کر اور دیوار پھلانگ کر گھر میں کود گیا۔ اس کے باوجود گھر میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ بچن نے دیکھا تو دروازے میں اندر سے بھی تالا لگا ہوا تھا۔ اتنی ہی دیر میں ہنومان بھی گھر میں داخل ہوچکا تھا۔ اس نے بیٹری کی روشنی ڈال کر دیکھا تو لوہے کی ایک سلاخ نظر آئی۔ دونوں نے مل کر اس سلاخ کی مدد سے دروازے کی کنڈی توڑی۔ اس کے بعد ان کے تینوں ساتھی بھی گھوڑوں سمیت اندر آگئے۔ دروازے پھر بند کردیے گئے سب بندوقیں ہاتھ میں لے کر چھت پر چڑھ گئے مگر وہاں بھی جالی والا دروازہ بند تھا۔ جگت کو بہت غصہ آیا اور اس نے جالی سے بیٹری کی روشنی اندر پھینکی۔ ایک چھوٹے بچے کی چیخ سنائی دی جگت نے ڈانٹا۔

"خاموشی سے دروازے کھول دو ورنہ خیریت نہ ہوگی۔ سب کو مار ڈالوں گا۔"

لیکن دھمکی کا کوئی جواب نہ آیا۔ جگت نے زور سے دروازے کو دھکا مارا۔ دوسرا اور تیسرا دھکا لگنے سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ پانچوں ساتھی اندر داخل ہوئے۔ دیکھا تو ایک بوڑھا' ایک بڑھیا اور تقریباً سات سال کا بچہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے کانپ رہے ہیں۔ جگت کو اس وقت اتنا غصہ تھا کہ یہاں اگر کوئی جوان ہوتا تو اس کا بھرکس نکال دیتا لیکن بوڑھے اور بچے کو دیکھ کر وہ غصہ پی گیا اس نے بوڑھے کو بندوق دکھاتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ ہے نکالو۔"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ اتنی شدت سے کانپ رہے تھے کہ کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا جب جگت نے بندوق کی نالی اس کے شانے پر چبھوئی تو بولا۔

"گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

بڑھیا بچے کے منہ کو ہاتھ سے دبائے بیٹھی تھی۔ بچہ خوفزدہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نقاب پوش ڈاکوؤں کو تک رہا تھا۔ جگت نے بڑھیا کو دھمکایا۔

"بڑھیا' ہمیں پتا ہے کہ اس گھر میں کافی مال ہے۔ بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو ورنہ......!"

اب بچے نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا منہ بڑھیا کے ہاتھ سے بند تھا۔

اتنی دیر میں بچن اور ہنومان برابر کے کمرے میں گھوم آئے لیکن کچھ نظر نہ آیا کرپال اور ہشیار مکان کے پچھلے حصہ کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔ بوڑھا بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

"گھر میں کچھ نہیں کیوں ہم غریبوں کو تنگ کرتے ہو؟"

اب جگت کا پارہ پھر تیزی سے چڑھنے لگا۔ اس نے بوڑھے کی پسلی میں ایک گھونسا جمایا اور بولا۔

"جھوٹے غریب بننے چلا ہے اگر مجھے اطلاع دینے والا جھوٹا ہے تو میں اس کی زبان کاٹ لوں گا لیکن اس سے پہلے میں تجھے ضرور سبق سکھاؤں گا کنجوس کہیں کے۔" پھر اس نے ہنومان کو مخاطب کیا۔

"ہنومان ایک رسہ لے آؤ۔" اور بوڑھے کو اٹھا کر برابر پڑی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔

''اگر تم تینوں میں سے کسی نے آواز نکالی تو ہماری بندوقیں بھی چیخ اٹھیں گی۔'' اس نے تنبیہ کی۔

ہنومان اور بچن نے بوڑھے کو چارپائی کے ساتھ کس کر باندھ دیا۔ بڑھیا سسکتی ہوئی اس منظر کو دیکھتی رہی۔ اب بچہ بھی رونے لگا تھا۔

''ہنومان' چارپائی کے نیچے آگ جلا دے۔ دیکھتا ہوں بوڑھا کب تک سچ نہیں بولتا۔'' جگت نے حکم دیا۔

ہنومان نے کھونٹی پر سے بوڑھے کا صافہ اتارا اور چارپائی کے نیچے رکھا۔ پھر جلتی ہوئی لالٹین سے اس پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ فوراً ہی شعلے اٹھنے لگے اور بوڑھے کی پیٹھ جلنے لگی وہ تکلیف سے کراہنے لگا لیکن پھر بھی اس نے وہ بات نہ کہی جو جگت سننا چاہتا تھا۔

اب جگت اور خوفناک ہو کر چلایا۔

''بڈھے اب بھی بتا دے مال کہاں ہے؟ ورنہ اسی طرح زندہ جلا کر مار ڈالوں گا۔''

اب بڑھیا سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا۔

''اب بتا دو نا۔''

جگت کو یہی چاہیے تھا اس نے ہنومان کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً بوٹ سے آگ بجھا دی۔ لیکن بڈھا اب بھی یہی کہہ رہا تھا۔

''تم چاہے مجھے مار ہی ڈالو لیکن اس گھر سے کچھ نہیں ملے گا۔''

جگت نے کمر سے خنجر نکالا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بوڑھا جان دے دے گا لیکن مال نہیں دے گا۔ اس کی نگاہ بچے پر پڑی اس نے سوچا کہ کسی ترکیب کے بغیر بڈھا نہیں مانے گا۔ اس نے بچے کو گردن پکڑ کر اٹھا لیا اور ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر خنجر والا ہاتھ اونچا کیا۔ بڑھیا کی چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ ہنومان نے اس کا منہ دبا دیا۔ جگت نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''اگر تو چاہتا ہے کہ اس معصوم کی جان میرے ہاتھ سے نہ جائے تو بتا دے مال کہاں ہے؟'' پھر اس نے ہاتھ کو ایسے جھٹکا دیا جیسے وہ واقعی بچے کو خنجر مار دے گا۔ یہ دیکھ کر بڈھے نے کہا۔

''اس معصوم کو مت مارنا میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو دیکھ کر اب ہنومان اور بچن کو اس پر رحم سا آنے لگا تھا۔ بوڑھے نے بتا دیا کہ سارا مال و متاع اس نے ایک دیوار میں چن رکھا ہے۔

مال نکالنے کے لیے دیوار میں کئی شگاف کرنے پڑے تو دیوار سے زیورات کی ایک اور نقدی کی دو پوٹلیاں برآمد ہوئیں۔ بڈھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مال ڈاکوؤں کے حوالے کیا اور چکرا کر بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔

''میں نیچے جا کر معلوم کرتا ہوں کہ راستہ صاف ہے کہ نہیں۔ اس وقت تک تم بڑھیا اور لڑکے کے منہ بند رکھو۔ جب میں سیٹی بجاؤں تو ان کو کمرے میں بند کر کے نیچے آ جانا۔'' آہستہ قدموں سے جگت سیڑھیاں اترنے لگا۔ رات کے ساتھ ساتھ چاند کی روشنی بھی اب بڑھ گئی تھی۔ اس سے جگت نے بھی اندازہ لگایا کہ وقت کافی گزر چکا ہے۔ اس لیے جلدی کرنے کی ضرورت ہے سورج نکلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا ہے۔ یعنی یہاں سے دس بارہ میل دور جانا تھا۔ آس پاس نگاہ گھماتے ہوئے وہ آخری سیڑھی پر تھا کہ اس نے کسی کو کہتے سنا۔

''ویر جی۔''

یہ لفظ سن کر جگت چونک گیا۔ سنسان رات میں اس دھیمی' میٹھی اور نرم آواز نے جیسے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ آواز چونکہ عورت کی تھی اس لیے وہ حیران بھی ہوا لیکن عادت کے مطابق اس کی انگلی پھر بھی بندوق کی لبلبی پر آ گئی۔

''کون ہے؟'' اس نے آہستہ سے لیکن مستحکم آواز میں دریافت کیا۔

سیڑھی کے نیچے سے ایک نوجوان لڑکی سامنے آئی۔ اس کی بادام سی آنکھوں سے معصومیت اور بے خوفی ٹپک رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جس میں طرح طرح کی مٹھائیاں رکھی تھیں۔ جگت اس کی اس ادا کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لڑکی نے کہا۔

''ویر جی جانے سے پہلے منہ میٹھا کرتے جاؤ۔''

ڈاکو بننے کے بعد آج پہلی بار کسی عورت نے اسے ''بھائی'' کہہ کر پکارا تھا۔ یہ سن کر جگت کا پتھر سا دل پھول بن گیا۔ اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان سا اٹھا۔ لڑکی نے جب ہاتھ بڑھا کر تھالی اس کی جانب بڑھائی تو جگت کا ہاتھ خود بخود اٹھا اور اس نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ وہ کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اس کی نگاہ لڑکی کے مہندی لگے ہاتھوں پر پڑی۔ جگت نے چونک کر کہا۔

''بہن' کیا شادی ہونے والی ہے؟''

لڑکی نے آہستہ سے سر ہلا کر آنکھیں جھکا لیں۔

''اوپر جو بوڑھا اور بڑھیا ہیں وہ تمہارے ماں باپ ہیں کیا؟''

لڑکی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ میرے دادا اور دادی ہیں میرے باپو کا دو سال پہلے ہیضے سے انتقال ہو گیا تھا۔ ماں اس کے بعد پاگل ہو گئی اور گئے سال وہ بھی ایک کنوئیں کود پڑی۔ پھر پتا نہیں چلا۔'' یہ کہتے ہوئے لڑکی کا گلا ضرور رندھ گیا لیکن پھر بھی اس نے آنکھوں کو بھیگنے نہیں دیا۔

''اوپر جو زیورات اور روپیہ ہے کیا وہ تیری شادی کے لیے۔'' جگت اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ لڑکی نے کہا۔ ''ہاں مجھے سب بدنصیب کہنے لگے تھے اس لیے میری شادی کے لیے زیادہ جہیز کی ضرورت تھی۔''

جگت نے بندوق کندھے پر چڑھا لی اور دایاں ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھا۔ ''تو نے جگت کو بھائی کہا ہے نا اب جگت بھی اس ناتے کو پوری طرح نبھائے گا۔ آ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے پھر اوپر لوٹ گیا۔ جگت کو فوراً واپس آتا دیکھ کر اس کے ساتھی حیران رہ گئے۔ ہنومان بولا۔

''کیوں' کیا ہوا؟ کیا کوئی خطرہ ہے؟''

جواب میں جگت کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ دیکھ کر ان کو اور تعجب ہوا۔

''ان دونوں کے منہ کھول دو۔'' جگت بولا۔ ''بڈھے کے منہ پر پانی ڈال کر اسے جلدی ہوش میں لاؤ۔''

''جگت کو کیا ہو گیا ہے؟'' سب کے دل میں یہ سوال جاگا ضرور لیکن کسی نے پوچھا نہیں بس سب نے حیرت سے اسے گھورا۔

''یہ بڈھا جواب جو نہیں دے رہا تھا اس کا سبب اس کی کنجوسی نہیں تھی بلکہ گھر میں تین دن بعد ہونے والی شادی تھی۔'' جگت نے کہا۔ اتنے میں سب نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہاتھ میں مٹھائی کی تھالی لے کر اندر داخل ہوئی۔ جگت کے چاروں ساتھیوں نے اسے دیکھا۔ جگت نے کہا۔

''دوستو اس نے مجھے بھائی کہا ہے۔ اب ہم اس گھر کی کسی چیز کو نہیں چھو سکتے۔ ہنومان! سارا مال واپس کر دے۔''

بچہ دوڑ کر لڑکی سے لپٹ گیا۔ بڑھیا' بڈھے کو جھنجوڑنے لگی۔

''ارے دیکھو یہ لوگ سب مال واپس کر رہے ہیں۔ کلدیپ کو جگا نے بہن بنا لیا ہے۔''

بڈھے نے آنکھیں کھولیں تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کیا وہ سپنا تھا جو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا یا اب سپنا دیکھ رہا ہے؟ موت ایسا کھور

انسان ایک انجان لڑکی کو بہن بنانے پر کیسے آمادہ ہوگیا؟ بوڑھے کی طرح اس بات پر جگت کے ساتھی بھی حیران تھے۔ جگت نے کلدیپ کے ہاتھ سے تھالی لے کر مٹھائی ایک کپڑے میں ڈال لی اور بولا۔

"یہ میری بہن کی شادی کی مٹھائی ہے چلو اب ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر جگت تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی بقیہ ساتھی بھی چلے گئے۔

پانچوں گھڑسوار جب تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئے کلدیپ سیڑھی پر کھڑی ان کو تکتی رہی۔ جگت کے صافے کا اونچا شملہ چاند کی روشنی میں بڑا بھلا معلوم ہورہا تھا پھر نجانے کیوں کلدیپ کی آنکھوں میں آپ ہی آپ آنسو بھر آئے۔

لیکن اس سے زیادہ رونا تو اسے اس وقت آیا جب اس کی شادی ہورہی تھی اور ایک آدمی نے آ کر اس کے دادا کے کان میں کچھ کہا دادا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ تیز قدموں سے شامیانے سے باہر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا کھولا تو اس میں پانچ سو روپے نقد اور پانچ جوڑے تھے۔ دادا نے خوش ہو کر بکس کلدیپ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی یہ تیرے بھائی نے جہیز کے لیے بھجوائے ہیں۔"

دلہا والے بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے لیکن دادا کی بات اب بھی ادھوری تھی۔ اس نے پھر کہا۔

"باہر پانچ بھینسیں اور پانچ گھوڑے بھی کھڑے ہیں۔ وہ بھی اسی نے تیرے لیے بھیجے ہیں۔" کلدیپ نے آنسو بھری آنکھ سے اس بھائی کو دل سے دعا دی جسے اس نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔

جب بات گاؤں میں پھیلی تو لوگ حیران ہو کر سوچنے لگے۔

"کیا واقعی جگا ڈاکو ہے؟"



ادھر گاڑی بان کو رخصت کر کے سوہن سنگھ گھر پہنچے تو شوہر کو آتا دیکھ کر جگت کی ماں ڈوبتے دل اور ڈولتے قدموں سے اٹھی اور ہاتھ منہ دھونے کے لیے پانی کا لوٹا قریب رکھ دیا۔ سوہن سنگھ نے صافہ اور کرتا اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیے۔ وہ پوٹلی اس وقت بھی ان کے پاس ہی تھی جو وہ سمدھیانے میں لوٹانے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب جگت کی ماں کی نظر اس پوٹلی پر پڑے گی تو ضرور چونکے گی اور پھر اس کے پوچھنے پر آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ مگر اس غم نصیب نے آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہ دیکھا۔

جگت کی ماں کی کیفیت عادات و اطوار تو اسی دن سے بدل گئے تھے جس دن اس نے جگا کے ڈاکو بننے کی خبر سنی تھی۔ خبر سنتے ہی اس کے رگ و پے میں دوڑتے ہوئے لہو کی رفتار یکایک تیز ہوگئی تھی جس خدشے سے وہ آج تک گھبراتی رہی تھی اب جگت خود اس سے دوچار ہوگیا تھا۔ وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ نجانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر وہ بالکل گم سی ہوگئی۔ اس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ جانتی تھی اپنی چوکھٹ پار کرتے ہی اسے ہر طرف سے بیٹے کے ہاتھوں ہونے والی وارداتوں ہی کی باتیں سننے کو ملیں گی۔

سوہن سنگھ ہاتھ منہ دھوتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اب بیوی سے بات کس طرح شروع کرنی چاہیے کیونکہ پہلے تو شاید اسے اس خبر پر یقین ہی نہ آئے اور اگر آ گیا تو جانے اپنے ہوش و حواس بھی برقرار رکھ سکے گی یا نہیں؟ یہی باتیں سوچتے ہوئے وہ ہاتھ منہ دھو کر اٹھے اور انگڑائی لیتے ہوئے بولے۔

"بشن سنگھ نے بہت کھلا دیا۔ اب تک طبیعت

بھاری بھاری ہورہی ہے۔"

جگت کی ماں نے میاں کی بات سنی تو سمجھی کہ سوہن سنگھ کے جانے کے بعد چندن کور کی بات کہیں اور طے کردی گئی ہوگی اور اسی خوشی میں بشن نے دعوت کا انتظام کیا ہوگا۔ یہی سوچ کر اس نے شوہر سے پوچھا۔

"جلدی ہی کہیں اور ٹھکانا لگ گیا تھا چندن کو۔ یہی تو میں بھی کہتی تھی کہ اس لڑکی کو بہو بنا کے لے جانے میں کون دیر کرے گا؟" مگر اس کے بعد وہ کچھ نہ بول سکی۔ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سوہن سنگھ نے ایک نظر بیوی پر ڈالی اور اٹھ کر پوٹلی اٹھا کر جگت کی ماں کی گود میں ڈال دی۔ پوٹلی دیکھتے ہی جگت کی ماں چونک اٹھی اور پھر اسی طرح اپنی بھیگی بھیگی افسردہ آنکھیں اٹھائیں اور شوہر کو دیکھا۔ سوہن سنگھ کو بیوی کی آنکھیں بولتی ہوئی نظر آئیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"میں جانتی ہوں گھر میں بہو لانے کے شوق میں تم نے میری بات نہ مانی اور آخر کو وہاں سے شگون کی ساری چیزیں واپس لے ہی آئے۔ یہ نہ سوچا کہ اس گھر میں آنے والی لڑکی اب سہاگن کم اور ابھاگن زیادہ ہوگی۔"

سوہن سنگھ بیوی کی نظروں میں نظریں گاڑے گاڑے بولے۔

"چندن کور بھی تم ہی جیسی ضدی نکلی۔ شگون لوٹا دیے۔"

"لوٹا دیے۔"

"ہاں اس نے میرے اور بشن دونوں ہی کے سامنے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بہو بن کر آئے گی تو صرف ہمارے گھر میں۔ چاہے اسے یہاں سہاگن بن کر زندگی گزارنی پڑے یا ودھوا بن کر۔"

یہ سن کر جگت کی ماں کے دل میں طوفان سا اٹھ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ خبر سن کر ہنسے یا روئے۔ فرط محبت سے اس نے شگون کی پوٹلی کو آنکھوں سے لگا لیا اور پیار بھرے لہجے میں خود ہی خود بولی۔

"بیٹی شاباش ہے تجھے جنم دینے والی، لیکن پھر بھی تجھے اتنی جلد اتنا بڑا جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا تو کیا جانے ودھوا کی زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھ لے جیسے ہر روز کوئی سولی پر چڑھے۔"

بیوی کی یہ جذباتی باتیں سن کر اب سوہن سنگھ نے اسے ٹوکا۔

"تم تو ہر بات کو ہمیشہ غلط انداز پر پہلے سوچنے لگتی ہو۔ ہر بات پر انسان کا بس نہیں چل سکتا۔ اگر چندن کے نصیب میں اس گھر کی بہو بننا لکھا ہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ میں نے تو اس کی ہمت دیکھ کر چلتے ہوئے سدا سہاگن رہنے کی دعا دی ہے۔ تم بھی اسے یہی دعا دو اور باقی سب کام بھگوان پر چھوڑ دو۔"

جگت کی ماں کی سمجھ میں بھی بات آ چکی تھی۔ اس نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے جب چندن اتنی ہمت کا مظاہرہ کر رہی ہے تو میں کیوں دل چھوٹا کروں؟ یہ سوچ کر اس نے شوہر سے کہا۔

"پھر اب جگت تک اطلاع کیسے بھجوائی جائے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا، کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ جگت ہماری خیریت معلوم کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو بھیجے گا ضرور۔ ایک دو دن اور دیکھتے ہیں پھر تمہارے باپو کے پاس دھرم پور جا کر ساری بات بتا دوں گا مجھے امید ہے وہ ضرور کوئی راستہ ڈھونڈ لیں گے چلو اٹھو اس وقت ان باتوں کو بھول کر خوشی خوشی جا کر جلدی سے کوئی میٹھی چیز بنا کر کھلا دو۔"



دوسرے روز سوہن سنگھ کے گھر کے پاس ایک بیل گاڑی خراب ہوگئی۔ اس کے ایک پہیے میں شاید کچھ ایسی خرابی ہوگئی تھی کہ اسے بیل گاڑی سے نکال کر ٹھیک کرانا ضروری ہوگیا تھا۔ گاڑی میں مرد کے

ساتھ ایک برقع پوش عورت بھی تھی۔ انہیں یہاں سے پانچ چھ میل اور آگے جانا تھا۔ مرد نے بیل گاڑی سے عورت کو اتار کر پہیہ الگ کیا اور اس شخص سے جو بڑی دیر سے وہیں آس پاس گھوم رہا تھا پوچھا۔

"کیوں بھائی یہاں قریب میں کوئی لوہار ہوگا؟"

اس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں بائیں ہاتھ کی گلی میں ایک لوہار کی دکان ہے۔"

مرد یہ سن کر اس طرف جانے لگا پھر کچھ خیال آتے ہی فوراً مڑا اور بولا۔

"اتنی دیر کے لیے میری بیوی کو یہاں کہیں آسرا مل جائے گا کیا؟" پھر سوہن سنگھ کے گھر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اس گھر کے دروازے پر میں نے ابھی ایک بڑھیا کو دیکھا تھا۔ وہ دروازہ بند کر رہی تھی اگر آدمی اچھے ہوں تو اپنی بیوی کو وہاں چھوڑ دوں۔"

یہ بات سن کر وہی شخص مسکرا کر بڑے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"میاں جی اس گھر میں تو سارے ہی اچھے لوگ ہیں آدھ پونے گھنٹے میں تمہاری بیوی کو کوئی اغوا نہیں کرلے گا۔ پہنچا دو اندر۔"

بیل گاڑی والے آدمی نے یہ بات سن کر سوہن سنگھ کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ دروازہ جگت کی ماں نے کھولا اس آدمی نے کہا۔

"ماں جی میری بیل گاڑی کا پہیہ خراب ہوگیا ہے اسے ٹھیک کرانے جا رہا ہوں اتنی دیر تک میری بیوی کو اگر آپ کے گھر سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو احسان مانوں گا۔"

جگت کی ماں نے اجنبی کی بات سنتے ہی پورا دروازہ کھول دیا اور بولی۔ "احسان کی کیا بات ہے بھائی اسے اندر بھیج دو۔ اتنی تیز دھوپ میں تو وہ بے چاری برقعے میں اور پریشان ہوگئی ہوگی۔"

برقعہ والی گھر آ گئی۔

سوہن سنگھ برقعے والی کو گھر میں دیکھ کر پردے کے خیال سے باہر جانے لگے تو عورت نے آگے بڑھ کر ان کا راستا روک لیا۔ سوہن سنگھ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے جگت کی ماں بھی حیران ہوگئی لیکن اسی لمحے عورت نے برقعہ کا نقاب الٹ دیا۔

جگت کی ماں اور باپ حیران رہ گئے۔ برقعے میں بڑی بڑی مونچھوں والا ہنومان تھا۔ ہنومان کو اس حالت اور حلیے میں دیکھ کر جگت کی ماں اور باپ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک سکے۔ سوہن سنگھ نے فوراً جا کر دروازے کو کنڈی لگا دی اور تینوں اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ اندر پہنچتے ہی ماں نے کہا۔

"ہنومان بیٹے پہلے یہ بتا میرا جگت کیسا ہے؟"

"ارے ماں جی، میرے یار نے چند ہی دنوں میں جو نام اور عزت پیدا کی ہے وہ سارا پنجاب کبھی نہ بھلا سکے گا۔ وہ جہاں جاتا ہے لوگ اس کا مہمانوں کی طرح استقبال کرتے ہیں۔ مقابلہ پڑا نے والا اس کی ایک بڑھک سن کر ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ گولی چلانے کی تو نوبت ہی نہیں آتی اور پھر غریب تو اسے اپنا بیلی اور رکھوالا سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب کسی غریب کی بیٹی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے کنواری نہیں بیٹھی رہتی۔ جہیز کا انتظام جگا کرتا ہے۔"

ہنومان کی باتیں سن کر ماں جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے ہمیشہ بیٹے کو برا بھلا ہی کہا تھا لیکن بیٹے نے ڈاکو بننے کے بعد بھی خاندانی شرافت نہ چھوڑی۔ وہ ایسی ہی بہت سی باتیں سوچ رہی تھی اور ان کے دل میں جگا کے لیے پیار کا ایک طوفان امڈ رہا تھا کہ ہنومان کی آواز سنائی دی۔ "مجھے جگت نے آپ ہی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہتا تھا کہ ماں کئی بار مجھے خواب میں نظر آئی ہے اور اپنے پاس بلاتی ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ ماں میں ایک بار آؤں گا اور بڑی فرصت سے آؤں گا۔"

ہنومان سے جگت کی یہ بات سن کر ماں جی کا دل بھر آیا۔ انہوں نے ہنومان کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "بیٹے جن آنکھوں سے تو روز جگت کو دیکھتا ہے مجھے بھی ان میں جھانک لینے دے۔ اسی طرح شاید سکون مل جائے اور ہاں اس سے کہہ دینا کہ یہاں آ کر جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے اور تو بھی دوبارہ اس طرح یہاں مت آنا۔ پولیس والوں کی آنکھیں ہر وقت اسی گھر پر لگی رہتی ہیں۔"

ماں نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ سوہن سنگھ تیزی سے بولے۔ "ارے بھاگوان ہنومان اس وقت تو بڑے موقع سے آ گیا ہے اسی کے ہاتھوں جگت کو پیغام بھجوا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر سوہن سنگھ نے چندن کور کے گھر جانے سے اب تک کی تمام تفصیلات ہنومان کے گوش گزار کر دیں۔ ہنومان بڑا خوش نظر آ رہا تھا سوہن سنگھ نے جیسے ہی بات ختم کی ماں جی نے کہا۔

"ہاں ہنومان جگت سے کہنا کہ اب وہی اپنی ماں کے قول کا پاس رکھنے والا ہے۔ بغیر وقت گنوائے جلد سے جلد چندن کو بیاہنے کے لیے آ جائے۔"

"بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں کوئی کہہ رہا تھا۔

"ارے ظالم تم نے ڈاکو کا گھر بتا دیا۔ مجھے تو ابھی لوہار نے کہا کہ یہ گھر جگا ڈاکو کا گھر ہے۔ میری بیوی کو اگر کہیں کسی نے بتایا ہوگا تو وہ تو ڈر کے مارے مر ہی گئی ہوگی۔" یہ آواز اس شخص کی تھی جو برقعہ پہنے ہوئے ہنومان کو گھر میں چھوڑ گیا تھا۔ آواز سن کر جگت کے ماں باپ اور ہنومان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنومان برقعہ اوڑھ کر جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ میرا میاں جو بن کر آیا ہے یہ بھی اپنا ساتھی ہے پولیس کا آدمی جو بار بار گھر کے چکر کاٹ رہا تھا اسے چکمہ دینے کے لیے ہم نے یہ ڈرامہ کر ڈالا۔ گاڑی کا پہیہ بھی خود جان بوجھ کر خراب کیا تھا یہ میرا میاں جو ہے قابل بھروسا آدمی ہے۔ کبھی آئے تو آپ لوگ اس پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں۔ اچھا اب میں جاتا ہوں، بلکہ جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر ہنومان نے خود ہی دروازہ کھولا باہر نکلتے ہی اس کے میاں نے پوچھا۔

"ارے تیرے گہنے وہنے تو سلامت ہیں نا، میرا بھی دماغ سٹھیا گیا تھا جو ڈاکو کے گھر میں خود تجھے پہنچا گیا تھا چل جلدی چل یہ جگا ڈاکو کا گھر ہے۔"

ہنومان یہ سنتے ہی تیز تیز زنانہ چال سے بیل گاڑی تک پہنچ کر اندر بیٹھ گیا اور اس کے میاں نے فوری گاڑی چلا دی۔ اس وقت جگت کے ماں باپ دونوں ہی اندر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ اب ان کے کانوں میں ہنومان اور اس کے میاں کی بیل گاڑی کی آواز گونج رہی تھی۔ مدتوں کے بعد آج دونوں کے چہروں پر خوشی کی گھٹائیں امڈی آ رہی تھیں۔

پولیس انسپکٹر سنہا کو بالآخر جگے کے لیے دو ہزار روپے کا انعام کا اعلان کرنا پڑا۔ اعلان کیا گیا کہ جو کوئی جگا کو زندہ یا مردہ گرفتار کرے گا یا اس کے بارے میں اطلاع دے گا اور اگر اس اطلاع کی بنا پر جگا پکڑا گیا تو اطلاع دینے والوں کو انعام دیا جائے گا۔

اعلان ہونے کے ساتھ ہر طرف اس خبر کا چرچا ہونے لگا۔ پچھلا زمانہ تھا۔ دو ہزار کی رقم بڑی رقم خیال کی جاتی تھی۔ جس کے پاس اتنی رقم ہوتی وہ ساہوکار

کہلاتا تھا۔ اس کے باوجود بھی اکثر لوگ انعام کی رقم پر ہنس کر کہتے۔

"ہوں، صرف دو ہزار روپے؟ دو ہزار روپے کی ضرورت ہو تو جگے کے بارے میں اطلاع کیوں دی جائے؟ خود جگا کے پاس جا کر اس سے دو ہزار کیوں نہ مانگ لیے جائیں۔ بھلا اس غریبوں کے بیلی نے کب کسی کی مدد کرنے سے انکار کیا ہے؟"

اور کوئی کہتا۔ "انگریز حکومت سے بغاوت کرنے والے مرد سے بے ایمانی کرنا نامردوں کا کام ہوگا۔ پولیس والے سرکاری روٹیاں کھا کر کافی تگڑے ہوئے ہیں۔ ذرا جگا کو تلاش کریں گے تو چربی کم ہوگی۔ کرنے دو تلاش دیکھیں گے کیسے گرفتار کرتے ہیں۔"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ کہیں ایک بڑھیا دوسری سے کہہ رہی تھی۔

"میرے باپ کے پاس دینے کو جہیز نہ تھا اس لیے میری شادی بوڑھے کھوسٹ سے کردی گئی تھی اور پھر میں بے وقت بیوہ ہوگئی اگر کہیں جوانی میں بھی جگا ہوتا تو ایسا کام کاہے کو ہوتا؟"

کچھ لوگ اس انعام کا اعلان سن کر شیخ چلی بن گئے تھے اور پہلے سے انعام کے خواب دیکھنے لگے تھے ان میں ہی سے ایک کیڑا منا سنگھ بھی تھا۔ اس نے تو جیسے طے کرلیا تھا کہ یہ دو ہزار روپے اب اسی کے ہو چکے ہیں۔ کیڑا منا کی عمر تقریباً چالیس سال تھی شادی کرنے کا بڑا ارمان تھا لیکن ہوئی نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جوانی میں چیچک کا مرض ہو جانے سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ رنگ پہلے آبنوسی تھا پھر ایک آنکھ بھی گئی اور چیچک نے شکل اور بگاڑ دی تھی۔ لوگ اندھیرے میں دیکھ لیتے تو ڈر جایا کرتے تھے۔ ایسے میں اسے لڑکی کون دیتا؟ لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر جیب میں دولت ہو تو شادی ہو سکتی ہے اس لیے اس نے سوچا کہ ایشور نے میری شادی کرانے کے لیے ہی شاید جگا کو ڈاکو بنایا ہے تاکہ پولیس انعام کا اعلان کرے۔

جس گاڑی والے نے سوہن سنگھ کو رتیا پہنچایا تھا اس سے کیڑے نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ سوہن سنگھ کس کے گھر گئے تھے۔ دوسرے دن وہ بھی بشن سنگھ کے گاؤں پہنچا اور جگا اور چندن کے تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسی گاؤں میں کیڑے کا دور کا رشتہ دار بھی رہتا تھا چنانچہ اس کا کام اور آسان ہوگیا۔ اس نے ساری داستان معلوم کرنے کے لیے وہیں رہ جانے کا فیصلہ کیا۔ رات کو جب وہ ایک آنکھ بند کرکے سو جاتا تو خواب میں بھی اسے دو ہزار روپے اور بیوی نظر آنے لگتے۔

اُدھر ہنومان جگت کے ماں باپ سے ملنے کے بعد جب واپس پہنچا تو جگت اور اس کے ساتھی جو گندر کے بتائے ہوئے مقام پر ڈاکہ ڈالنے کی تیاری کیے بیٹھے تھے۔ ہوا یوں کہ جب ہنومان کو پتا چلا تھا کہ جگت ماں باپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہے تو اس نے خود اصرار کیا تھا کہ وہ خود ان کی خبر معلوم کرنے کے لیے جائے گا۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی حمایت کی تھی اور کہا تھا کہ اس طرح ہمیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ کہیں پولیس ان کو تنگ تو نہیں کر رہی ہے؟ اس لیے ٹھیک یہی ہے کہ ہنومان کو بھیجا جائے۔

جگت خود اس لیے آنا کانی کر رہا تھا کہ پولیس کے سخت پہرے کو توڑ کر گاؤں اور گھر میں جانا خطرہ سے خالی نہ تھا اور جگت کے پکڑے جانے کا خدشہ تھا اور اس صورت میں پھر دوبارہ جگت کو زندہ دیکھنا شاید ناممکن تھا کیونکہ اس نے گروہ کے تمام ساتھیوں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو لڑتے لڑتے جان دے دے گا، زندہ گرفتار نہیں ہوگا۔

لیکن ہنومان کی واپسی میں دیر ہوئی تو جگت کو فکر ہونے لگی اور جب اطلاع مل گئی کہ وہ آ گیا ہے تب کہیں سکون ہوا۔

"ہنومان، تو نے زنانہ لباس میں مردوں والا کام کر کے دکھایا۔" جگت نے ہنس کر کہا۔

ہنومان یہ سن کر زور سے ہنسا۔ کرپال نے کہا۔ "بہت خوش ہے یار کوئی خوشخبری لایا ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں اب جگت ہم سب کو مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرے تو سنا دوں خبر۔" ہنومان بولا۔

مگر یہ سنتے ہی ہشیار سنگھ جلدی سے بولا۔ "اگر تم دو ہزار انعام کی بات کر رہے ہو تو ہمیں اس کی اطلاع مل چکی ہے۔"

ہنومان نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا۔

"نہیں یارو، میں سرکاری سسرال کی دو ہزار کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو جگت کی اصلی سسرال کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا بک رہا ہے ہنومان؟" جگت نے چونک کر کہا۔ سارے ساتھی بھی حیرت میں پڑ گئے۔ ان کو جگت کی منگنی کا اب تک کوئی علم نہ تھا۔ سب کے سب جگت کا منہ تک رہے تھے۔

آخر ہنومان نے کہا۔ "جگت تیرے بابو بشن سنگھ کے ہاں شگون واپس کرنے گئے تھے لیکن بھابی چندن کور نے یہ قبول نہیں کیا اور صاف کہہ دیا کہ اگر میں شادی کروں گی تو صرف جگت سے۔"

"کیا...... چندن کور نے یہ کہا......!" جگت کی نظروں میں بچپن کی دوست چندن کی شکل گھوم گئی۔ اس نے سوچا بچپن میں تو بہت کم گو اور سعادت مند تھی اب اس میں اتنی تبدیلی کیسے آ گئی کہ اس نے بزرگوں کے سامنے یہ بات کہہ دی؟ کیونکہ جگت تو سوچ چکا تھا کہ ڈاکو بن جانے کی خبر سن کر اب تک چندن کور نے اسے دل سے نکال دیا ہوگا۔ پھر اس نے بے تابی سے ہنومان سے پوچھا۔

"ہنومان مگر ماں نے کیا کہا؟" جگت کو پتا تھا کہ ماں اب اس شادی کے تیار نہ ہوگی۔

"ماں نے خاص طور پر کہا کہ پہلی فرصت میں گھوڑی پر چڑھ کر آؤ اور چندن کو بیاہ کرلے جاؤ۔"

"تو کیا ماں بھی۔"

اور پھر اسے اچانک ویرو یاد آ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ویرو کی خیریت بھی معلوم کرے لیکن سب کے سامنے اس کا ذکر مناسب نہ تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔ کرپال نے جگت کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"یار تجھے بیوی بھی بہادر ملی ہے۔ تو نے حکومت سے بغاوت کی اس نے گھر سے بغاوت کردی۔ چل آج رات ہی بارات لے کر جاتے ہیں سردار کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

یہ سن کر جگت چپ ہی رہا۔

"کیوں جگت، کچھ بولتا کیوں نہیں؟" ہشیار سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔

"دوستو میں بڑی الجھن میں گرفتار ہوگیا ہوں۔ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے اس پر چلتے ہوئے کسی سے شادی کرنا اس کی زندگی کو برباد کرنے کے برابر ہے۔ لیکن پھر بھی میں چندن کور سے ملاقات کروں گا۔ اس کے بعد ہم سب مل کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی پریشان کر رہی ہے۔"

"وہ کیا؟" دوستوں نے دریافت کیا۔

جگت کی پریشان کرنے والی بات ویرو سے متعلق تھی۔ اگر کسی حالت میں ویرو کو گھر میں آسرا دینا پڑے تو کیا چندن اس کو برداشت کرلے گی؟ وہ تو یہی سوچ رہا تھا مگر دوستوں کے سامنے اس مسئلے کو چھیڑنا اس نے مناسب خیال نہ کیا۔ اسے ایک اور بات یاد

آ گئی۔ اس نے کہا۔

"جب ہم نے بغاوت کی اس وقت ایک وعدہ کیا تھا کہ بچن کی محبوبہ کو اس کے باپ نے کہیں اور بیاہ دیا ہے اگر وہ اب بھی بچن کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو تو اسے بچن کے گھر لانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے یہ ذمہ داری پوری کیے بغیر میں شادی نہیں کرسکتا۔"

سردار اپنے ساتھیوں کا اس قدر خیال کرتے ہیں یہ محسوس کرتے ہوئے ان کے دل میں اپنے سردار کا احترام پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ وہ خود سردار ہونے کے باوجود ڈاکے میں آئے ہوئے مال کے پانچ حصے کرتا تاکہ ہر ساتھی کے گھر پر بروقت مدد پہنچ سکے۔

جگا سب کو نیکی اور ایمانداری کا سبق دیتا اور کہتا۔

"جب تک ہمارے درمیان کدورت اور برائی نہیں آئے گی گرونانک ہماری حفاظت کریں گے اس کا یقین رکھو۔" یہی وجہ تھی کہ وہ پانچ پانڈوں کی طرح اتحاد سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی تلخی کو جھیل لیتے تھے۔

"چلو! اب ہم جوگیندر والے ڈاکے کی تیاریاں کریں۔" جگت نے سب کو ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ کام جلدی ختم کرکے میں اور ہنومان دودھیا کا ایک چکر لگا آئیں۔"

"دودھیا؟" کرپال نے تعجب سے کہا۔

"ہاں' سسرال اور کہاں؟ بات کو چھپانے سے کیا فائدہ' میں چندن کور اور اس کے والد کو سمجھاؤں گا کہ اگر شادی کرنی ہے تو کچھ دیر اور انتظار کرلو۔"

پانچوں ساتھی ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار ہوچکے تھے۔ وہ جگت کے حکم کے منتظر تھے۔ جگت نے چلنے کا اشارہ کیا جب روانہ ہوئے تو آسمان پر سیاہ بادلوں کی سنہری چادر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے ابھی برکھا رانی بادلوں کی چادر چیر کر اپنے دھرتی دیوتا سے آملے گی اور اپنے من کی پیاس بجھانے کے لیے دھرتی دیوتا کے قدموں میں گر کر پیار کا وہ گیت گائے گی جسے سن کر دھرتی کے بیٹے اپنے کھیتوں کی طرف دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں۔

جوگیندر نامی جوان جگت سنگھ کی پارٹی میں شامل ہونا چاہتا تھا جس کے متعلق اطلاعات فراہم ہونے پر جگت سنگھ کو معلوم ہوا کہ وہ دبنگ ہونے کے باوجود قابل اعتماد ثابت نہیں ہوسکا۔ پھر بھی جگت نے اس کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا۔ جوگیندر نے اطلاع دی تھی کہ گاؤں میں ایک ہندو سرمایہ دار ہے۔ ادھر ڈاکہ ڈالا جائے تو اچھی دولت ہاتھ لگ سکتی ہے۔ جگت کا اصول تھا کہ ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا کر بھی مخبر کو آخری وقت تک کچھ نہ بتایا جاتا۔ اچانک ہی اس کی پارٹی حملہ کرنے کے لیے مخبر کے ساتھ روانہ ہوتی اور کامیاب ڈاکہ ڈال کر واپس لوٹتی۔

جوگیندر کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر آدھی رات کے بعد انہوں نے حملہ کیا۔ بیوپاری مال کی خریداری کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف اس کی ماں اور جوان بہن موجود تھیں۔

جوگیندر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور سب لوگ تیزی سے اندر داخل ہوگئے۔ بڑھیا جس نے دروازہ کھولا تھا چھ مسلح آدمیوں کو دیکھ کر کپکپانے لگی مگر اس کی بہو جوگیندر کو دیکھ کر بھڑک اٹھی تھی۔ وہ جوگیندر سے اچھی طرح واقف تھی۔ جوگیندر اسے اشارے اور فحش حرکات سے چھیڑتا تھا۔ اکثر فقرے کستا رہتا تھا۔

"پیاری روپا' جیسا تیرا حسن ہے ویسا ہی تیرا نام بھی ہے۔"

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)